

تفسیر نمونه

جلد (پنجم)

مطهر بهار
مطهر بهار
مطهر بهار

مطهر بهار
مطهر بهار
مطهر بهار

یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسینین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

کتاب: تفسیر نمونه جلد پنجم
تالیف: آیه الله مکارم شیرازی

آیت ۶۷

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾

ترجمہ:

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔

۶۷۔ اے پیغمبر! جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے اسے کامل طور سے (لوگوں تک) پہنچا دو اور اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو گویا تم نے اس کا (کوئی) کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا اور خداوند تعالیٰ تمہیں لوگوں کے (ان تمام) خطرات سے (جن کا احتمال ہے) محفوظ رکھے گا اور خداوند تعالیٰ (ہٹ دھرم) کفار کی ہدایت نہیں کرتا۔

انتخاب جانشین پیغمبر ہی آخری کار رسالت تھا

اس آیت کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے جو اسے اس سے پہلی آیات اور اس کے بعد کی آیات سے ممتاز کرتا ہے۔ اس آیت میں روئے سخن صرف پیغمبر کی طرف ہے اور یہ آیت صرف انہی کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ﴾ اے پیغمبر! سے اس آیت کی ابتدا ہو رہی ہے اور یہ آیت صراحت اور تاکید کے ساتھ پیغمبر کو حکم دے رہی ہے کہ جو کچھ اُن پر اُن کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (۱) اس کے بعد (اس حکم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے) تاکید مزید کے طور پر اس خطرے سے متنبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے یہ کام نہ کیا (حالانکہ وہ ہرگز اس کام کی سرانجام دہی کو ترک نہ کرتے) تو یہ ایسا ہوگا گویا تم نے (کوئی) کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا ﴿وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ﴾۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم کے اضطراب و پریشانی کو دور کرنے کے لئے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: اس رسالت اور پیغام کی ادائیگی کے بارے میں تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خدا تمہیں اُن خطرات سے محفوظ رکھے گا ﴿وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾۔

اور آیت کے آخر میں اُن لوگوں سے جو اس مخصوص پیغام کا انکار کریں اور اس کے خلاف ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کفر اختیار کر لیں ایک تہدید اور سزا کے عنوان سے یوں کہتا ہے: خدا ہٹ دھرمی کرنے والے کافروں کو ہدایت نہیں کرتا

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾۔

آیت کے جملوں کی بندش، اس کا مخصوص لب و لہجہ اور اس میں پے در پے تاکیدوں پر تاکیدیں اور آیت کا ”یا ایہا الرسل“ سے شروع ہونا جو تمام قرآن مجید میں صرف دو مقام پر ہے اور اس حکم کی تعمیل اور اس رسالت کی تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں پیغمبر کو یہ تہدید کہ اگر تم نے اس حکم کے پہنچانے میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے کوئی رسالت سرانجام ہی نہیں دیا جو قرآن میں صرف اسی آیت میں ہے، اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گفتگو کسی ایسے اہم امر کے متعلق ہو رہی ہے کہ جس کی تبلیغ نہ کرنا کوئی بھی کارِ رسالت سرانجام نہ دینے کے برابر ہے۔

اس کے علاوہ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ موضوع ایسا تھا جس پر شدت کے ساتھ مخالفت پیدا ہو چکی تھی اور اس موضوع کے مخالفین اتنے سخت تھے کہ اُن کی مخالفت کے پیش نظر پیغمبر بہت ہی پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس اعلان کو سن کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں اسی لئے خداوند تعالیٰ انھیں تسلی دیتا ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسا ایسا اہم مقصد و مطلب تھا جس کے پہنچانے کے لئے خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اتنی تاکید کے ساتھ حکم دے رہا ہے؟ درآں حالیکہ جب ہم اس سورہ کے نزول کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مسلماً پیغمبر کی عمر کے آخری دنوں میں نازل ہوئی ہے۔

کیا یہ توحید اور شرک و بت پرستی سے مربوط مسائل تھے جو برسوں پہلے پیغمبر اور مسلمانوں کے لئے حل ہو چکے تھے؟ یا یہ مسائل احکام شرع اور قوانین اسلام سے متعلق تھے؛ جبکہ اس وقت تک اُن کے اہم ترین مسائل بیان ہو چکے تھے۔

یا یہ مسائل اہل کتاب و یہود و نصاریٰ سے مربوط تھے؛ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ بنی النضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع نیز خیبر و فدک اور نصارائے نجران کے واقعہ کے بعد اہل کتاب کا کوئی مسئلہ مسلمانوں کے لئے مشکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یا اس کا رابطہ منافقین کے ساتھ تھا؟ درآں حالیکہ ہمیں معلوم ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلام کا پورے جزیرے نمائے عرب پر تسلط اور نفوذ ہو گیا تھا تو منافقین کا معاشرے میں کوئی مقام ہی نہیں رہا تھا اور ان کی قوت بالکل ٹوٹ چکی تھی اور ان کے پاس جو کچھ تھا وہ ان کے باطن میں تھا۔

حقیقتاً اب وہ کونسا اہم مسئلہ تھا جو پیغمبر کی زندگی کے آخری دنوں میں باقی رہ گیا تھا کہ مذکورہ بالا آیات جس کے بارے میں اس قسم کی تاکید کر رہی ہے۔

اس حقیقت میں بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے کہ پیغمبر کا اضطراب اور پریشانی اپنی ذات اور اپنے نفس کے لئے نہیں تھی بلکہ مخالفین کی طرف سے ان احتمالی کارشکنیوں اور مخالفین کے بارے میں تھی جن کا نتیجہ مسلمانوں کے لئے خطرات اور نقصانات کی صورت میں نکلتا۔

تو کیا پیغمبر کے جانشین کے تعین اور اسلام و مسلمین کی آئندہ سرنوشت کے سوا کوئی مسئلہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔

اب ہم اُن مختلف روایات کی طرف لوٹتے ہیں جو اہل سنت اور اہل تشیع کی متعدد کتابوں میں آیت مذکور بالا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان روایات سے مذکورہ احتمال کے ثابت کرنے میں کہاں تک استفادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم اُن اعتراضات اور سوالات پر بحث کریں گے جو اس تفسیر کے بارے میں اہل سنت کے بہت سے مفسرین کی طرف سے ظاہر کئے گئے ہیں۔

آیت کی شان نزول

اگرچہ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت سے مربوط حقائق کسی قسم کی پردہ پوشی کے بغیر تمام مسلمانوں کے ہاتھوں تک نہیں پہنچائے گئے اور پہلے سے کئے گئے اور مذہبی تعصبات اس کے اظہار سے مانع ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود اہل سنت کے علماء کی تحریر کردہ مختلف کتابوں میں خواہ وہ تفسیر کی کتابیں ہوں یا حدیث و تاریخ کی، اُن میں بہت زیادہ روایات ایسی ملتی ہیں جو صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان روایات کو بہت سے اصحاب پیغمبر نے نقل کیا ہے۔ مثلاً زید ابن ارقم، ابوسعید خدری، ابن عباس، جابر ابن عبد اللہ انصاری، ابوہریرہ، جرّاء ابن عازب، حذیفہ، عامر بن لیلیٰ بن ضرہ اور ابن مسعود۔ یہ سب کے سب اصحاب پیغمبر اس بات پر متفق ہیں کہ آیت مذکور حضرت علی علیہ السلام اور واقعہ غدیر کے متعلق ہی نازل ہوئی ہے۔

یہ احادیث مذکورہ اصحاب پیغمبر سے مختلف طرق سے،

ابوسعید خدری کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے،

ابن عباس کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے اور جرّاء بن عازب کی بیان کردہ حدیث تین طرق سے نقل کی گئی ہے۔

جن علماء نے اپنی کتابوں میں ان احادیث کو تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں جن میں سے بعض کے نام نمونہ کے طور پر ذکر کر رہے ہیں :

۱۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اپنی کتاب ”مازل من القرآن فی علی“ میں بحوالہ خصائص ص ۲۹/ یہ روایت درج کی ہے۔

۲۔ ابو الحسن واحدی نیشاپوری نے ”اسباب النزول“ ص ۱۵۰/ میں۔

۳۔ حافظ ابو سعید سجستانی نے کتاب ”الولایہ“ میں کتاب ”طرائف“ کے حوالے سے۔

۴۔ ابن عساکر شافعی نے ”در منثور“ ج ۲/ ص ۲۹۰ کے حوالے سے۔

۵۔ فخر الدین رازی نے ”تفسیر کبیر“، ج ۳، ص ۶۳۶ میں۔

۶۔ ابو اسحاق حموینی نے ”فرائد السمطين“ میں۔

۷۔ ابن صباغ مالکی نے ”فصول المہمہ“، ص ۲۷ پر۔

۸۔ جلال الدین سیوطی نے ”در منثور“، ج ۲، ص ۲۹۸ میں۔

۹۔ قاضی شوکانی نے ”فتح القدیر“، ج ۳، ص ۵۷ میں۔

۱۰۔ شہاب الدین آلوسی نے ”روح المعانی“ ج ۶، ص ۱۷۲ پر۔

۱۱۔ شیخ سلیمان قندوزی حنفی نے ”بیابیع المودۃ“ میں ص ۱۲۰ پر۔

۱۲۔ بدر الدین حنفی نے ”عمدة القاری فی شرح البخاری“ ج ۸، ص ۵۸۶ پر۔

۱۳۔ شیخ محمد عبدہ مصری نے تفسیر المنار، ج ۶، ص ۴۶۳ پر۔

۱۴۔ حافظ ابن مردویہ (متوفی ۴۱۶) نے سیوطی کے حوالے سے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء اہل سنت نے آیت مذکورہ کی یہی شان فزول بیان کی ہے اس سے یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ مذکورہ علماء و مفسرین نے آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان فزول کو قبول بھی کر لیا ہے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ انھوں نے اس مطلب سے مربوط روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اگرچہ اس معاشرے کے مخصوص حالات کے خوف سے یا پہلے سے کئے ہوئے غلط فیصلے کی بنا پر صحیح فیصلہ کرنے میں حائل ہوتی ہے، بعض نے تو یہ کوشش کی ہے کہ جتنا بھی ہو سکے اس کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا جائے۔ مثلاً فخر الدین رازی نے جس کا تعصب مخصوص مذہبی مسائل میں مشہور و معروف ہے، اس شان نزول کی اہمیت کم کرنے کے لئے اسے آیت کا دسواں احتمال قرار دیا ہے اور دوسرے نو احتمال جو انتہائی کمزور اور بہت ہی بے ہودہ اور بے وقعت ہیں انہیں پہلے بیان کیا ہے۔

فخر الدین رازی پر زیادہ تعجب نہیں کیونکہ اس کی تو ہر جگہ یہی روش ہے لیکن تعجب تو اُن روشن فکر لکھنے والوں پر ہوتا ہے جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں کہ جس سے مختلف قسم کی کتابیں بھری پڑی ہیں مطلقاً کوئی گفتگو ہی نہیں کی یا اس کو اتنی کم اہمیت دی ہے کہ کسی کی اس طرف توجہ ہی نہ جائے، جیسا کہ سید قطب نے ”فی ظلال“ میں اور رشید رضا نے ”المنار“ میں اس کی شان نزول کو بالکل بیان ہی نہیں کیا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ آیا ان کا ماحول اس حقیقت کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا یا تعصب آمیز فکری حجاب اتنا زیادہ تھے کہ روشن فکری کی بجلی کی چمک اُن پردوں کو ہٹا کر اس حقیقت کی گہرائی تک نہ پہنچ سکی۔

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کو حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں برملا طور پر تسلیم کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ یہ آیت مسئلہ ولایت و خلافت پر ولایت کرتی ہے ہم ان کے اعتراضات اور جوابات انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

بہر حال جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ وہ روایات جو اس بارے میں شیعہ کتب ہی میں نہیں بلکہ اہل سنت کی معروف کتابوں میں بھی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا انکار کیا ہی نہیں جاسکتا اور نہ ہی انہیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی شان نزول میں تو ایک دو احادیث پر ہی اکتفا کر لیا جاتا ہے لیکن اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اتنی کثیر روایات کو بھی کیوں کافی نہیں سمجھا جاتا؟ کیا یہ آیت ایسی خصوصیت رکھتی ہے جو دوسری آیات نہیں رکھتیں؟ اور کیا اس آیت کے سلسلے میں اس سخت رویے کے متعلق کوئی منطقی دلیل مل سکتی ہے؟

دوسری بات جس کی یاد دہانی اس مقام پر ضروری ہے یہ ہے کہ جو روایات ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ تو صرف وہ تھیں جو اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں (یعنی وہ روایات تھیں جو اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق تھیں) ورنہ وہ روایات جو غدیر خم کے مقام پر پیغمبر اکرم (ص) کے خطبہ پڑھنے اور حضرت علی علیہ السلام کا بطور وصی و ولی کے تعارف کمرانے کے بارے میں منقول ہیں وہ تو اُن سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ چنانچہ علامہ امینی نے اپنی کتاب ”الغدیر“ کو ۱۱۰ اصحاب پیغمبر سے اور ۸۴ تابعین سے اور ۳۶۰ علماء سے اور مشہور کتب اسلامی سے اسناد و مدارک کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذکورہ حدیث قطعی ترین متواتر احادیث میں سے ہے اور اگر کوئی شخص ایسی حدیث و روایت کے قطعی و یقینی ہونے میں بھی شک و شبہ کرے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی متواتر حدیث کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان تمام روایات کے متعلق بحث کرنا جو آیت کی شانِ نزول کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور اسی طرح اُن تمام روایات کے سلسلہ میں گفتگو کرنا جو حدیث غدیر کے متعلق نقل ہوئی ہیں ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے۔ ان کا تفصیلی بیان ہمیں تفسیر کے دائرے سے خارج کر دے گا لہذا ہم اسی مقدار پر قناعت کرتے ہیں اور ان اشخاص کو جو اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ سیوطی کی ”درمنثور“، علامہ کی ”الغدیر“، نور اللہ شوستری کی ”احقاق الحق“، شرف الدین کی ”المراجعات“ اور محمد حسن مظفر کی ”دلائل الصدق“ جیسی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

۱۔ لفظ ”بلغ“ جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے ”ابلاغ“ کی نسبت زیادہ تاکید ظاہر کرتا ہے۔

واقعہ غدیر کا خلاصہ

بہت سی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں باوجودیکہ سب کی سب ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں پھر بھی طرح طرح کی تعبیرات کی حامل ہیں۔ بعض روایات بہت مفصل اور طویل ہیں، بعض مختصر لیکن نپی تلی ہیں، بعض روایات اس واقعہ کا ایک گوشہ بیان کرتی ہیں تو دوسری روایات اس واقعہ کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان تمام روایات کے مجموعے اور اسلامی تواریخ، قرائن و حالات اور ماحول و مقام واقعہ کے مطالعہ سے یہ واقعہ سامنے آتا ہے:

پیغمبر اکرم کی زندگی کا آخری سال تھا۔ حجۃ الوداع کے مراسم جس قدر باوقار و پر شکوہ ہو سکتے اُس قدر پیغمبر اکرم کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے۔ سب کے دل روحانیت سے شرسار تھے ابھی اُن کی روح اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اصحاب پیغمبر جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس عظیم نعمت سے فیضیاب ہونے اور اس سعادت کے حاصل ہونے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے^(۱)

نہ صرف مدینے کے لوگ اس سفر میں پیغمبر کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ تاریخی اعزاز و افتخار حاصل کرنے کے لئے آپ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے ”غدير خم“ کے بیابان نظر آنے لگے۔

در اصل یہاں پر ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شمالی راستہ مدینہ کی طرف، دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا راستہ مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پر آخری مقصد اور اس عظیم سفر کا اہم ترین کام انجام پذیر ہونا تھا تاکہ مسلمان پیغمبر کی اہم ذمہ داریوں میں سے اُن کا آخری حکم جان کر ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال۔ آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبر کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں نے بلند آواز سے اُن لوگوں کو جو قافلہ کے آگے آگے چل رہے تھے

واپس لوٹنے کے لئے پکارا اور اتنی دیر کے لئے ٹھہر گئے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا تو پیغمبر کے موذن نے اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نمازِ ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن فضا اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی سر کے اوپر لے لیں۔ ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہے تھے۔ اس صحرائ میں نہ کوئی سائبان نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند بے برگ و باریابانی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لئے ہوئے تھے اور انھوں نے اُن برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبر کے لئے ایک سائبان سا بنا رکھا تھا لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرمی کو اُس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی۔ بہر حال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انھوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہ نے انھیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ سے دور تھے وہ پیغمبر کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے نہیں دیکھ پارہے تھے لہذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا۔ پیغمبر اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پہلے پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجالائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوند تعالیٰ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے؟ لوگوں نے بلند آواز میں کہا: ”نشهد انک قد بلغت و نصحت و جہدت فجزاک اللہ خیراً“ یعنی ہم گواہی دیں گے آپ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اُس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: خداوند گواہ رہنا۔

آپ نے مزید فرمایا: لوگو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انھوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔

پیغمبر نے فرمایا: دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گرانمایہ اور گرانقدر چیزیں بطور یادگار کے چھوڑے جا رہا ہوں تم اُن کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یا رسول اللہ! وہ دو گرانمایہ چیزیں کونسی ہیں؟ تو پیغمبر اکرم نے فرمایا: پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ چھڑانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے اور دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف و خیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور ان سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی اُن سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ اپنے ارد گرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جو نہی آپ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انھیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔ اس موقع پر پیغمبر کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہو گئی اور آپ نے ارشاد فرمایا:

”ایہا الناس من اولی الناس بالمومنین من انفسهم“

یعنی۔ اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود اُن سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبر نے فرمایا: خدا میرا مولا و رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا و رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود اُن سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

”فمن كنت مولاه فعلي مولاه“ یعنی جس جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس اس کا مولا رہتا ہے۔

پیغمبر اکرم نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض روایوں کے قول کے مطابق پیغمبر نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اُس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:

”اللهم وال من والاه وعاد من عاداه واحب من احبه وابغض من ابغضه وانصر من نصره واخذل من خذله وادر الحق معه حيث دار“

یعنی ”بارالہا! جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر اور اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ، جو اس کی مدد کرے تو اُس کی مدد کر، جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رخ کرے۔“

اس کے بعد فرمایا: ”الا فليبلغ الشاهد الغائب“ یعنی: تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو اُن لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اور اس وقت موجود نہیں ہیں۔ پیغمبر کا خطبہ ختم ہو گیا۔ پیغمبر پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہ رہا تھا۔ ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبریل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبر کو بایں الفاظ بشارت دی:

”اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتى الخ.“

”آج کے دن میں نے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا۔“

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر نے فرمایا:

”الله اكبر الله اكبر على اكمال الدين و اتمام النعمة ورضى الرب برسالتي و الولاية لعلی من بعدی“

ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لئے علی کی ولایت کے لئے خوش ہوا۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبر کی زبان مبارک سے اعلان سُن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا، لوگ بڑھ چڑھ کر اُس اعزاز و منصب پر حضرت علی علیہ السلام کو اپنی طرف سے مبارک مباد پیش کر رہے تھے۔ معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انھوں نے کہا:

”بِحِّجِّ لَكَ يَا بَنِي طَالِبٍ اصْبَحْتَ وَامْسَيْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَا كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ“

مبارک ہو! مبارک ہو! اسے فرزند ابی طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا ورہبر ہو گئے۔

اس وقت ابن عباس نے کہا: بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا۔ عرب کے مشہور شاعر مداح رسول ”حسان بن ثابت“ نے پیغمبر سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے ایک قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

يَنَادِيهِمْ يَوْمَ الْغَدِيرِ نَبِيَّهُمْ
بِحُجَّتِهِ وَاسْمَعِ بِالرَّسُولِ مُنَادِيًا

فَقَالَ: فَمَنْ مَوْلَاكُمْ وَنَبِيِّكُمْ
فَقَالُوا وَلَمْ يَبْدُوا هُنَاكَ التَّعَامِيَا

الْهَكَ مَوْلَانَا وَانْتَ نَبِيُّنَا
لَمْ تَلَقْ مِنَّا فِي الْوَلَايَةِ عَاصِيَا

فَقَالَ لَهُ: قُمْ يَا عَلِيُّ فَانْتَنِي
رَضِيْتُكَ مِنْ يَعْدَى أَمَامًا وَهَادِيَا

فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا وَلِيُّهُ
فَكُونُوا لَهُ أَتْبَاعَ صِدْقٍ مُوَالِيًا

هُنَاكَ دَعَا: اللَّهُمَّ وَالْ وَلِيَّهِ
وَ كُنْ لِلَّذِي عَادَا عَلِيًّا مُعَادِيًا

”یعنی پیغمبر نے غدیر کے دن خم کے مقام پر انھیں ندا دی اور پکارا اور یہ پکارنے والا کس قدر گرامی قدر تھا۔“
”فرمایا: تمہارا مولا اور تمہارا بنی کون ہے؟ تو انھوں نے بلا تردد صراحت کے ساتھ جواب دیا“

”کہ آپ کا خدا ہمارا مولا اور آپ ہمارے پیغمبر ہیں اور ہم آپ کی ولایت کے قبول کرنے سے روگردانی نہیں کریں گے“

”اس پر پیغمبر اکرم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: کھڑے ہو جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور رہبر منتخب کیا ہے“

”اس کے بعد فرمایا: جس شخص کا میں مولا ورہبر ہوں یہ علی اس کے مولا ورہبر ہیں پس تم سچے دل سے ان کی پیروی کرنا“

”اس وقت پیغمبر نے عرض کیا: بارالہا! اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا“^(۱)
یہ تھا مشہور حدیث غدیر کا خلاصہ جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں موجود ہے۔

۱۔ پیغمبر اکرم کے ہمراہ جانے والوں کی تعداد بعض نے ۹۰ ہزار، بعض نے ۱۱۴ ہزار، بعض نے ۱۲۰ ہزار اور بعض نے ۱۲۴ ہزار لکھی ہے۔

۲۔ یہ اشعار اہل سنت کے بہت سے علماء نے نقل کئے ہیں ان میں حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو سعید سجستانی، خوارزمی مالکی، حافظ ابو عبد اللہ مرزبانی گنجدی شافعی، جلال الدین سیوطی، سبط ابن جوزی اور صدر الدین حموی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

جرح و تنقید اور اعتراضات

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ آیت خلافتِ علی کے علاوہ کسی دوسرے موضوع سے متعلق ہوتی تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان روایات اور خود آیت میں موجود قرائن سے کم مقدار پر بھی قناعت کر لی جاتی جیسا کہ دنیا نے اسلام کے بڑے بڑے مفسرین نے قرآن کریم کی باقی تمام آیات کی تعبیر میں بعض اوقات زیر نظر آیت کے موجود مدارک کے دسویں حصہ بلکہ اس سے بھی کم تر پر قناعت کر لی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر تعصب کے پردے بہت سے حقائق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

جن لوگوں نے اس آیت کی تفسیر اور اُن متعدد روایات کے متعلق جو اس آیت کی شانِ فزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اختلاف کیا ہے اور حدِ توازن سے بڑھی ہوئی اُن روایات کے مقابلے میں علمِ مخالفت بلند کیا ہے جو دراصل واقعہ غدیر کے متعلق ہیں دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے کہ جو شروع ہی سے نہ صرف دشمنی اور ہٹ دھرمی سے اس پر بحث کرتے ہیں بلکہ انھوں نے شیعوں کی ہتک و توہین، بدگویی اور دشنام طرازی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے روح تحقیق کی حفاظت کی ہے اور وہ کسی حد تک حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے ہیں لہذا انھوں نے استدلال کی راہ اپنائی ہے اسی بنا پر انھوں نے حقائق کے ایک حصے کا اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس آیت اور اس سے مربوط روایات بیان کرنے سے پہلے کچھ اشکالات بیان کئے ہیں اور وہ اشکالات جو شاید اُن حالات کا نتیجہ تھے جو اُن کے فکری ماحول پر محیط تھا، بیان کرنے کے بعد اس آیت اور اس آیت سے مربوط روایات ذکر کی ہیں۔

پہلے گروہ کا واضح نمونہ ابن تیمیہ ہے اس نے اپنا موقف کتاب ”منہاج السنۃ“ میں بیان کیا ہے اس میں اس کی حالت بالکل اس شخص کی طرح ہے جو روز روشن میں اپنی آنکھیں بند کر لے اور اپنی انگلیاں زور سے کانوں میں ٹھونس لے اور چلانا شروع کر دے کہ سورج کہاں ہے۔ نہ تو وہ اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لئے تیار ہوتا ہے کہ کچھ حقائق کو دیکھ لے، نہ کانوں سے انگلیاں نکالنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ کچھ اسلامی محدثین و مفسرین کی داد و فریاد سن سکے، بس مسلسل اور پے درپے گالیاں دیتے چلے جا رہا ہے اور ہتک حرمت پر کمر بستہ ہے۔ ایسے افراد جہالت، بے خبری، ہٹ دھرمی اور

خشونت آمیز تعصب کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ ایسے واضح اور بدیہی مسائل کا بھی انکار کر دیتے ہیں جن کا ہر آدمی آسانی کے ساتھ ادراک کر سکتا ہے۔ لہذا ایسے شخص کی باتیں نقل کرنے کی ہم اپنے آپ کو زحمت دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے جوابات پڑھنے کی تکلیف قارئین کو دیتے ہیں کیونکہ عظیم اسلامی علماء و مفسرین جن کی اکثریت علماء اہل سنت میں سے ہے جنہوں نے نہ تصریح کی ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور جو شخص ان کے خلاف ڈھٹائی سے کہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی چیز اپنی کتاب میں نقل نہیں کی، ایسے شخص کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور ایسے آدمی کی بات کیا وزن رکھتی ہے کہ جس پر ہم بحث کریں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”ابن تیمیہ“ نے اُن بہت سی معتبر کتابوں کے مقابلے میں کہ جن میں اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اپنی برائت کے لئے اس مضحکہ خیز جملہ پر اکتفا کیا ہے:

”اُن علماء میں سے جو یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کوئی بھی اس آیت کو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کو نہیں جانتا“

گویا صرف وہ علماء جو ابن تیمیہ کے عناد آلود ہٹ دھرمی کے افراط زدہ میلانات کے ساتھ ہم آواز ہیں صرف وہی ”سمجھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے“ ورنہ جو شخص اس کا ہم آواز نہیں ہے وہ ایسا دانشمند ہے کہ جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی منطق ہے کہ جس کی فکر خود خواہی اور ہٹ دھرمی سایہ فلک ہے۔ ہم اس گروہ کا ذکر یہیں پر چھوڑتے ہیں۔

البتہ ان اعتراضات میں سے جو دوسرے گروہ نے کئے ہیں اُن میں چند قابل بحث ہیں جنہیں ہم ذیل میں آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟

اہم ترین اعتراض جو حدیث غدیر کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے یہ ہے کہ ”مولیٰ“ کے معانی میں سے ایک معنی دوست اور یا ور و مددگار بھی ہے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں یہ معنی مراد نہ ہو!

اس بات کا جواب کوئی مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص جانتا ہے کہ علی کی دوستی کے ذکر اور یاد دہانی کے لئے ان مقدمات و تشکیلات اور خشک جلا دینے والے بیابان کے وسط میں خطبہ پڑھنے اور لوگوں کو وہاں

ٹھہرانے اور اُن سے پے درپے اقرار لینے اور اعتراف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دوستی رکھنا مسائل اسلامی میں سے ایک بدیہی ترین مسئلہ تھا جو آغاز اسلام سے ہی موجود تھا، علاوہ ازیں یہ کوئی ایسا مطلب نہیں تھا کہ جس کی پیغمبر نے اُس وقت تک تبلیغ نہ کی ہو بلکہ آپ تو بارہا اس کی تبلیغ کر چکے تھے۔ یہ کوئی چیز بھی نہیں تھی کہ جس کے اظہار سے آپ پریشان ہوں اور خدا کو اس کے لئے تسلی اور حفاظت کی ضمانت دینی پڑے۔

یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ خداوند عالم اس لب و لہجہ کے ساتھ اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا ”اگر اس کی تبلیغ نہ کی تو رسالت کی تبلیغ بھی نہ کی“ یہ سب چیزیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ مسئلہ ایک عام دوستی سے کہیں اونچا تھا، وہ دوستی جو اسلام کے پہلے ہی دن سے اخوت اسلامی کی الف کا حصہ شمار ہوتی تھی۔

علاوہ ازیں اگر اس سے ایک عام اور سادہ دوستی کا بیان کرنا ہی منظور ہوتا تو پیغمبر پہلے یہ اقرار لوگوں سے کیوں لیتے کہ ”الست اولیٰ بکم من انفسکم“ یعنی کیا میں تمہاری نسبت تمہارے نفوس پر خود تم سے زیادہ حقدار اور صاحب اختیار نہیں ہوں^(۱)

کیا یہ جملہ ایک عام دوستی کے بیان کے ساتھ کسی خاص قسم کی مناسبت رکھتا ہے؟ نیز ایک عام دوستی تو یہ مقام نہیں رکھتی کہ لوگ یہاں تک کہ حضرت عمر جیسی شخصیت بھی حضرت علی - کو اس طرح سے مبارکباد اور تہنیت پیش کریں! ﴿اصبحت مولای و مولیٰ کل مومن و مومنة﴾

”اے علی! آپ میرے اور ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے مولا ہو گئے“

اور اسے ایک نیا منصب اور اعزاز شمار کریں^(۲)

کیا حضرت علی - اس دن تک ایک عام مسلمان کی حیثیت سے بھی پہچانے نہیں گئے تھے؛ کیونکہ ایک مسلمان کی دوستی تو تمام مسلمانوں پر لازم و ضروری ہے۔ کیا مسلمانوں کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے دوستی کرنا کوئی نئی بات تھی کہ جس کے لئے مبارکباد دینے کی ضرورت ہو اور وہ بھی رسول اللہ کی عمر کے آخری سال میں۔

علاوہ ازیں کیا حدیث ثقلین اور وداع پیغمبر سے تعلق رکھنے والی تعبیرات کا حضرت علی - کی دوستی کے مسئلہ سے بھی کوئی ربط ہو سکتا ہے؟ حضرت علی علیہ السلام کی مومنین کے ساتھ ایک عام دوستی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم اُسے قرآن کے ہم پلہ اور برابر قرار دے دیں^(۳)

کیا ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص اس تعبیر سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہاں پر مسئلہ رہبری و امامت سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے؛ کیونکہ پیغمبر کی رحلت کے بعد قرآن مسلمانوں کا پہلا رہبر ہے لہذا اسی بنیاد پر اہل بیت علیہم السلام مسلمانوں کے دوسرے رہبر ہیں۔

۱۔ یہ جملہ متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔

۲۔ اس واقعہ کے اس حصہ کو کہ جو حدیث تہنیت کے نام سے مشہور ہے، اہل سنت کے بہت سے عظیم علماء حدیث و تفسیر و تاریخ نے متعدد طریقوں سے بہت سے صحابہ سے نقل کیا ہے مثلاً: ابن عباس، ابوہریرہ، برآء ابن عازب اور زید ابن ارقم، مرحوم علامہ امینی نے ”الغدیر“ کی پہلی جلد میں اس حدیث کو اہل سنت کے ساٹھ علماء سے نقل کیا ہے۔

۳۔ حدیث ثقلین ان متواتر احادیث میں سے ہے جسے اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں متعدد صحابہ سے نقل کیا گیا ہے مثلاً: ابوسعید خدری، زید ابن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن خطاب، عبد بن حمید، جعیر بن مطعم، ضر و اسلمی، ابوذر غفاری، ابو رفیع اور ام سلمہ نے پیغمبر سے نقل کیا ہے۔

۲۔ آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل وبعد کی آیات اہل کتاب اور ان کی غلط کاریوں کے بارے میں ہیں۔ خاص طور پر تفسیر المنار کے مولف نے جلد ۶ صفحہ ۴۶۶ پر اس مسئلہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم خود اس آیت کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؛ کیونکہ اول تو اس آیت کا لب و لہجہ اور اس کا قبل وبعد کی آیات سے فرق مکمل طور پر یہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس آیت میں موضوع سخن کوئی ایسی چیز ہے جو قبل وبعد کی آیات سے مختلف ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآن ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے کہ جس کے مطالب کو خاص حصوں اور ابواب میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہو، بلکہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی اور مختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے گئے اُن کے مطابق نازل ہوتا رہا، لہذا ہم دیکھتے ہیں قرآن ایک جنگ کے متعلق بحث کرتے کرتے یکایک ایک فرعی حکم کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔ یا جب وہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو اچانک ہی مسلمانوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ایک اسلامی حکم اُن کے لئے بیان کر دیتا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے ایک دفعہ اس بحث کی طرف رجوع فرمائیں جو ہم نے اس آیت کی تفسیر کے ابتدا میں کی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض متعصب قسم کے لوگوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ آیت ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی۔ حالانکہ سورہ مائدہ پیغمبر کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوا ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ صرف یہ ایک آیت مکہ میں ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہے جسے آپ منوانا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائے بعثت میں نہ تو پیغمبر یہودیوں کے ساتھ برسرِ جنگ تھے اور نہ ہی عیسائیوں کے ساتھ، اس بنیاد پر تو اس آیت کا قبل وبعد کی آیت سے کوئی تعلق ہی نہ رہے گا (غور کیجئے)۔

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت تعصب کے طوفان کی زد میں آگئی ہے اور اسی بنا پر اس میں کئی طرح کے احتمالات پیدا کئے جاتے ہیں جبکہ اس جیسی دوسری آیات میں اُس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہر ایک اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی حیلہ و بہانہ سے یا کسی بے بنیاد و دستاویز کے ذریعہ اس کے مفہوم کو اس کے صحیح راستہ سے منحرف کر دے۔

۳۔ کیا یہ حدیث تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ ہم کس طرح اس حدیث کو قبول کر سکتے ہیں جبکہ بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتاب میں اسے نقل کیا ہے، یہ اعتراض بھی عجائبات میں سے ہے کیونکہ اول تو بہت سی معتبر احادیث ایسی ہیں جنہیں علمائے اہل سنت نے قبول کیا ہے۔ حالانکہ وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں اور یہ کوئی پہلی حدیث بھی نہیں کہ جس کی یہ وضع و کیفیت ہو۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کیا ان کے نزدیک صرف یہی دو کتابیں معتبر ہیں؛ حالانکہ یہ حدیث ان کے قابل اعتماد منابع اور کتب میں موجود ہے، یہاں تک کہ صحاح ستہ (اہل سنت کی چھ مشہور کتابیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں) مثلاً سنن ابن ماجہ^(۱) میں یہ حدیث موجود ہے اسی طرح مسند احمد حنبل^(۲) میں یہ حدیث آئی ہے اور حاکم ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے بھی اپنے شہرہ آفاق تعصب کے باوجود اس حدیث کے بہت سے طرق کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ بنا بریں بعید نہیں کہ بخاری و مسلم اس مخصوص فضا اور گھٹے ماحول میں صریحاً اپنی کتاب میں ایسی چیز نہ لکھ سکے ہوں یا نہ لکھنا چاہتے ہوں جو ان کے وقت کے صاحبانِ اقتدار کے مزاج کے خلاف تھی۔

۱۔ جلد اول، ص ۵۵ و ۵۸۔

۲۔ مسند احمد حنبل، ج ۱، ص ۸۴-۸۸، ۱۱۸-۱۱۹، ۱۵۲، ۳۳۱، ۳۸۱، ۳۷۱۔

۴۔ حضرت علی - نے اور اہل بیت نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر حدیث غدیر اس عظمت کے ساتھ موجود تھی تو خود حضرت علی - نے اور ان کے اہل بیت اور یار و انصار اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے ضروری مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہیں کیا، آیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ حضرت علی - کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے اس قسم کے اہم مدرک کو سند کے طور پر پیش کرتے۔

یہ اعتراض بھی اسلامی کتابوں سے خواہ حدیث سے متعلق ہوں یا تاریخ و تفسیر سے، عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں ایسے بہت سے مواقع کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہاں پر خود حضرت علی - نے یا ائمہ اہل بیت نے یا اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے حدیث غدیر سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک واقعہ خود حضرت علی - سے متعلق ہے جسے خطیب خوارزمی نے عامر بن واصلہ کے حوالے سے نقل کیا ہے، عامر کہتا ہے:

”میں شوریٰ کے روز حضرت علی - کے ساتھ اس گھر میں موجود تھا میں نے خود سنا کہ آپ ارکان شوریٰ سے اس طرح کہہ رہے تھے کہ میں ایک ایسی محکم دلیل تمہارے سامنے قائم کر رہا ہوں جسے عرب و عجم مل کر بھی تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تمہیں خدا کی قسم! بتلاؤ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے کہ جس نے مجھ سے پہلے خدا کو اس کی توحید و یکتائی کے ساتھ پکارا ہو؟ اس کے بعد آپ نے خاندان رسالت کی معنوی عظمتیں بیان کی یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں بتلاؤ تمہارے درمیان میرے علاوہ اور کوئی شخص ایسا ہے جس کے حق میں پیغمبر نے یہ کہا ہو: ”من كنت مولاه فعلى مولاه اللهم وال من والاه وانصر من نصره ليلبغ الشاهد الغائب“

سب نے کہا: نہیں^(۱)

یہ روایت حموی نے فرائد السمطين باب ۵۸ میں اور اسی طرح ”ابن حاتم“ نے ”دارالنظیم“ میں، دارقطنی نے اپنی کتاب میں، ابن عقدہ نے اپنی کتاب میں اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے۔

فرائد السمطين کے باب ۵۸ میں منقول ہے کہ حضرت علی - نے حضرت عثمان کے زمانے میں مسجد کے اندر چند لوگوں کی موجودگی میں بھی واقعہ غدیر سے استدلال کیا تھا، اسی طرح کوفہ میں اُن لوگوں کے سامنے جو پیغمبر کی طرف سے ان کی خلافت بلا فصل کے لئے نص ہونے کا انکار کر رہے تھے صراحت کے ساتھ اس حدیث سے استدلال کیا ہے

۔ الغدير کے مطابق اس حدیث (یعنی کوفہ میں واقعہ غدیر سے آپ کے استدلال) کو اہل سنت کی مشہور کتابوں اور معروف ماخذوں میں چار صحابہ اور چودہ تابعین سے روایت کیا گیا ہے۔

جنگ ”جمل“ کے دن بھی ”حاکم“ کی کتاب مستدرک جلد سوم، صفحہ ۲۷۱ کی روایت کے مطابق طلحہ کے سامنے حدیث غدیر سے استدلال فرمایا۔

نیز جنگ صفین کے دن ”سلیم بن قیس ہمدانی“ کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے اپنی لشکرگاہ میں مہاجرین و انصار اور اطراف و جوانب سے آنے والے لوگوں کے سامنے اس حدیث سے استدلال کیا۔ اور بدر مہین (جو جنگ بدر میں پیغمبر کے ساتھ تھے) میں سے بارہ افراد نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ انھوں نے یہ حدیث پیغمبر سے سنی ہے۔

حضرت علیؑ علیہ السلام کے علاوہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا، امام حسن، امام حسین، عبداللہ بن جعفر، عمار یاسر، قیس بن سعد، عمر بن عبدالعزیز اور عباسی خلیفہ مامون نے بھی اس حدیث کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ عمرو بن عاص نے اس خط میں جو اُس نے معاویہ کو اس لئے لکھا تھا تاکہ وہ اس پر اچھی طرح سے یہ بات ثابت کر دے کہ وہ حضرت علیؑ کے مرتبہ و مقام اور معاویہ کی وضع سے متعلق حقائق سے خوب آگاہ ہے، اس خط میں اس نے صراحت کے ساتھ مسئلہ غدیر کا ذکر کیا تھا اور اسے خطیب خوارزمی حنفی نے اپنی کتاب مناقب کے صفحہ ۱۲۴ پر نقل کیا ہے۔

وہ لوگ جو اس سے زیادہ توضیحات کے خواہاں ہیں اور حضرت علیؑ، اہلبیت، صحابہ اور غیر صحابہ کی طرف سے حدیث غدیر سے استدلال کرنے کے بارے میں ان روایات کے مختلف ماخذوں میں بیان سے آگاہ ہونا چاہیں تو وہ کتاب الغدير جلد اول صفحات ۵۹ تا ۲۱۳ کی طرف رجوع کریں۔ علامہ امینی نے صحابہ و غیر صحابہ میں سے ۲۲ حضرات سے مختلف مواقع پر اس حدیث سے استدلال کرنے کی روایات پیش کی ہیں۔

۵۔ روایت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت حضرت علی کو خلافت و ولایت کا منصب عطا کرنے اور واقعہ غدیر سے مربوط ہے تو پھر یہ آخری جملہ کہ: ”ان الله لا يهدي القوم الكافرين“ یعنی ”خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا“ اس مسئلے سے کیا ربط رکھتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ لفظ ”کفر“ لغت میں بھی اور اسی طرح قرآن کی زبان میں بھی انکار، مخالفت اور ترک کے معنی میں ہے۔ کبھی انکار خدا یا انکار نبوت پیغمبر کے لئے بولا جاتا ہے ہے اور کبھی دوسرے احکام کے مقابلے میں انکاریا مخالفت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، سورہ آل عمران آیت ۹۷ میں حج کے بارے میں ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾

”جو لوگ حج کے حکم کو پائمال کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے خدا تمام جہانوں سے بے نیاز ہے“

سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں جادو گروں کے لئے بھی اور ان کے بارے میں بھی کہ جو جادو میں آلودہ نہیں لفظ ”کفر“ بولا گیا ہے: ﴿وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾

سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں بھی ہے کہ شیطان اُن لوگوں کے مقابلے میں کہ جنہوں نے اس کی پیروی اور اطاعت کی، قیامت کے دن صریحاً اظہار نفرت کرتے ہوئے اُن سے کہے گا کہ تم نے احکام الہی کی اطاعت میں مجھے اس کا شریک قرار دیا تھا اور میں آج تمہارے اس کام سے کفر کرتا ہوں: ﴿إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ﴾ (ابراہیم/۲۲) اس بنا پر کفر کا اطلاق مسئلہ ولایت و رہبری کے مخالفین پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

۶۔ ایک ہی زمانہ میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

ایک اور بہانہ جو اس متواتر حدیث اور اسی طرح زیر بحث آیت سے روگردانی کے لئے کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگر پیغمبر نے حضرت علی کو غدیر خم میں ولایت و رہبری و خلافت کے لئے مقرر کر دیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی زمانہ میں دو رہبر اور دو پیشوا ہو جائیں گے۔

لیکن اس آیت کے نزول اور حدیث کے ورود کے زمانے کے خاص اوضاع و شرائط اور مخصوص حالات و کوائف کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اسی طرح اُن قرائن پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو پیغمبر اسلام کی زندگی کے آخری مہینوں میں واقع ہوا

ہے جبکہ آپ آخری احکام کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ خصوصاً جب کہ آپ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ میں بہت جلد تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں اور دو گرا نمایہ چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔

جو شخص یہ گفتگو کر رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے جانشین کے مقرر کرنے کا انتظام میں مصروف ہے اور وہ آئندہ کے لئے پروگرام دے رہا ہے، نہ کہ اپنے زمانے کے لئے۔ لہذا اس سے صاف واضح اور روشن ہے کہ اس سے دو امیروں اور دو پیشواؤں کا ایک ہی زمانے میں وجود مقصود نہیں ہے۔

وہ بات جو خاص طور پر لائق توجہ ہے یہ ہے کہ ایک طرف تو بعض علمائے اہل سنت یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں تو بعض دوسرے ایسے ہیں جنہوں نے اس کے مقابلے میں ایک اور اعتراض پیش کر دیا ہے اور وہ یہ کہ پیغمبر نے حضرت علی کی ولایت و خلافت کے منصب پر تقرری تو کی ہے لیکن اس کی تاریخ صاف اور واضح طور پر بیان نہیں فرمائی، تو اس صورت میں کیا رکاوٹ ہے کہ یہ ولایت و خلافت علی کا بیان دوسرے تین خلفاء کے بعد کے لئے ہو۔

حقیقتاً کتنی حیرت کی بات ہے کہ کوئی چھت کے اُس طرف گر رہا ہے اور کوئی اس طرف، لیکن متن واقعہ کو مان لینے میں تعصبات حائل ہو گئے ہیں۔ ذرا کوئی اُن سے یہ تو پوچھے کہ اگر پیغمبر اکرم یہ چاہتے تھے کہ اپنے چوتھے خلیفہ کو معین کریں اور مسلمانوں کے آئندہ کی فکر تھی تو کیوں اپنے پہلے، دوسرے اور تیسرے خلیفہ کا ذکر جس کا تعین چوتھے پر مقدم و لازم تھا غدیر خم کے خطبہ میں نہ فرمایا۔

ہم یہاں پر اپنا سابقہ بیان دہراتے ہیں اور اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ اگر مخصوص نظریات درمیان میں نہ ہوتے یہ تمام اعتراضات اس آیت اور اس حدیث کے سلسلے میں نہ کئے جاتے جس طرح کہ دوسرے مواقع اس قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔

آیات ۶۸، ۶۹

۶۸ ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾

۶۹ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

ترجمہ:

۶۸۔ اے اہل کتاب تم کچھ وقت کچھ وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ تم تورات و انجیل اور اس کو جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے قائم اور برپا نہ کرو لیکن جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے (نہ صرف ان کی بیداری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ) اُن میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو زیادہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کافر قوم (اور ان کی مخالفت) سے غمگین نہ ہو۔

۶۹۔ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور یہودی، صائبین اور عیسائی جو بھی خدائے یگانہ اور روز قیامت پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح بجالائے گا تو نہ ایسے لوگوں پر کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ محزون و مغموم ہوں گے۔

شان نزول

تفسیر ”مجمع البیان“ اور تفسیر قرطبی میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت پیغمبر کی خدمت میں آئی اور پہلا سوال یہ کیا کہ کیا آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ تورات خدا کی طرف سے ہے۔ پیغمبر نے اثبات میں جواب دیا: انھوں نے کہا کہ ہم بھی تورات کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے (در حقیقت تورات ہمارے اور آپ کے درمیان قدر مشترک ہے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے کہ جس پر صرف آپ ہی عقیدہ رکھتے ہیں، تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم تورات کو قبول کر لیں اور اس کے علاوہ کی نفی کر دیں) اس پر پہلی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا۔

جیسا کہ ہم اس سورہ کی آیات کی تفسیر میں اب تک پڑھ چکے ہیں کہ اُن میں قابلِ لحاظ حصہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی وعدہ شکنیوں، بحثوں، سوالات اور اعتراضات سے ہی متعلق تھا۔ یہ آیت بھی اُن بحثوں کے ایک اور رخ کی کمی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی اس کمزور منطق کا جواب دے رہی کہ جو یہ چاہتے تھے کہ تورات کو تو مسلمانوں اور

یہودیوں کے درمیان ایک متفق علیہ کتاب ہونے کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور قرآن کو ایسی کتاب ہونے کی حیثیت سے کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہے چھوڑ دیا جائے۔ یہ آیت انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے: اہل کتاب تمہاری کوئی بھی وقعت نہیں ہوگی جب تک کہ تم تورات و انجیل اور تمام آسمانی کتابوں کو جو تم پر نازل ہوئی ہیں بلا استثنا اور بغیر کسی تفاوت کے تسلیم نہ کرو گے۔

”قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُتِمُّوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ“

کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ تمام کتابیں ایک ہی مبدا سے صادر ہوئی ہیں اور ان سب کی اساس اور اصول بھی ایک سے ہیں اگرچہ ان میں سے آخری کتاب کامل ترین اور جامع ترین ہے۔ اسی بنا پر لازم العمل ہے اُن کے علاوہ پہلی کتابوں میں آخری کتاب یعنی قرآن کے بارے میں متعدد بشارتیں بھی آئی ہیں۔ وہ مدعی ہیں اس بات کے کہ وہ تورات و انجیل کو قبول کرتے ہیں پس اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ ان بشارتوں کو بھی قبول کریں اور جب کہ انھوں نے ان نشانیوں کو قرآن میں پایا ہے تو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

مذکورہ بالا آیت یہ بھی کہتی ہے کہ صرف دعویٰ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کتابوں پر عملاً قائم ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں ”ہماری“ اور ”تمہاری“ کتاب کی بات نہیں ہے۔ معاملہ تو آسمانی کتابوں کا ہے اور جو کچھ خدا کی طرف سے آیا ہے، اُس کا ہے۔ پس تم کس طرح اس کمزور منطق کے ذریعے آخری کتاب کو نظر انداز کر سکتے ہو۔ قرآن پھر ایک مرتبہ ان کی اکثریت کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے اُن میں سے بہت سے لوگ نہ صرف ان آیات سے پند و نصیحت نہیں لیتے اور ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا کفر و طغیان بڑھتا ہی جاتا ہے۔

”وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا“

اور آیات حق اور صحیح باتوں کی بیمار افکار اور ہٹ دھرمی سے بھرے ہوئے دلوں پر ایسی ہی الٹی تاثیر پیدا ہوا کرتی ہے۔

آیت کے آخر میں اپنے پیغمبر کو اس منحرف اکثریت کی انتہائی سختی کے مقابلہ میں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: اس کافر جمیعت کی مخالفتوں سے غمگین نہ ہو کیونکہ اس کا نقصان خود اُن ہی کی طرف لوٹ جائے گا اور تجھے اس سے کوئی ضرر

نہیں پہنچے گا ﴿فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾^(۱)

یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کے مفاہیم قوم یہود کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر صرف اسلام کے دعویٰ پر ہی قناعت کریں اور تعلیمات انبیاء کے اصول اور خاص طور پر اپنی آسمانی کتاب قرآن کو عملاً برپا نہ کریں تو ان کی کسی قسم کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت بارگاہِ خدا میں ہوگی نہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اور وہ ہمیشہ زبوں حال، زیر دست اور شکست خوردہ رہیں گے۔

بعد والی آیت میں پھر نئے سرے سے اس حقیقت کو محلِ تاکید قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام اقوام و ملل اور تمام مذاہب کے پیروکار بلا استثناء خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابین ہوں یا نصاریٰ صرف اسی صورت میں اہلِ نجات ہوں گے اور اپنے آئندہ سے خوف زدہ اور گزشتہ سے محزون و غمگین نہ ہوں گے جب کہ وہ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور نیک اعمال انجام دیں گے۔

﴿ان الذین آمنوا و الذین ہادوا و الصابون و النصریٰ من آمن باللہ و الیوم الآخر و عمل صالحاً فلا خوف علیہم

ولا ہم یحزنون﴾۔

یہ آیت حقیقت میں ان لوگوں کے لئے دندانِ شکن جواب ہے جو نجات کو کسی خاص ملت اور قوم میں منحصر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انبیاء کے احکام میں تبعیض (بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا) کے قائل ہو جائیں اور مذہبی دعوتوں کو قومی تعصبات سے ملا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ راہِ نجات ایسی باتوں کو برکنار رکھنے میں منحصر ہے۔

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۶۲ کے ذیل میں کہ جس کا مضمون مذکورہ بالا آیت کے ساتھ تقریباً یکساں ہے ہم واضح کر چکے ہیں کہ بعض لوگ ایک سفسطہ آمیز بیان کے ذریعہ چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کو ”صلح کل“ کے مسلک پر دلیل قرار دیں اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کو اہلِ نجات فرض کر لیں اور اسے نظر انداز کر دیں کہ درحقیقت آسمانی کتابوں کے یکے بعد دیگر سے نازل ہونا جہانِ انسانیت کے بتدریج درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آیت ”عمل صالحاً“ کی تعبیر کے ذریعے اس حقیقت کو مشخص و ممتاز کرتی ہے کہ مذاہب کے اختلاف کی صورت میں آخری قانون پر عمل کریں۔ کیونکہ منسوخ شدہ قوانین پر عمل کرنا عملِ صالح نہیں ہے۔ بلکہ عملِ صالح تو موجودہ قوانین اور آخری قانون پر عمل کرنا ہے (۲)

علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی قابلِ قبول ہے کہ ﴿من آمن باللہ و الیوم الآخر و عمل صالحاً﴾ کا جملہ صرف یہود و نصاریٰ اور صابین کی طرف لوٹتا ہو کیونکہ ”الذین آمنوا“ جو آیت کی ابتداء میں ذکر ہوا ہے وہ اس قید کا

محتاج نہیں ہے۔ تو اس طرح سے اس آیت کا معنی یوں ہوگا کہ صاحبان ایمان اور مسلمان افراد اور اسی طرح یہود و نصاریٰ اور صائبین بشرطیکہ وہ بھی ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کر لیں اور عمل صالح بجالائیں تو سب کے سب اہل نجات اور رستگار ہوں گے اور کسی بھی قسم کے لوگوں کے سابقہ مذہبی اعتقادات کا اس صورت میں ان پر کوئی اثر نہ ہوگا اگر وہ ایمان لے آئیں اور راستہ سب کے سامنے کھلا ہوا ہے (غور کیجئے)

۱۔ ”ناس“ کا مادہ ”آس“ ہے جس کا معنی ہے ”غم و اندوہ“۔

۲۔ اس کی مزید توضیح کے لئے تفسیر نمونہ اردو ترجمہ جلد اول، ص ۲۲۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۷۰، ۷۱

(۷۰) ﴿لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَارْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رَسُولًا كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ﴾

(۷۱) ﴿وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾

ترجمہ:

۷۰۔ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے لیکن جب بھی کوئی پیغمبر ان کی خواہشات نفسانی اور میلانات کے خلاف آتا تو بعض کی تکذیب کرتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔

۷۱۔ اور انھوں نے یہ گمان لیا تھا کہ اس کا کوئی بدلہ اور سزا نہ ہوگی لہذا (وہ حقائق کو دیکھنے اور سچی باتوں کو سننے سے) اندھے اور بہرے ہو گئے اس کے بعد پھر (وہ بیدار ہوئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اس کے بعد دوبارہ (خواب غفلت میں جا پڑے اور) ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور خدا ان کی کارگزاریوں پر خوب اچھی طرح مطلع ہے۔

ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا

سورہ بقرہ میں جو آیات گزر چکی ہیں ان میں اور اس سورہ کے شروع میں جو آیات گزری ہیں ان میں اُس تاکیدِ عہد و پیمان کی طرف جو خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا اشارہ ہو چکا ہے۔ اس آیت میں دوبارہ اس عہد و پیمان کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل سے پیمان کو وفا کرنے کا مطالبہ کرنے کے لئے ان کی طرف پیغمبر بھیجے ﴿لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَارْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رَسُولًا﴾

جیسا کہ جلد اول میں بیان ہو چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیمان وہی ہے جس کی طرف سورہ بقرہ کی آیت ۹۳ میں اشارہ ہوا ہے یعنی اس پر عمل کرنے کا پیمان جو خدا نے ان پر نازل کیا تھا۔^(۱)

پھر مزید کہتا ہے: انھوں نے نہ صرف یہ کہ اُس پیمان پر عمل نہیں کیا بلکہ جب بھی کوئی پیغمبر ان کے میلانات اور ہوا و ہوس کے خلاف کوئی حکم لاتا تو وہ اس کی مخالفت میں سخت ترین مقابلے اور جھگڑنے پر اتر آتے تھے۔ اُن کے اثرات

کو روکنے پر قادر نہ ہوتے تھے انھیں قتل کر دیتے تھے۔ ﴿کَلِمَا جَاءَ هُمْ رَسُولٌ مَّا لَا تَهْوَىٰ انْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ﴾۔

یہ ہیں طریقے منحرف اور خود خواہ افراد کے کہ بجائے اپنے رہبروں کی پیروی کرنے کے وہ اس بات پر مصر ہیں کہ رہبران کے میلانات اور خواہشات کے تابع ہوں اور اگر وہ ان کے میلانات اور خواہشات کے خلاف ہوں تو اس صورت میں نہ صرف ان کی رہبری قبول نہیں کرتے بلکہ انھیں زندہ رہنے کا حق دینے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

مندرجہ بالا جملے میں ”کذبوا“ ماضی کی شکل میں اور ”یقتلون“ مضارع کی صورت میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب قبل و بعد کی آیات کی لفظی مناسبت کا لحاظ رکھنے کے علاوہ کہ جو سب کے سب مضارع کی صورت میں آئے ہیں یہ ہو کہ چونکہ فعل مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے لہذا خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اس روح اور فکر کے اُن میں ہمیشہ جاری رہنے کو بیان کرے کہ پیغمبروں کو جھٹلانا اور انھیں قتل کرنا ان کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ان کا یہ عمل ایک مستقل پروگرام اور مکتب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ (۲)

بعد والی آیت میں ان سرکشیوں اور جرائم کے باوجود ان کی بے جا خود فریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان حالات کے با وصف وہ یہ کمان کرتے تھے کہ کوئی عذاب و سزا دامن گیر نہ ہوگی۔

جیسا کہ دوسری آیات میں تصریح ہو چکی ہے وہ خود کو ایک برتر قوم و قبیلہ سمجھتے تھے اور خود کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ﴿وَحَسِبُوا اَن لَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾۔

آخر کار اس خطرناک فریب خوردگی نے اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے نے ایک قسم کا پردہ ان کی آنکھوں اور کانوں پر ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ آیات خدا دیکھنے سے اندھے اور کلمات حق سننے سے بہرے ہو گئے ﴿فَعَمَّوْا وَصَمَّوْا﴾۔

لیکن جب انھوں نے اللہ کے عذاب کے نمونے اور اپنے بُرے اعمال کے انجام کا مشاہدہ کیا تو پشیمان ہوئے اور توبہ کر لی اور اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ خداوند تعالیٰ کی دھمکیاں یقینی اور سچ ہونے والی ہیں نیز وہ قطعاً کوئی برتر خاندان نہیں ہیں تو خدا نے بھی اُن کی توبہ کو قبول کر لیا ﴿ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾۔

مگر یہ بیداری اور ندامت و پشیمانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور انھوں نے دوبارہ طغیان دسرکشی اختیار کر لی اور حق و عدالت کو ٹھکرانا شروع کر دیا اور ایک دفعہ پھر غفلت کے پردے کے جو گناہ کے اندر ڈوب جانے کے آثار ہیں اُن کی

آنکھوں اور کانوں پر پڑ گئے اور پھر وہ آیات حق دیکھنے سے اندھے اور حق کی باتیں سننے سے بہرے ہو گئے اور ان میں سے بہت سوں کی یہ حالت ہو گئی ﴿ثُمَّ عَمَوُا وَ صَمُّوا کَثِیْرٌ مِنْهُمْ﴾ -

شاید ”عموا“ (اندھے ہو گئے) کو ”صموا“ (بہرے ہو گئے) پر مقدم رکھنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ پہلی دفعہ انھیں آیات خدا اور پیغمبر کے معجزات کو دیکھنا چاہیے اور پھر ان کے احکام کو سننا چاہیے۔ ”کثیر منہم“ (ان میں سے بہت سے) کا ذکر ”عموا و صموا“ کے الفاظ کی تکرار کے بعد درحقیقت دونوں الفاظ کی توضیح کے طور پر ہے یعنی غفلت و بے خبری اور اندھے اور بہرے ہونے کی حالت حقائق کے مقابلے میں کوئی عمومی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ہمیشہ ایک صالح اور نیک اقلیت بھی ان کے درمیان موجود رہی تھی اور یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کے یہودیوں پر حملے کسی طرح بھی نسلی اور قبائلی پہلو نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ صرف ان کے اعمال کی وجہ سے تھے۔

کیا ”عموا و صموا“ کے الفاظ کی تکرار کلیت اور تاکید کا پہلو رکھتی ہے یا یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل میں ہوئے تھے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہیں ایک بابل کے لوگوں کے حملے کے وقت اور دوسرے ایرانیوں اور رومیوں کے حملے کے زمانے میں کہ جس کی طرف قرآن نے سورہ بنی اسرائیل کی ابتداء میں ایک مختصر سا اشارہ کیا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بارہا اس حالت میں گرفتار ہوتے رہے ہیں اور جب بھی وہ اپنے بُرے اعمال کے منحوس نتائج دیکھتے تو توبہ کر لیتے اور پھر توبہ کو توڑ دیتے نہ یہ کہ صرف دو ہی مرتبہ ایسا ہوا۔ آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پُر معنی جملے کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ خدا کسی وقت بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں تھا اور تمام کام جو انجام دیتے ہیں انھیں وہ دیکھتا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بِصِیْرِ بِمَا یَعْمَلُوْنَ﴾

۱۔ تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۹۳ کے ذیل میں۔

۲۔ حقیقت میں ”فَرِیْقًا کَذِبُوا وَ فَرِیْقًا یَقْتُلُوْنَ“ کا جملہ جیسا کہ مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں آیا ہے دراصل ”کَذِبُوا وَ قَتَلُوا“ اور ”یَکْذِبُوْنَ وَ یَقْتُلُوْنَ“ تھا۔

آیات ۷۲، ۷۳، ۷۴

(۷۲) ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾.

(۷۳) ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهٌ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾.

(۷۴) ﴿أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

ترجمہ:

۷۲- جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ یقیناً کافر ہیں (جبکہ خود) مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم خدائے واحد و یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی کیونکہ جو شخص کسی کو خدا کا شریک قرار دے گا خدا نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی یا اور انصار نہیں ہے۔

۷۳- جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ بھی یقیناً کافر ہو گئے ہیں کیونکہ معبود یگانہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے اس قول سے دستبردار نہ ہوئے تو اُن میں سے (اس عقیدہ پر قائم رہنے والے) کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

۷۴- کیا وہ خدا کے حضور توبہ نہیں کرتے، اُس کی طرف نہیں پلٹتے اور اُس سے طلب بخشش نہیں کرتے جبکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مسیح اور تثلیث

ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں یہودیوں کے انحرافات سے متعلق گزری ہیں، یہ آیات اور ان سے بعد والی آیات عیسائیوں کے انحرافات کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ سب سے پہلے تو خدا اس آیت میں مسیحیت کے اہم ترین انحراف یعنی مسئلہ الوہیتِ مسیح اور تثلیثِ معبود سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: یقیناً جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ کافر ہو گئے ہیں۔ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾

اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہوگا کہ ہر جہت سے لامحدود خدا کو ایسی مخلوق کے ساتھ کہ جو ہر جہت سے محدود ہے ایک اور متحد سمجھ لیا جائے اور مخلوق کی صفات کو خالق میں قرار دے لیا جائے جبکہ خود مسیح نے صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل سے کہا کہ تم خدائے یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

﴿وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾

اور اس طرح سے اپنے متعلق ہر قسم کے غلو اور شرک سے نفی کرتے ہوئے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور خود کو خدائے تعالیٰ کی دوسری مخلوقات کی طرح ہی ایک مخلوق کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ساتھ ہی اس مطلب کی تاکید مزید اور ہر قسم کا شک و شبہ دور کرنے کے لئے مسیح نے مزید کہا کہ ”جو خدا کے لئے کوئی شریک قرار دے اس پر خدا نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔“ ﴿إِنَّهُ مِنْ يَشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ﴾ پھر مزید تاکید اور اس حقیقت کے اثبات کے لئے کہ شرک و غلو ایک قسم کا کھلم کھلا ظلم ہے اُن سے کہتا ہے کہ ستمگروں اور ظالموں کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔ ﴿وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ تاریخ مسیحیت یہ کہتی ہے کہ تثلیث کا قرن اول میں اور خصوصاً حضرت مسیح کے زمانے میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ موجودہ انجیلوں میں بھی اپنی تمام تر تحریفات کے باوجود تثلیث کے بارے میں ذرا سی بات بھی دکھائی نہیں دیتی اور خود مسیحی محققین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔

بنابراین مذکورہ بالا آیت میں حضرت مسیح کی ثابت قدمی و پافشاری اور مسئلہ توحید کے بارے میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ مسیحیت کے موجودہ منابع اور کتب سے بھی ہم آہنگ ہے اور یہ بات قرآن کی عظمت کے دلائل میں سے شمار ہوتی ہے

۔ (۱)

ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اس آیت میں جو موضوع زیر بحث ہے وہ مسئلہ غلو اور جناب مسیح کی خدا کے ساتھ وحدت ہے دوسرے لفظوں میں ”توحید در تثلیث“ کا معاملہ زیر نظر ہے لیکن بعد کی آیت میں مسیحیوں کے نقطہ نظر سے ”خداؤں کے تعدد“ یعنی تثلیث در توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ”جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین اقانیم میں سے تیسرا اقنوم (۲) ہے وہ مسلماً کافر ہیں“ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثَةٌ﴾۔

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں شیخ طوسی نے ”تبیان“ میں اور رازی و قرطبی نے اپنی اپنی تفسیروں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلی آیت تو عیسائیوں کے یعقوبیہ نامی فرقے کے بارے میں ہے جو خدا کو حضرت

مسیح کے ساتھ متحد جانتے ہیں لیکن یہ آیت ملکانیہ اور فسطوریہ نامی فرقوں کے بارے میں ہے۔ یہ لوگ تین خداؤں کے قائل ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسے مسیحیوں کے بعض فرقوں سے غیر متعلق کہنا حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا چونکہ تثلیث کا عقیدہ تو تمام عیسائیوں میں عمومیت رکھتا ہے جیسا کہ خدا کی توحید اور یکتائی کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے درمیان قطعی اور مسلم ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جہاں وہ خداؤں کو تین مانتے ہیں وہاں وہ اسے یگانہ حقیقی بھی مانتے ہیں اور ان کے اعتماد کے مطابق تین حقیقی واحد مل کر ایک حقیقی واحد کو تشکیل دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات ظاہراً ان دونوں قضیوں کے دو مختلف پہلوؤں کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔ پہلی آیت میں تین خداؤں کی وحدت کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت میں اُن کے تعدد کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور ان دونوں بیانات کا ایک دوسرے کے ساتھ آگے پیچھے آنا درحقیقت اُن کے عقیدے کے بطلان کے روشن و واضح دلائل میں سے ہے کہ کس طرح ان کے زخم میں خداوند تعالیٰ کبھی مسیح اور روح القدس کے ساتھ مل کر حقیقتاً ایک ہو جاتا ہے اور کبھی حقیقتاً تین چیزیں بن جاتا ہے کیا تین کا ایک کے ساتھ مساوی ہو جانا کوئی معقول بات ہے۔

جوابات اس حقیقت کی تائید کرتی ہے یہ ہے کہ عیسائیوں میں ایک گروہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو تین خداؤں کا قائل نہ ہو۔^(۳)

پھر قرآن قطعی طور پر ان کے جواب میں کہتا ہے: خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ”وَمَا مِنْ آلَهِ“ خصوصاً لفظ ”مِنْ“ کا لفظ ”آلہ“ سے پہلے آنا دوسرے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔

دوسری مرتبہ پھر انتہائی سخت اور تاکید لب و لہجہ میں اُن کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر دو اس عقیدے سے دستبردار نہ ہوں گے تو اُن لوگوں کو جو اس کفر پر باقی رہیں گے ضرور دردناک عذاب پہنچے گا ﴿وَإِنْ لَّمْ يَنْتَهُوا

عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابُ الْيَمِّ﴾۔

”منہم“ میں کلمہ ”من“ بعض کی نظر میں بیانیہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اسے ”بعض“ کے مفہوم میں ہونا چاہیے اور حقیقت میں یہ ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہے اور قرآن کی دعوت توحید کے بعد بھی صحیح عقیدے کی طرف نہیں پلٹے نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی اور صحیح عقیدہ کی طرف پلٹ آئے۔

تفسیر ”المنار“ میں کتاب ”اظہار الحق“ سے ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جس کا یہاں پر ذکر کرنا غیر مناسب نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث و توحید کتنی ناقابل فہم ہے۔

اس کتاب کا مولف کہتا ہے: تین آدمی عیسائی ہو گئے۔ پادری نے عیسائیت کے ضروری عقائد کہ جن میں سے ایک عقیدہ تثلیث بھی تھا انھیں تعلیم کر دیا۔ ایک دن ایک کٹر عیسائی عقیدہ رکھنے والا اُس پادری کے پاس آیا اور اُس نے اُن لوگوں کے بارے میں جو نئے نئے عیسائی ہوئے تھے سوال کیا۔ پادری نے انتہائی خوشی کے عالم میں ان تین افراد کی طرف اشارہ کیا تو اس نے فوراً پوچھا کہ کیا انھوں نے ہمارے ضروری عقائد میں سے کچھ یاد کر لیا ہے۔ پادری نے بڑی دلیری اور تاکید کے ساتھ کہا: ہاں! ہاں! اس کے بعد نمونے کے طور پر اُن میں سے ایک کو آواز دی تاکہ مہمان کے سامنے اس کی آزمائش کرے۔ پادری نے کہا تم تثلیث کے بارے میں کیا جانتے ہو؟۔

اس نے جواب میں کہا: آپ نے مجھے یہ بتلایا ہے کہ خداتین ہیں۔ ایک آسمان میں ہے، دوسرا زمین میں ہے کہ جو مریم کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔ تیسرا خدا کبوتر کی شکل میں دوسرے خدا پر تیس سال کی عمر میں نازل ہوا۔ پادری کو غصہ آگیا اور اُس کو باہر نکال دیا۔ کہنے لگا: اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر دوسرے شخص کو آواز دی تو اُس نے اس سوال کے جواب میں تثلیث کے بارے میں بتلایا کہ آپ نے مجھے اس طرح تعلیم دی ہے کہ خداتین تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک سولی پر چڑھا دیا گیا لہذا اب ہمارے پاس صرف دو خدا باقی رہ گئے ہیں۔ پادری کو اس پر اس سے بھی زیادہ غصہ آیا اور اسے بھی باہر نکال دیا۔ اس کے بعد تیسرے آدمی کو جو سب سے زیادہ سمجھدار اور دینی عقائد کو یاد کرنے میں زیادہ کوشش کرنے والا تھا، آواز دی اور وہی مسئلہ اُس نے بڑے ادب اور احترام سے کہا: اے میرے پیشوا جو کچھ آپ نے مجھے تعلیم دی ہے میں نے اسے مکمل طور پر یاد کر لیا ہے اور حضرت مسیح کی برکت سے میں نے اُسے اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ خدائے یگانہ سہ گانہ ہے (ایک خداتین ہیں) اور تین خدا ایک ہیں۔ اُن میں سے ایک کو انھوں نے سولی پر لٹکا دیا اور وہ مر گیا اس بنا پر وہ سب کے سب مر گئے کیونکہ وہ باقیوں کے ساتھ متحد اور ایک ہی تھا لہذا اس طرح سے اب کوئی خدا باقی نہیں رہا۔

ان آیات میں سے تیسری آیت میں دعوت دی گئی ہے کہ اس کفر آمیز عقیدے سے توبہ کرو، یہ دعوت اس لئے ہے تاکہ خدا اپنی عفو و بخشش ان کے شامل حال کر دے۔ لہذا کہا گیا ہے: کیا وہ ان تمام باتوں کے بعد خدائے یکتا کی طرف نہیں پلٹتے اور اس شرک اور کفر سے مغفرت نہیں چاہتے حالانکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۔ اس موضوع کی مزید وضاحت اور مسئلہ تثلیث اور وحدت در تثلیث کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد چہارم، ص ۱۷۶ کی طرف رجوع کریں (اُردو ترجمہ)۔

۲۔ ”اقنوم“ کا معنی ہے اصل اور ذات اور اس کی جمع ”اقانیم“ ہے۔

۳۔ بعض روایات و تاریخ میں نقل ہوا ہے کہ عیسائیوں میں ایک ایسی اقلیت بھی وجود رکھتی ہے جو تین خداؤں کے قائل نہیں ہیں بلکہ صرف عیسیٰ کی خدا سے وحدت کے قائل ہیں لیکن آج ایسے لوگ بہت کم یاب ہیں۔

آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷

(۷۵) ﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾۔

(۷۶) ﴿قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾۔

(۷۷) ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ

سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾۔

ترجمہ:

۷۵۔ مسیح ابن مریم فقط فرستادہ خدا تھے اُن سے پہلے اور دوسرے بھی فرستارگان الہی ہی تھے ان کی ماں بھی بہت سچی خاتون تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے (لہذا تم کس طرح سے مسیح کی الوہیت کا دعویٰ اور اس کی ماں کی عبادت کرتے ہو) غور کرو کہ ہم کس کس طرح سے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ حق سے کس طرح باز رکھے جاتے ہیں۔

۷۶۔ کہہ دو کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نقصان ہی پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے نفع کی مالک ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۷۷۔ کہہ دو اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں غلو (اور تجاوز) نہ کرو اور حق کے سوا کچھ نہ کہو اور ایسے لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ کو فقط ایک فرستادہ خدا (رسول) جانیں

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے غلو اور ان کی الوہیت کے اعتقاد سے متعلق گزری ہیں ان آیات میں واضح دلائل سے چند مختصر جملوں میں ان کے اس عقیدے کو باطل کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے کہ مسیح اور باقی انبیاء کے درمیان کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے تم مسیح کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہو۔ مسیح ابن مریم بھی خدا کے ایک رسول ہی تھے اور اُن سے پہلے بھی خدا کی طرف سے رسول اور اس کے دیگر فرستادگان

آتے رہے ہیں ﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾۔

اگر خدا کی طرف سے رسول ہونا الوہیت اور شرک کی دلیل ہے تو پھر باقی انبیاء کے متعلق بھی اسی چیز کے قائل کیوں نہیں ہوتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کجرو و عیسائی ہر گز اس بات پر قانع نہیں ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو فقط ایک فرستادہ خدا (رسول) جانیں بلکہ ان کا عام عقیدہ کہ جس پر وہ فعلاً قائم ہیں یہ ہے کہ وہ انھیں خدا کا بیٹا اور ایک معنی میں خود خدا سمجھتے ہیں کہ جو بشریت کے گناہوں کو خریدنے کے لئے (نہ کہ ان کی ہدایت و رہبری کے لیے) آیا ہے۔ اسی لئے وہ اس کو ”فادی“ (نوع بشر کے گناہوں کا فدیہ ہونے والا) کا لقب دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بات کی تائید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اس کی ماں بہت ہی سچی خاتون تھیں (وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولاً تو وہ شخص کہ جس کی کوئی ماں ہے اور وہ ایک عورت کے شکم میں پرورش پاتا ہے اور بہت سی حوائج و ضروریات رکھتا ہے وہ کس طرح خدا ہو سکتا ہے؛ اور دوسرے یہ کہ اگر اس کی ماں قابل احترام ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ بھی مسیح کی رسالت کے دوران اُن سے ہم آہنگ تھیں اور کار رسالت میں ان کی مددگار تھیں تو اس طرح سے وہ بھی خدا کی ایک خاص بندہ ہی تھیں لہذا ان کی ایک معبود کی طرح سے عبادت و پرستش نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ عیسائیوں میں رائج ہے کہ وہ اُن کے مجسمہ کے سامنے عبادت و پرستش کی حد تک خضوع کرتے ہیں۔ اس کے بعد عیسیٰ کی ربوبیت کی نفی کی ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے فرمایا: وہ اور ان کی ماں دونوں کھانا کھاتے تھے ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ تو جو شخص اتنا محتاج ہے کہ اگر چند دن اُسے کھانا نہ ملے تو اُس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہے وہ کس طرح سے پروردگار یا خدا کے ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک طرف تو اُن دلائل کے واضح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف ان واضح و آشکار دلائل کے مقابلہ میں ان کی ہٹ دھرمی، سختی اور نادانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ذرا دیکھو تو سہی کہ ہم کس طرح ان دلائل کو وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ﴿انظر كيف نبين لهم الآيات ثم انظر اني يوفكون﴾^(۱)۔

بنابراین ان دو جملوں میں ”انظر“ کی تکرار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ان روشن و واضح دلائل پر غور کرو کہ جو ہر شخص کی توجہ کے لئے کافی ہیں اور دوسری طرف اُن کے حیرت انگیز اور منفی عکس العمل پر نظر کرو کہ جو ہر شخص کے لئے تعجب خیز ہے۔

بعد الی آیت میں گزشتہ استدلال کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے: تمہیں معلوم ہے کہ مسیح خود سرتاپا احتیاجاتِ بشری رکھتے اور خود اپنے نفع و نقصان پر قادر نہیں تھے چہ جائیکہ وہ تمہارے نفع و نقصان پر قادر ہوں ﴿قُلْ اتَّعْبُدُونِ مَنْ دُونَ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾۔

اسی بنا پر وہ بارہا دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے۔ یا ان کے دوست گرفتار ہوئے۔ اگر لطفِ خدا ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

آخرین انہیں اس خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ خبردار کہیں یہ گمان نہ کر لینا کہ خدا تمہاری ناروا باتوں کو سنتا نہیں ہے یا وہ تمہارے باطن سے آگاہ نہیں ہے، خدا سننے والا بھی ہے اور عالم و دانا بھی ﴿وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مسیح کے بشر ہونے اور ان کی مادی اور جسمانی ضروریات اور احتیاجات کا مسئلہ کہ جس کا قرآن نے ان آیات اور دوسری آیات میں تذکرہ کیا ہے حضرت عیسیٰ کی خدائی کا دعویٰ کرنے والے عیسائیوں کے لئے بہت بڑی مشکلات میں سے ایک ہے کہ جس کی توجیہ کے لئے وہ بہت ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بعض اوقات وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ مشکلات میں سے ایک ہے کہ جس کی توجیہ کے لئے وہ بہت ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بعض اوقات وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے لئے جنہوں کے قائل ہوں جنبہِ لاہوت اور دوسرے جنبہِ ناسوت۔ جنبہِ لاہوت کی نظر سے وہ خدا کے بیٹے ہیں اور خود خدا ہیں اور ناسوت کی نظر سے جسم اور مخلوقِ خدا ہیں اور اسی قسم کی دوسری توجیہات کہ جو ان کی منطق کے ضعف اور نادرستی کی بہترین مظہر ہیں۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں لفظ ”من“ کے بجائے ”ما“ استعمال ہوا ہے جو عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لئے ذکر ہوتا ہے یہ تعبیر شاید اسی بنا پر ہو کہ باقی معبودوں اور بتوں کو بھی جو پتھر اور لکڑی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں اس جملہ کی عمومیت میں داخل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مخلوق کی پرستش جائز ہو تو پھر بت پرستوں کی بت پرستی بھی جائز شمار کی جائے۔ کیونکہ مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں اور مساوی ہیں اور حقیقت میں حضرت مسیح کی الوہیت پر ایمان ایک طرح کی بت پرستی ہیں ہے نہ کہ خدا پرستی۔

انبیاء کے بارے میں غلو کے سلسلے میں روشن دلائل سے اہل کتاب کا اشتباہ واضح ہو جانے کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں دعوت دو کہ وہ اس راستے سے عملی طور پر پلٹ آئیں۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں

غلو نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو اور حق کے علاوہ کوئی بات نہ کہو ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾۔^(۲)

البتہ عیسائیوں کا غلو تو واضح ہے باقی رہا یہودیوں کا غلو کہ اہل کتاب کا خطاب ان کے بارے میں بھی ہے، تو بعید نہیں ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جو وہ عزیر کے بارے میں کہتے تھے اور اُسے خدا کا بیٹا سمجھتے تھے۔ چونکہ غلو کا سرچشمہ عموماً گمراہ لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ہے اس لئے اس گفتگو کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے کہ اس قوم کی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ جو تم سے پہلے گمراہ ہوئی اور انھوں نے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور جو راہ مستقیم سے منحرف ہو گئے ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَاضْلَوْا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾۔

یہ جملہ حقیقت میں ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو مسیحیت کی تاریخ میں بھی منعکس ہے کہ مسئلہ تثلیث اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں ان کے درمیان وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ جب ہندوستان کے بت پرست اور ان کی مانند دوسرے لوگوں نے دین مسیحیت اختیار کیا تو انھوں نے اپنے سابقہ دین میں سے باقی ماندہ ایک چیز یعنی تثلیث شرک کو مسیحیت میں شامل کر دیا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ثابوث ہندی (تین خداؤں، برہما فیشنو، سیفا پر ایمان) تاریخی لحاظ سے تثلیث مسیحیت سے پہلے تھا اور درحقیقت یہ اسی کی عکاسی ہے۔ سورہ توبہ کی آیت ۳۰ میں بھی یہود و نصاریٰ کے عزیر و عیسیٰ کے بارے میں غلو کے ذکر کے بعد ہے کہ:

﴿يَضَاهُئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ﴾

”ان کی باتیں گزشتہ کفار کی باتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔“

اس عبارت میں لفظ ”ضلوا“ اُن کفار کے بارے میں ہے کہ جن سے اہل کتاب نے غلو کا قبباس کیا تھا اور یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہو یا اس بنا پر ہو کہ وہ پہلے سے گمراہ تھے ہی لیکن بعد میں اپنی تبلیغات کے ذریعہ انھوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا تو وہ ایک نئی گمراہی میں جا گرے۔ کیونکہ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ لے جائے درحقیقت وہ سب سے زیادہ گمراہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنی قوتوں کو خود اپنی اور دوسرے لوگوں کی بدبختی میں تلف کر دیا ہے اور دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے دوش پر اٹھالیا ہے۔ آیا وہ شخص کہ جو سیدھے راستے پر قرار پا چکا ہو کبھی اس بات کے لئے تیار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے۔

۱۔ ”یونکون“ کا مادہ ”افک“ ہے اور یہ دراصل کسی چیز سے منحرف کرنے کے معنی دیتا ہے اور ”ما فوک“ ایسے شخص کو کہا جاتا ہے کہ جسے حق سے روک دیا گیا ہو، اگرچہ خود اس کی کوتاہی کی بنا پر ایسا ہوا ہو۔ اور چونکہ جھوٹ انسان کو حق سے روک دیتا ہے اس لئے اس کو ”افک“ کہا جاتا ہے۔

۲۔ ”لا تغلوا“ کا مادہ ”غلو“ ہے جس کے معنی ہیں حق سے تجاوز کرنا۔ فرق یہ ہے کہ جب یہ کسی کے مقام و منزلت سے متعلق تجاوز ہو تو غلو کہا جاتا ہے، اگر کسی چیز کے زرخ اور قیمت کے بارے میں ہو تو غلاء کہا جاتا ہے اور اگر تیر کے بارے میں ہو تو غلو بروزن دلو کہتے ہیں جوش مارنے کو غلیان کہتے ہیں اور جو جانور بہت ہی سرکش ہو اُسے غلواء کہتے ہیں، یہ سب اسی مادہ سے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ غلو افراط کی طرف بھی بولا جاتا ہے اور تفریط کی طرف بھی جبکہ بعض اسے تفریط میں منحصر سمجھتے ہیں اور اس کے نقطہ مقابل کو تقصیر کہتے ہیں۔

آیات ۷۸، ۷۹، ۸۰

۷۸ ﴿لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾۔

۷۹ ﴿كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾۔

۸۰ ﴿تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ

خَالِدُونَ﴾۔

ترجمہ:

۷۸۔ جو لوگ بنی اسرائیل میں سے کافر ہو گئے ہیں انھیں حضرت داؤد و عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس بنا پر ہوا کہ وہ گناہ اور تجاوز کرتے تھے۔

۷۹۔ وہ ان برے اعمال سے جنہیں وہ خود انجام دیتے تھے ایک دوسرے کو منع نہیں کیا کرتے تھے۔

۸۰۔ تم اُن میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ کافروں (اور بت پرستوں) کو دوست رکھتے ہیں (اور اُن سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں) انھوں نے کتنے بُرے اعمال اپنے (انجام اور آخرت) کے لئے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کی ناراضگی تھی اور وہ ہمیشہ عذاب (الہی) میں رہیں گے۔

﴿لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾۔

ان آیات میں اس بنا پر کہ اہل کتاب کو اُن سے پہلے لوگوں کی اندھی تقلید سے روکا جائے اُن کی بد بختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؟ بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے اور ان دو بزرگ انبیاء نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ انھیں اپنی رحمت سے دور رکھے (لَعْنُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ)۔

اس سلسلے میں کہ صرف ان دو ہی پیغمبروں کا نام کیوں لیا گیا کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد زیادہ معروف نبی یہی دونوں تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ داؤد کی اولاد ہیں۔ لہذا قرآن اس جملے کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت داؤد ان لوگوں سے کہ جنہوں نے کفر و طغیان اختیار کیا تھا متنفر تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں دو تاریخی واقعات

کی طرف اشارہ ہے کہ جس پر یہ دونوں عظیم پیغمبر غضب ناک ہوئے اور انھوں نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر لعنت کی۔ حضرت داؤد نے ساحلی شہر ایلہ کے ساکنین پر کہ جو اصحاب سبت کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا قصہ سورہ اعراف میں آئے گا اور حضرت عیسیٰ نے اپنے پیروکاروں میں سے اس گروہ پر لعنت و نفرین کی کہ جنھوں نے آسمانی ماندہ کے نازل ہونے کے بعد بھی انکار و مخالفت کی راہ کئے رکھے تھی۔

بہر حال اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نسل بنی اسرائیل سے ہونا یا حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں میں سے ہونا کسی کی نجات کا باعث نہیں ہوگا، جب تک اُن کے اعمال کے ساتھ ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے۔ بلکہ خود ان انبیاء نے ایسے افراد سے نفرت کی ہے۔

آیت کا آخری جملہ بھی اس مطلب کی تائید کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ نفرت و بیزاری کا یہ اعلان اس بنا پر تھا کہ وہ گنہگار اور تجاوز کرنے والے تھے ﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾۔

اس کے علاوہ وہ لوگ کسی طرح بھی اپنے لئے کسی اجتماعی ذمہ داری کے قائل نہ تھے اور ایک دوسرے کو غلط کاری سے منع نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اُن میں سے نیک لوگوں کا ایک گروہ خاموشی سے اور سازشی انداز میں گنہگار لوگوں میں عملی طور پر شوق پیدا کرتا تھا ﴿كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعْلُوهُ﴾۔

اس طرح ان کی زندگی کا لائحہ عمل بہت ہی پست اور ناپسندیدہ تھا ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾۔

اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اکرم اور ائمہ اہلبیت سے ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔ ایک حدیث میں جو پیغمبر سے روایت ہوئی ہے منقول ہے:

”لَتَأْمُرْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذْنَ عَلَىٰ يَدِ السَّفِيهِ وَلَتَأْطُرْنَ عَلَىٰ الْحَقِّ اطْرَافًا، أَوْ لِيُضْرِبَنَّ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَيُلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ“

”تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، نادان اور جاہل لوگوں کا ہاتھ پکڑو اور حق کی طرف دعوت دو ورنہ خدا تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کی مانند کر دے گا اور تمہیں اپنی وصیت سے اسی طرح دور کرے گا جس طرح سے اس نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔^(۱)

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے (کانوا لا يتناھون عن منکر فعلوہ) کی تفسیر میں منقول ہے:

”اما اَھم لم یکنونوا یدخلون مداخلھم ولا یجلسون مجالسھم ولکن کانوا اذا لقوھم ضحکوا فی وجوھھم وانسو

بھم“ (۲)

”یہ گروہ جن کی خدامت کر رہا ہے ہرگز گنہگاروں کے کاموں اور ان کی محفلوں میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ فقط اُس وقت جبکہ اُن سے ملاقات کرتے تھے تو اپن کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان سے مانوس تھے“

بعد والی آیت میں ان کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اُن میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کی بنیادیں استوار کرتے ہیں (تری کثیراً منھم یتولون الذین کفروا)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی دوستی ایک عام دوستی کی طرح نہ تھی بلکہ وہ طرح طرح کے گناہوں سے مخلوط اور غلط اعمال و افکار کا شوق پیدا کرنے والی دوستی تھی لہذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اُنھوں نے کیسے بُرے اعمال اپنی آخرت کے لئے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا خشم و غضب تھا اور وہ ہمیشہ کے لئے عذابِ الہی میں مبتلا رہیں گے۔

﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمْتُمْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ﴾

اس بارے میں کہ ”الذین کفروا“ سے اس آیت میں کون سے افراد مراد ہیں بعض نے تو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے منظور مشرکین مکہ ہیں کہ جن کے ساتھ یہودیوں نے دوستی کی پینگیں بڑھا رکھی تھیں اور بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے منظور وہ ظالم و ستمگر ہیں جن کے ساتھ یہودیوں نے گزشتہ زمانے میں دوستی کر رکھی تھی۔

وہ حدیث جو امام باقر علیہ السلام سے اس سلسلہ میں وارد ہوئی وہ بھی اس معنی کی تاکید کرتی ہے، آپ فرماتے ہیں:

”یتولون الملوک الجبارین ویزینون ہوائھم لیصیبوا من دنیاھم“ (۳)

”یہ گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو جابر بادشاہوں کو دوست رکھتے تھے اور ان کے ہوس آلود گناہوں کو ان کی نظر میں اچھا کر کے پیش کرتے تھے تاکہ انھیں اُن کا تقرب حاصل ہو اور ان کی دنیا سے بہرہ ور ہوں“

اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ آیت دونوں ہی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہو بلکہ ان معنی سے بھی بڑھ کر عام ہو۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر قطبی جلد چہارم صفحہ ۲۲۵۰ میں اسی مضمون کی ایک حدیث ترمذی سے نقل کی گئی ہے

۲۔ تفسیر برہان، ج ۱، ص ۴۹۲؛ تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۶۶۱۔

۳۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آیت ۸۱

﴿وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾

ترجمہ:

”اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کچھ اس کے اوپر نازل ہوا ہے اُس پر ایمان لے آتے تو (ہرگز) انھیں اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں بہت سے فاسق ہیں“
خدا نے انھیں ان ہی باتوں کی وجہ سے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ انھیں اس غلط اور نادرست طریقہ عمل سے راہ نجات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اگر واقعاً وہ خدا اور پیغمبر اور کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے تھے تو کبھی بیگانوں اور خدا کے دشمنوں سے دوستی نہ کرتے اور نہ ہی انھیں اپنے لئے سہارے کے طور پر منتخب کرتے

﴿وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ لیکن افسوس کہ ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن میں اطاعت خدا کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں اور اُن میں سے زیادہ تر فرمان خدا کے دائرہ سے خارج ہو چکے ہیں اور فسق کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں ﴿وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ”النبی“ سے مراد پیغمبر اسلام (ص) ہیں کیونکہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اور یہ امر قرآن کی دسیوں آیات میں دکھائی دیتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ ”کانوا“ کی ضمیر مشرکین اور بت پرستوں کی طرف لوٹتی ہو کہ اگر یہ مشرک جو یہودیوں کے دوست اور ان کے لئے قابل اعتماد ہیں پیغمبر اکرم (ص) اور قرآن پر ایمان لاتے تو یہودی کبھی انھیں اپنا دوست نہ بناتے اور یہ اُن کی گمراہی اور فسق و فجور کی واضح نشانی ہے کیونکہ وہ کتب آسمانی کی پیروی کے دعوے کے ساتھ بت پرستوں سے اس وقت تک دوستی نہ کرتے جب تک وہ مشرک ہیں جبکہ ہوتا یہ ہے کہ جب وہ خدا اور آسمانی کتابوں کی طرف آجاتے ہیں تو یہ اُن سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور اس کے مطابق تمام ضمیریں ایک ہی مرجع (یعنی یہودیوں) کی طرف لوٹتی ہیں۔

آیات ۸۳، ۸۲، ۸۶، ۸۵

۸۲ ﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قِسْيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾

۸۳ ﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ﴾

۸۴ ﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ﴾

۸۵ ﴿فَأَنَّا بَعَثْنَا فِيهِمَا رِجَالًا يَلْعَنُونَ فِيهَا خَالِدِينَ فِيهَا وَذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ﴾

۸۶ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾

ترجمہ:

۸۲۔ یقینی طور پر تم یہود اور مشرکین کو مومنین کی دشمنی میں سب لوگوں سے بڑھا ہوا پاؤ گے لیکن وہ لوگ کہ جو خود کو مسیحی کہتے ہیں انھیں تم مومنین کے ساتھ دوستی میں قریب تر پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں کچھ دانشمند اور دنیا سے دور افراد موجود ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے۔^(۱)

۸۳۔ اور وہ جس وقت پیغمبر پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے (فرط شوق میں) آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس تو ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔

۸۴۔ ہم خدا پر اور اُس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے کیوں ایمان نہ لے آئیں جبکہ ہماری آرزو ہے کہ وہ ہمیں صالحین کے گروہ میں سے قرار دے۔

۸۵۔ خدا نے انھیں ان ہی باتوں کی وجہ سے جنت کے ایسے باغات ثواب و جزا کے طور پر دیئے کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ نیکوکار لوگوں کی جزا ہے۔

۸۶۔ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اہل دوزخ ہیں۔

اسلام کے پہلے مہاجرین

بہت سے مفسرین نے منجملہ طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں اور فخر الدین رازی اور ”المنار“ کے مولف نے اپنی اپنی تفسیروں میں اپنے سے پہلے مفسرین کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات پیغمبر اکرم کے زمانے کے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نال ہوئی ہیں، نیز جو حدیث تفسیر ”برہان“ میں نقل ہوئی ہے اس میں بھی یہی بات شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی روایات و تواریخ اور مفسرین کے اقوال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ اس طرح ہے کہ پیغمبر اکرم کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ قریش نے قبائل عرب کو یہ نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرم پر ایمان لا چکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم و قبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا، اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہادِ آزادی شروع شروع کرنے کے لئے کافی نہیں تھی، پیغمبر اکرم نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لئے حجاز سے باہر قیام گاہ مہینا کرنے کے لئے انھیں ہجرت کا حکم دے دیا اور اس مقصد کے لئے حبشہ کو منتخب فرمایا اور کہا کہ وہاں ایک نیک دل بادشاہ ہے جو ظلم و ستم کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ کوئی مناسب موقع ہمیں عطا فرمائے۔

پیغمبر اکرم کی مراد نجاشی سے تھی (نجاشی ایک عام نام تھا جسے ”کسریٰ“ جو حبشہ کے تمام بادشاہوں کا خاص لقب تھا لیکن اس نجاشی کا اصل نام جو پیغمبر کا ہم عصر تھا اصحہ تھا جو کہ حبشہ کی زبان میں عطیہ و بخشش کے معنی میں ہے) مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لئے روانہ ہو گئے، یہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب جعفر بن ابوطالب بھس مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں ۸۲ مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لئے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن و امان کی طرف چلے گئے ہیں، مسلمانوں کی طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ یہ حیثیت ختم کرنے کے لئے انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا، اس مقصد کے لئے انھوں نے جوانوں میں سے دو ہوشیار، فعال، جیلہ ساز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ

بن ولید کا انتخاب کیا، بہت سے ہدیے دے کر اُن کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان دونوں نے کشتی میں بیٹھ کر شراب پی اور ایک دوسرے سے لڑپڑے، لیکن آخر کار وہ اپنی سازش کو روبہ عمل لانے کے لئے سرزمین حبشہ میں داخل ہو گئے، ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے، دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انھوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کر اُن کو اپنا موافق بنالیا تھا اور اُن سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

عمر و عاص نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہمکلام ہوا:

”ہم سردار ان مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں، ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں اور ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتے ہیں، انھوں نے فتنہ و فساد برپا کر دیا ہے، لوگوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے؛ آپ کی سرزمین کی آزادی سے انھوں نے غلط اٹھایا ہے اور انھوں نے یہاں آکر پناہ لی ہے، ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں، بہتر یہ ہے کہ آپ انھیں ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم انھیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کر ان لوگوں نے وہ ہدیے جو اپنے ساتھ لائے تھے پیش کئے۔

نجاشی نے کہا: جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہذا ضروری ہے کہ مذہبی نمائندوں ہی کو ایک جلسہ میں تمھاری موجودگی میں دعوت دی جائے۔

دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا، اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی، جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر تھے، نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور اُن سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔

جناب جعفر ادا لے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے: پہلے ان سے پوچھئے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمر و نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھئے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمے ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟
عمر: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟
عمر: نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سرزمین سے جو سراسر مرکز ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رخ کیا اور کہا: ہم جاہل اور نادان تھے، بت پرستی کرتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے، طرح طرح کے برے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا، جس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک زبنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم و ستم اور قمار بازی ترک کر دیں۔ ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیح بھی انہی چیزوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا: ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں۔
جعفر نے کہا: جی ہاں:

اور پھر انھوں نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کر دی۔ اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیح اور ان کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں، جناب جعفر کے حسن انتخاب نے عجیب و غریب اثر کیا یہاں تک کہ مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرط شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکار کر کہا: خدا کی قسم! ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمرو نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے، نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمرو کے منہ پر مارا اور کہا: خاموش رہو، خدا کی قسم! اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا۔ یہ کہہ کر مامورین حکومت کی طرف رخ کیا اور پکار کر کہا: ان کے ہدیے ان کو واپس

کردو اور انھیں حبشہ کی سرزمین سے باہر نکال دو۔ جناب جعفر اور اُن کے ساتھیوں سے کہا: تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔

اس واقعہ نے جہاں حبشہ کے کچھ لوگوں پر اسلام شناسی کے سلسلے میں گہرا تبلیغی اثر کیا وہاں یہ واقعہ اس بات کا بھی سبب بنا کہ مکے کے مسلمان اس کو ایک اطمینان بخش جائے پناہ شمار کریں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو اُس دن کے انتظار میں کہ جب وہ کافی قدرت و طاقت حاصل کریں وہاں پر بھیجتے رہیں۔

کئی سال گزر گئے۔ پیغمبر بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرم فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس وقت جبکہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے ٹوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے، دور سے انھوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں، جو آخوش وطن میں پلٹ کر آ رہے ہیں، جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرم نے جناب جعفر اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

”لا ادری انا بفتح خیبر اسرام بقدوم جعفر؟“

”میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی“

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا، پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے سورہ یسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیح کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

اُس روایت کے مطابق جو تفسیر ”المنار“ میں سعید ابن جبیر سے منقول ہے نجاشی نے اپنے یاور و انصار میں سے تیس بہترین افراد کو پیغمبر اکرم اور دین اسلام کے ساتھ اظہارِ عقیدت کے لئے مدینہ بھیجا اور یہ وہی تھے جو سورہ یسین کی آیات سن کر رو پڑے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان مومنین کی عزت افزائی کی گئی۔ (یہ شان نزول اس بات کے خلاف نہیں کہ سورہ مائدہ پیغمبر اکرم کی عمر کے اواخر میں نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ یہ بات اس سورہ کی اکثر آیات کے ساتھ مربوط ہے لہذا اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اُن میں سے کچھ آیات قبل کے واقعات کے

شکلے میں نازل ہوئی ہوں اور پیغمبر کی ہدایت کے مطابق اس سورہ میں بہت سی مناسبات کی وجہ سے شامل کردی گئی ہوں)۔

یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی

ان آیت میں اُن یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے پیغمبر کے ہم عصر تھے۔ پہلی آیت میں یہودیوں اور مشرکین کی ایک ہی صف میں قرار دیا گیا ہے اور عیسائیوں کو دوسری صف میں، ابتدا میں فرمایا گیا ہے: مومنین کے سخت ترین دشمن یہودی اور مشرکین ہیں لیکن عیسائی مومنین سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں (لتجدن اشد الناس عداوة للذين امنوا اليهود و الذين اشركوا ولتجدن اقربهم مودة للذين امنوا الذين قالوا انا نصری)۔

تاریخ اسلام اس حقیقت کی اچھی طرح گواہ ہے کیونکہ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی بہت سی جنگوں کے میدان میں یہودی بلا واسطہ یا بالواسطہ طریقہ سے دخیل رہے ہیں اور کسی عہد شکنی اور دشمنی سے باز نہیں آتے تھے۔ اُن میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے جبکہ ہم اسلام ہوئے جبکہ ہم اسلامی جنگوں میں بہت کم مسلمانوں کو عیسائیوں سے آمنا سامنا کرتے دیکھتے ہیں اور ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ اُن میں سے بہت سے افراد مسلمانوں کی صفوں میں آئے۔

اس کے بعد قرآن اس روحانی فرق کی دلیل اور رہن سہن کے اجتماعی طریقوں کو چند جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر کے ہم عصر عیسائی کچھ ایسے امتیازات رکھتے تھے کہ جو یہودیوں میں نہیں تھے۔

پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ ان میں علماء اور دانشمندوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو دنیا پرست یہودی علماء کی طرح حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے ﴿ذلک بان منهم قسیسین﴾^(۲)۔

نیز اُن کے درمیان کچھ لوگ تارک دنیا بھی تھے کہ جواز روئے عمل لالچی یہودوں کے بالکل برخلاف تھے اگرچہ وہ بھی کئی طرح کے انحرافات کے مرتکب تھے لیکن پھر بھی وہ ایک ایسی سطح پر تھے جو یہودیوں سے بالاتر تھی ﴿ورهباناً﴾۔

اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو حق کے قبول کرنے میں خاضع تھے اور اپنی طرف سے تکبر کا اظہار نہیں کرتے تھے جبکہ یہودیوں کی اکثریت دین اسلام کو قبول کرنے سے اس وجہ سے سرتابی کرتی تھی کیونکہ وہ خود کو ایک برتر نسل سمجھتے تھے اور دین اسلام یہودیوں کی نسل میں قائم نہیں ہوا تھا ﴿وانهم لا یتکبرون﴾۔

علاوہ ازیں ان میں سے ایک جماعت (جیسے جناب جعفر کے ساتھی اور حبشہ کے عیسائیوں میں سے کچھ لوگ) ایسے تھے کہ وہ جس وقت قرآن کی آیات کو سنتے تھے تو حق کے حاصل ہو جانے کی خوشی میں ان کی آنکھوں سے شوق کے آنسو جاری ہو جاتے تھے ﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ﴾۔

اور وہ صراحت کے ساتھ علی الاعلان بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پکار اُٹھتے تھے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں حق کے گواہوں اور محمد کے ساتھیوں اور یا و انصار میں سے قرار دے ﴿يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمَنَّا فَاكْتَبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ﴾۔

وہ اس آسمانی کتاب کی ہلادینے والی آیات سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ پکار اُٹھتے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم خدائے یکتا پر اور ان حقائق پر جو اُس کی طرف سے آئے ہیں ایمان نہ لائیں جبکہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں صالحین کے زمرے میں قرار دے ﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ مَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ أَنْ يَدْخُلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ﴾۔

البتہ جیسا ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یہ موازنہ زیادہ قرینغبر اسلام کے ہم عصر یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے کیونکہ یہودی آسمانی کتاب کے حامل ہونے کے باوجود مادیت سے بے اندازہ لگاؤ کی وجہ سے مشرکین کی صف میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ جب کہ مذہبی نقطہ نظر سے اُن دونوں میں کوئی وجہ مشترک نہیں تھی۔ حالانکہ ابتدا میں یہودی اسلام کی بشارت دینے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اُن میں عیسائیوں کی طرح تثلیث اور غلو جیسے انحرافات موجود نہیں تھے۔ لیکن ان کی شدید دنیا پرستی نے انہیں حق سے بالکل بیگانہ کر دیا جبکہ اُس زمانے کے عیسائی ایسے نہیں تھے۔

لیکن گزشتہ اور موجودہ زمانے کی تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ بعد کے زمانوں کے عیسائی، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جو یہودیوں کے جرائم سے کسی طرح کم تھے۔ گزشتہ زمانے میں طویل اور خونین صلیبی جنگیں اور اِس زمانے کی ایسی بے شمار تحریکیں جو مسیحی سامراجی ممالک کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں ہیں کسی پر ڈھکی چھپی نہیں۔ لہذا اوپر والی آیات کو تمام عیسائیوں کے بارے میں ایک قانون کلی کے طور پر نہیں جاننا چاہیے۔ وَاِذَا سَمِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَى الرَّسُولِ۔ اور اس کے بعد کے جملے اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ آیات صرف پیغمبر اکرم کے ہم عصر عیسائیوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں ان ہی دونوں گروہوں کے انجام اور جزا و سزا کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے صاحبِ ایمان افراد کے سامنے محبت کا اظہار کیا اور آیات الہی کے مقابلہ میں سر تسلیم خم کیا اور صراحت کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کیا خداوند تعالیٰ اس کے بدلے میں بطور جزا و ثواب انہیں جنت کے ایسے باغات

عطا فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور نیکو کار لوگوں کی یہی جزا ہے ﴿فَاثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرٰی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا و ذٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِ﴾۔^(۳)

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے دشمنی کا راستہ اختیار کیا اور کافر ہو گئے ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا و كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَحِيْمِ﴾۔

۱۔ ساتواں پارہ، آیت ۸۳ سے شروع ہوتا ہے لیکن ۸۳ آیت کو مضمون کی مناسبت سے یہاں درج کیا گیا ہے (مترجم)

۲۔ کشیش اصل میں سریانی زبان کا لفظ کہ جس کا معنی عیسائیوں کا مذہبی پیشوا اور رہنما ہے جس کو عربی میں قیس کہا جاتا ہے اس کی جمع قیسین ہے۔

۲۔ ”فما بهم“ ثواب کے مادے سے لیا گیا ہے کہ جو اصل میں ”لوٹ آنے“ ”نیکی کرنے“ اور کسی کو نفع پہنچانے کے معنی میں ہے۔

آیات ۸۷، ۸۸، ۸۹

۸۷ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرِمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾۔

۸۸ ﴿وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ﴾۔

۸۹ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾۔

ترجمہ:

۸۷۔ اے ایمان والو! اُن پاکیزہ چیزوں کو جو خدا نے تم پر حلال کر دی ہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خداوند سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۸۸۔ اور خداوند تعالیٰ نے حلال اور پاکیزہ نعمات میں سے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے انہیں کھاؤ اور اس خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

۸۹۔ خداوند تعالیٰ تمہیں بے ہودہ (اور بے ارادہ) قسموں کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن وہ قسمیں کہ جنہیں (ارادہ کے ساتھ) تم نے محکم کیا ہو ان کے بارے میں مواخذہ کرے گا۔ اس قسم کی قسموں کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھانا ہے (اور وہ کھانا ایسا ہونا چاہیے) جو تم عام پر اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے ان میں سے کچھ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ جب تم قسمیں کھاتے ہو (اور پھر ان کی مخالفت کرتے ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اور انہیں نہ توڑو۔ خداوند تعالیٰ اسی صرح سے اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔

حد سے تجاوز نہ کرو

درج بالا آیات کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک دن پیغمبر نے روز قیامت خداوند تعالیٰ کی عظیم عدالت میں لوگوں کی حالت و کیفیت سے متعلق کچھ بیان فرمایا۔ ان بیانات نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا اور کچھ لوگ رونے لگے اُس کے بعد اصحاب پیغمبر میں سے ایک گروہ نے پختہ ارادہ کر لیا وہ کچھ لڑائو اور راحتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے ان کی جگہ عبادت میں مشغول رہیں۔ امیر المومنین حضرت علی نے قسم کھائی کہ رات کو

بہت کم سویا کریں گے اور عبادت میں مشغول رہیں گے۔ بدال نے قسم کھائی کہ ہمیشہ روزہ رکھیں گے۔ عثمان بن مظعون نے قسم کھائی کہ اپنی بیوی سے مباشرت ترک کر کے عبادت کرتے رہیں گے۔ ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی عائشہ کے پاس آئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی اور بڑی ہی حسین و جمیل تھی۔ عائشہ کو اس کی حالت پر تعجب ہوا اور کہنے لگی کہ تم اپنا بناؤ سنگھار کیوں نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ بناؤ سنگھار کس کے لیے کروں میرے شوہر نے تو ایک عرصہ ہوا مجھے چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر رکھی ہے۔ یہ باتیں پیغمبر کے گوش گزار ہوئیں تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور پروردگار کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

تم میں سے بعض لوگوں نے پاکیزہ چیزوں کو کیوں اپنے اوپر حرام کر لیا ہے میں اپنی سنت تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں، جو اُس سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں رات کے ایک حصہ میں سوتا ہوں اور اپنی بیویوں سے مباشرت کرتا ہوں اور ہر روز روزہ بھی نہیں رکھتا۔

آگاہ ہو میں ہرگز تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ عیسائیوں کے پادریوں اور راہبوں کی طرح دنیا ترک کر دو کیونکہ اس قسم کے مسائل اور اس طرح کی رہبانیت میرے دین میں نہیں ہے۔ میری اُمت کی رہبانیت جہاد میں ہے (اگر تم دنیا کو ترک کرنا چاہتے ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ جہاد جیسے تعمیری راستے پر چلتے ہوئے ہو) تم اپنے آپ کو سختی میں نہ ڈالو کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن میں سے ایک گروہ اپنے آپ کو سختی میں ڈالنے کے نتیجے میں ہی ہلاک ہوا تھا۔ جن لوگوں نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دیں گے وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: اے رسولِ خدا! اس سلسلے میں ہم نے قسم کھائی تھی اب اس قسم کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری کیا ہے تو مندرجہ آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعہ انہیں جواب دیا گیا۔^(۱)

اس مقام پر یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ مذکورہ قسموں میں سے بعض مثلاً وہ قسم جو عثمان بن مظعون سے نقل کی گئی ہے چونکہ وہ ان کی بیوی کے حقوق کے منافی تھی لہذا وہ قسم شرعاً جائز نہیں تھی۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام کی قسم جو کہ رات کو بیدار رہنے اور عبادت میں مشغول رہنے کے سلسلے میں ہے ایک امر مباح اور جائز تھی اگرچہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیٰ اور بہتر یہی تھا کہ مسلسل ایسا نہ ہو لیکن یہ امر حضرت علی علیہ السلام کے مقام عصمت کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کی نظیر پیغمبر کے بارے میں بھی سورہ تحریم کی پہلی آیت میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تَحْرِمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ﴾

اے پیغمبر! وہ امور جو تیرے لیے اللہ نے حلال قرار دیے ہیں اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو (یا اپنے آپ کو ان سے کیوں محروم کرتے ہو)۔

قسم اور اس کا کفارہ

اس آیت میں اور اس سے بعد کی آیات میں اہم اسلامی احکام کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے۔ اُن میں سے بعض تو ایسے ہیں جو پہلی مرتبہ بیان ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ اہم حصہ ان احکام کی توضیح و تاکید کے طور پر بھی بیان ہوا ہے جو قرآن کی دیگر آیات میں پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ پیغمبر کی عمر کے آخر میں نازل ہوئی ہے لہذا ضروری تھا کہ اس میں مختلف اسلامی احکام کے بارے میں زیادہ تاکید کی جائے۔ پہلی آیت میں بعض مسلمانوں کی طرف سے کچھ نعمات الہی کی تحریم کی طرف اشارہ ہوا ہے اور انہیں اس کام کی تکرار سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

”اے ایمان لانے والو! طہیات اور ایسے پاکیزہ امور جنہیں خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اپنے اوپر حرام نہ کرو۔“ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرُمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۲)

اس حکم کا تذکرہ شان فزول کے مفہوم کے علاوہ ممکن ہے اس بارے میں بھی ہو کہ اگر گزشتہ آیات میں کچھ عیسائی علماء اور رہبانوں کی مدح و ستائش کی گئی ہے تو وہ ان کے حق کی طرف مائل ہونے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے تھی نہ کہ اُن کے ترکِ دنیا کے عمل اور تحریم طہیات کی خاطر تھی اور اس مسلمان اس بارے میں اُن کی پیروی کر سکتے۔ یہ حکم بیان کر کے اسلام نے صراحت کے ساتھ رہبانیت اور ترکِ دنیا سے جیسے عیسائی پادری اور راہب کرتے ہیں اپنی بیگانگی کا اعلان کیا ہے۔ اس امر کے بارے میں مزید تشریح سورہ حدید کی آیت ۲۷ ”وَرَهْبَانِيَّةُ ابْتَدَعُوهَا“ کے ذیل میں آئے گی اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لیے کہتا ہے: سرحدوں اور حد بندیوں سے آگے نہ بڑھو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ﴿وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يَحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾۔

بعد والی آیت میں نئے سرے سے اس مطلب کی تاکید کرتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں تحریم سے نہی کی گئی تھی اور اس آیت میں نعمات الہی سے جائز طور پر بہرہ ور ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ نے تمہیں بطور روزی دی ہیں حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ ﴿وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا﴾۔

ان مواہب و نعمات سے بہرہ ور اور مستفید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اعتدال، تقویٰ اور پرہیزگاری کو فراموش نہ کرو اسی لیے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ﴾۔

یعنی خدا پر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے تمام احکام کا احترام کرو ان سے نفع بھی اٹھاؤ اور اعتدال و تقویٰ کو بھی ملحوظ نظر رکھو۔

اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ حکم تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ مباحات و طہیات کو حرام قرار دینا تقویٰ کے عالی اور کامل درجے سے مناسبت نہیں رکھتا۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی طرف بھی حدِ اعتدال سے نہ نکلے۔

قسموں کی دو قسمیں

قرآن بعد والی آیت میں اُن قسموں کے بارے میں کہ جو حلال کی تحریم یا اور چیزوں کے متعلق کھائی جائیں بطور کلی بحث کرتے ہوئے قسموں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، پہلا کہتا ہے: خداوند تعالیٰ تمہیں لغو اور فضول قسموں کے بارے میں نہ کوئی مواخذہ کرے گا اور نہ ہی سزا دے گا ﴿لَا يُوَٰخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ﴾۔

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ کی تفسیر میں بھی لغو قسموں کے مقابلے میں سزا نہ ہونے کے بارے میں بحث ہوئی تھی تو وہاں ہم نے کہا تھا کہ لغو قسم سے مراد جیسا کہ مفسرین اور فقہانے کہا ہے، وہ قسمیں ہیں کہ جن کا ہدف و مقصد مشخص و معین نہ ہو اور جو قصد اور ارادہ مصمم سے سرزد نہ ہوئی ہوں۔ بلکہ بغیر توجہ کیے والہ۔ بالہ۔ یا لا والہ یا بلی والہ کہہ دیا ہو یا شدت ہیجان و غضب کے وقت بغیر قصد و ارادہ کے قسم کھائی جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر انسان کسی چیز کا یقین رکھتا ہو اور وہ اس کی بنیاد پر قسم کھائے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ اُسے اشتباہ ہوا ہے تو ایسی قسم بھی لغو قسموں میں ہی شمار ہوگی۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص چغل خور، افراد کی چغلی کی وجہ سے اپنی بیوی کی کجروی کا یقین کر لے اور وہ اس کو طلاق دینے کی قسم کھالے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ بات جھوٹی تھی تو اس قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حتمی قسموں میں قصد و آمادہ و تصمیم کے لازم ہونے کے علاوہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ قسم کا مضمون کوئی غیر مشروع اور مکروہ فعل بھی نہ ہو۔ لہذا اگر انسان حالت اختیار میں قصد و ارادہ سے قسم کھائے کہ کسی فعل حرام یا مکروہ کو انجام دے گا، ایسی قسم کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔

احتمال یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں لفظ لغو کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ اس طرح کی قسم بھی اس میں شامل ہے۔

دوسری قسم کی قسمیں وہ ہیں جو قصد و ارادہ اور عزم مصمم سے کھائی جائیں۔ اس قسم کی قسموں کے بارے میں قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے: ”خدا تمہارا ایسی قسموں کے بارے میں کہ جنگی گرہ کو تم نے محکم کر رہا ہے مواخذہ کرے گا اور تمہیں اس پر عمل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ٹھہرائے گا۔“ ﴿وَلَكِنْ يَوَازِدْكُمْ بَمَا عَقَدْتُمْ الْإِيمَانَ﴾

لفظ ”عقد“ جیسا کہ ہم سورہ ماندہ کی ابتدا میں کہہ چکے ہیں، اصل میں ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے رسی کے دونوں سروں میں گرہ لگانے کو ”عقد“ کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ لفظ معنوی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو بھی ”عقد“ کہتے ہیں۔

زیر نظر آیت میں ”عقد ایمان“ یعنی قسمیں باندھنے سے مراد کسی کام کا عزم مصمم ہے جو قسم کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ البتہ قسم کا حتمی ہونا اس کی درستی کے لیے اکیلا کافی نہیں ہے بلکہ جس طرح اوپر اشارہ ہوا ہے کہ قسم کا مضمون کم از کم کوئی امر مباح ہونا چاہیے اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ خدا کے نام کے بغیر قسم معتبر نہیں ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص خدا کے نام کی قسم کھاتا ہے کہ وہ کوئی نیک عمل یا کم از کم کوئی مباح کام انجام دے گا تو واجب ہے کہ وہ اپنی قسم پر عمل کرے اور اگر اس نے قسم توڑ لی تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا۔ قسم کا کفارہ وہی ہے جو محل بحث آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ اس قسم کی قسم کا کفارہ تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے:

پہلی چیز ہے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ﴿فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ﴾۔

البتہ اس بنا پر کہ کہیں اس حکم سے بعض لوگ یہ استفادہ نہ کریں کہ پست و بے قیمت غذا کفارے کے طور پر کھانے لگیں، تصریح کی گئی ہے کہ یہ کھانا کم از کم ایک متوسط غذا ہونا چاہیے جو عام طور پر اپنے گھر میں کھاتے ہیں ﴿مِنْ أَوْسَطِ مَا تَطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ﴾۔

البتہ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک روایت میں امام صادق سے حد وسط کیفیت کے لحاظ سے اور ایک روایت میں امام باقر سے حد وسط کمیت کے لحاظ سے نقل ہوا ہے کہ جن کا خلاصہ دونوں لحاظ سے شہروں، آبادیوں اور زمانوں کے اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف ہوگا۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ واسط اچھے اور عالی کے معنی میں ہے کیونکہ ”اوسط“ کا ایک معنی ”عالی“ بھی ہے جیسا کہ پورہ قلم کی آیت ۲۸ میں ہے: ﴿قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُونَ﴾
 ”ان میں سے بہترین شخص نے یہ کہا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔“

دوسری چیز ہے دس محتاج لوگوں کو لباس پہنانا ﴿او کسوتم﴾

البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا لباس ہونا چاہیے کہ جو عام طور پر ان کو ڈھانپ لے اسی لیے بعض روایات میں ہے کہ امام صادق نے فرمایا کہ اس آیت میں (کسوہ) سے مراد دو قطعہ لباس (یعنی قمیص و شلوار) ہیں اور اگر ہم بعض روایت میں جیسے وہ روایت جو امام باقر سے نقل ہوئی ہے یہ پڑھتے ہیں کہ ایک کپڑے پر بھی قناعت کی جاسکتی ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عربی قسم کے بڑے قمیص اکیلے ہی سارے بدن کو ڈھانپ سکتے ہیں۔ البتہ عورتوں کے لیے ایک قمیص چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کافی نہیں ہے بلکہ سر اور گردن کو ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کو کم از کم جتنے لباس کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس سے کم نہیں ہے۔ تو اس احتمال کے ہوتے ہوئے بعید نہیں ہے کہ وہ لباس کہ جو کفارہ کے طور پر دیا جاتا ہے اس میں فصول^(۴)، مکان اور زبان کے لحاظ سے تفاوت ہو جائے۔

اس سلسلے میں کہ کیا کیفیت کے لحاظ سے کم از کم کافی ہے یا یہاں بھی حد وسط کو ملحوظ رکھا جائے۔ مفسرین میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آیت کے اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کا لباس کافی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس شرط کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کھانا کھلانے میں تھی یہاں بھی حد وسط کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ البتہ پہلا احتمال آیت کے اطلاق کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

تیسری چیز ہے ایک غلام کو آزاد کرنا (او تحریر رقبۃ)۔

اس سلسلے میں کہ جو غلام آزاد ہوگا کیا اُسے مسلمان اور مومن ہونا چاہیے یا کسی بھی غلام کو آزاد کرنا کافی ہے، فقہاء کے درمیان اختلاف ہے اور اس کی وضاحت کتب فقہ میں پڑھنا چاہیے۔

اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے اسلام مختلف ذرائع سے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے استفادہ کرتا ہے اور ہمارے جیسے زمانے میں جبکہ غلام نہیں ہیں دیگر کفاروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ تینوں چیزیں قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور شاید یہ تفاوت اس بنا پر ہو کہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق ان میں سے ایک کو منتخب کر سکے۔

لیکن چونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو ان میں سے کسی پر بھی قدرت نہ رکھتے ہوں لہذا اس حکم کے بعد فرماتا ہے: اور وہ لوگ جو ان میں سے میں سے تک دسترس نہیں رکھتے انہیں تین دن کے روزے رکھنا چاہئیں ﴿فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ﴾

اس بنا پر تین دن روزے رکھنا صرف ان لوگوں سے مربوط ہے جو ان اوپر والے تین امور میں سے کسی کی بھی انجام وہی کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر قرآن کہتا ہے: تماری قسموں کا کفارہ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے ﴿ذَلِكَ كَفَّارَةٌ لِّإِيمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ﴾۔

لیکن اس بنا پر کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ کفارہ دینے سے صحیح قسم کو توڑنا حرام نہیں ہے کہتا ہے: اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو (و احفظوا ایمانکم) دوسرے لفظوں میں قسم پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے اور اس کا توڑنا حرام ہے لیکن اگر توڑا ہے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا، قرآن آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور ان احکام کے بارے میں کہ جو فرد و اجتماع کی سعادت و سلامتی کے ضامن ہیں اس کی حمد و سپاس کرو ﴿كَذَلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾۔

۱۔ مذکورہ بالا شان نزول کا کچھ حصہ تفسیر علی بن ابراہیم سے اور کچھ حصہ مجمع البیان اور دوسری تفاسیر سے لیا گیا ہے۔ اس روایت میں جناب امیر کا ذکر درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آپ ان ذوات مقدسہ میں سے ہیں کہ جن سے ترک اولیٰ کا صدور بھی نہیں ہوتا۔ (مترجم)

۲۔ حلال و ”طیب“ کے معنی کے بارے میں پہلی جلد میں بحث ہو چکی ہے۔

۳۔ نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۶۶ اور تفسیر بہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

۴۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی امام باقر یا امام صادق سے نقل ہوئی ہے۔ تفسیر بہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

آیات ۹۰، ۹۱، ۹۲

۹۰ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾۔

۹۱ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقَعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾

۹۲ ﴿وَاطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾

ترجمہ:

۹۰۔ اے ایمان لانے والو شراب، قمار بازی، بت اور ازلام (جو ایک قسم لاٹری تھی) پلید اور عمل شیطان ہیں، ان سے سے اجتناب کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

۹۱۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی ڈال دے اور تمہیں ذکر خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم (ان تمام نقصانات اور اس تاکید کی بھی) اس سے رکوے گے؟

۹۲۔ اور خدا و پیغمبر کی اطاعت کرو اور (اس کے فرمان کی مخالفت سے) ڈرو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو (سزا کے مستحق ہو گے اور) جان لو کہ پیغمبر کے ذمہ واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اور اس نے یہ فریضہ تمہارے سامنے انجام دے دیا ہے)۔

شان نزول

پہلی آیت کے بارے میں شیعہ و سنی تفاسیر میں مختلف شان نزول ذکر ہوئی ہیں، جو تقریباً ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ منجملہ اُن کے تفسیر در منشور میں سعد بن ابی وقاص سے اس طرح منقول ہے: وہ کہتا ہے یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ انصار میں سے ایک شخص نے کھانا تیار کیا ہوا تھا اور اُس نے ہمیں دعوت دی اور چند افراد نے اس کی مجلس مہمانی میں شرکت کی اور کھانا کھانے کے علاوہ انہوں نے شراب بھی پی اور یہ اسلام میں شراب کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اور جب اُن کے دماغ شراب سے گرم ہوئے تو انہوں نے اپنے افتخارات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن میں سے ایک نے اونٹ کی ہڈی اٹھا کہ میری ناک پر مار دی اور اُسے چیر دیا۔ میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا عرض کیا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسند احمد، سنن ابی داؤد، نسائی اور ترمذی سے اس طرح منقول ہے: حضرت عمر (جو تفسیر فی ضلال جلد سوم ص ۳۳ کے مطابق شراب بڑے رسیا تھے) دعا کرتے تھے خدایا! کوئی واضح بیان شراب کے بارے میں ہم پر نازل فرما۔ جب سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ ﴿وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ نازل ہوئی تو پیغمبر نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی لیکن وہ پھر بھی یہی دعا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ خدایا اس بارے میں کوئی واضح قریبان ہم پر نازل فرما یہاں تک کہ سورہ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی جو یہ ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ أَنْتُمْ سُكَارَىٰ“

پیغمبر نے وہ بھی ان کے سامنے پڑھی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی اسی دعا کو جاری رکھا یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی (آیہ زیر بحث) کہ جس میں اس موضوع پر ایک غیر معمولی صراحت موجود تھی نازل ہوئی۔ جب پیغمبر اکرم نے یہ آیت حضرت عمر کے سامنے پڑھی تو انہوں نے کہا: ”انتھینا انتھینا“

”ہم اب شراب پینے سے رک گئے۔ اب ہم شراب خواری سے رک گئے“ (۱)

شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی جلد سوم میں سورہ نساء کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب خواری اور مے نوشی کا بہت زیادہ رواج تھا اور یہ ایک عمومی وبا کی صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عشق کا خلاصہ تین چیزیں تھیں شعر و شراب اور جنگ! روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے حرام ہونے کے بعد تک بھی بعض مسلمانوں کے لیے اس کی ممانعت کا مسئلہ حد سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ”ما حَرَّمَ عَلَيْنَا شَيْءٌ أَشَدَّ مِنَ الْخَمْرِ“۔

”شراب کے حرام ہونے سے زیادہ اور کوئی حکم ہم پر سخت تر نہیں تھا“۔ (۲)

یہ بات واضح ہے کہ اگر اسلام چاہتا کہ اس عظیم عمومی وبا کے خلاف نفسیات اور معاشرے کے اجتماعی اصول کو مد نظر رکھے بغیر برسرِ بیکار ہو جائے تو کامیابی ممکن نہ تھی لہذا اس نے مے نوشی کی بیخ کنی کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا۔ پہلے ان کے اذہان و افکار کو آمادہ کیا گیا پھر حرمت کا حکم نافذ کیا گیا۔ کیونکہ مے نوشی کی عادت ان کی ایک فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی پہلے مکی سورتوں میں بعض آیات میں اس کام کی برائی کی طرف کچھ اشارے کئے گئے۔ جیسا کہ سورہ نخل کی آیت ۶۷ میں ہے: ”وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَ الْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَ رِزْقًا حَسَنًا“

”تم انگور اور کھجور کے رِخت کے پھلوں سے مسکرات (نشہ آور چیزیں) اور پاکیزہ روزی فراہم کرتے ہو“۔

اس مقام پر لفظ ”مسکر“ یعنی مسکر اور اس شراب کو جو وہ انگور اور خرما سے حاصل کرتے تھے رزقِ حسن کے مد مقابل بیان کیا گیا ہے اور اُسے ایک ناپاک اور آلودہ مشروب شمار کیا گیا ہے۔

لیکن شراب خواری کی بُری عادت نے اس سے کہیں زیادہ جڑیں پکڑی ہوئی تھیں کہ اُس کی ان اشاروں سے بیخ کنی ہو جائے۔ اس کے علاوہ شراب اُن کی اقتصادی درآمدات کے ایک حصّہ کی ضامن بھی تھی لہذا جب مسلمان مدینے میں منتقل ہو گئے اور پہلی اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی تو شراب خواری کی ممانعت کے بارے میں دوسرا حکم قاطع قرصورت میں نازل ہوا تاکہ افکار کو (شراب کی) حرمت کے انتہائی حکم کے لیے اور زیادہ آمادہ کیا جاسکے۔ یہ موقع تھا جبکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾“

اس آیت میں بعض معاشروں مثلاً دورِ جاہلیت کے لیے شراب کے اقتصادی منافع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے خطرات اور عظیم نقصانات کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو کہ اُس کے اقتصادی منافع سے کئی درجہ بڑھ کر ہیں۔

اس کے بعد سورہ نساء کی آیت ۴۳ ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾“

اس مسلمانوں کو صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مستی کی حالت میں ہرگز نماز نہ پڑھیں جب تک کہ یہ نہ جانیں کہ وہ اپنے خدا سے کیا باتیں کرتے ہیں۔

البتہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ نماز کی حالت کے علاوہ شراب پینا جائز ہے بلکہ مقصد وہی تدریجی طور پر اس کی حرمت کا حکم نافذ کرنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت نماز کی حالت کے علاوہ دوسری حالتوں کے سلسلے میں خاموش ہے اور صراحت سے کچھ نہیں کہتی۔

مسلمانوں کی احکام اسلام سے شناسائی اور اس عظیم معاشرتی روگ کو جو اُن کے وجود کی گہرائیوں میں اُتر چکا تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اُن کی فکری آمادگی اس بات کا سبب بنی کہ آخری حکم مکمل صراحت اور قاطعیت سے نازل ہوا کہ جس کے بعد بہانہ سازی کرنے والے بھی اعتراض نہ کر سکیں اور وہ یہی زیر بحث آیت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مختلف تعبیرات کے ذریعہ اس کام کی ممنوعیت پر تاکید کی گئی ہے:

۱۔ آیت ”﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾“ کے خطاب سے شروع ہوئی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حکم کی مخالفت روح ایمان کے منافی ہے۔

اس کے بعد لفظ ”اِنَّمَا“ جو استعمال ہوا ہے حرو تاکید کے لئے ہے۔

۳۔ شراب اور قمار بازی کو انصاب^(۲) (وہ بت کہ جن کی کوئی مخصوص شکل و صورت نہیں تھی صرف پتھر کے ٹکڑے سے بنے ہوئے تھے) کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ شراب اور قمار بازی کا خطرہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بت پرستی کے ہم پلہ قرار پایا ہے، اسی بنا پر پیغمبر اکرم سے ایک روایت میں ہے:

”شراب الخمر کعابد الوثن“ ”شراب خوار بت پرست کی مانند ہے“^(۴)

۴۔ شراب، قمار بازی اور اسی طرح بت پرستی اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری ہے)^(۵) یہ سب ر جس و پلیدی کے طور پر شمار کیے گئے ہیں ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْانْصَابُ وَالْازْلَامُ رِجْسٌ﴾

۵۔ یہ سب شیطانی اعمال میں سے قرار دیئے گئے ہیں ﴿مَنْ عَمِلَ الشَّيْطَانَ﴾

۶۔ آخر کار ان سے اجتناب کرنے کے بارے میں قطعی حکم صادر کرنے کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿فَاجْتَنِبُوهُ﴾

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ اجتناب، نہی کی نسبت زیادہ رسا مفہوم رکھتا ہے کیونکہ اجتناب کا معنی فاصلہ پر رہنا، دوری اختیار کرنا اور نزدیک نہ جانا ہے جو کہ ”نہ پیو“ سے کہیں بہتر اور رسا تر ہے۔

۷۔ اس آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے کہ یہ حکم اس بنا پر دیا گیا ہے تاکہ تم کامیابی اور فلاح حاصل کر لو ﴿لَعَلَّكُمْ تُلْحِقُونَ﴾ یعنی اس کے بغیر کامیابی اور نجات ممکن نہیں ہے۔

۸۔ بعد والی آیت میں شراب اور قمار بازی کے بعض واضح نقصان ذکر کیے گئے ہیں، پہلے کہتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت و دشمنی کی تخم ریزی کرے اور تمہیں نماز اور ذکر خدا سے باز رکھے ﴿اِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُوقَعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ﴾۔

۹۔ اس آیت کے آخر میں استفہام تقریری کے طور پر کہتا ہے: ”کیا تم اس سے بچو گے اور رک جاؤ گے“ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ

مُتَنَبِّهُونَ﴾۔

یعنی کیا ان تمام تاکیدوں کے باوجود ان دو عظیم گناہوں کو ترک کرنے کے بارے میں کوئی بہانہ جوئی یا شک و تردید کی گنجائش رہ گئی ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر تک بھی گذشتہ آیات کی تصریحات کو اس لگاؤ کی وجہ سے جو (سنی مفسرین کی تصریح کے مطابق) انھیں شراب سے کافی نہیں سمجھتے تھے لیکن اس آیت کے نزول کے بعد کہنے لگے کہ یہ حکم کافی دوانی اور قناعت کنندہ ہے۔

۱۰۔ تیسری میں اس حکم کی تاکید کے طور پر پہلے تو مسلمان کو حکم دیتا ہے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کریں اور اس کی مخالفت سے پرہیز کریں۔ ”﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا﴾“

اس کے بعد مخالفین کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر انھوں نے پروردگار کے فرمان کی اطاعت سے روگردانی کی کیفر کردار اور سزا کے مستحق ہوں گے اور پیغمبر کی ذمہ داری اور فریضہ سوائے واضح ابلاغ اور تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے ﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾۔

۱۔ تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۵۰۔

۲۔ المنار جلد ۷ صفحہ ۵۱۔

۳۔ انصاب، نصیب کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد چہارم میں بحث کر چکے ہیں۔

۴۔ حاشیہ تفسیر طبری، ج ۷، ص ۳۱۔ یہی حدیث تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۶۶۹ میں امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔

۵۔ ”ازلام“ کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم میں بحث کر چکے ہیں (دیکھئے صفحہ ۲۰۵ اردو ترجمہ)۔

شراب اور قمار باطنی کے مہلک اثرات

تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ کے ذیل میں ان دو اجتماعی اور معاشرتی باؤں کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے لیکن یہاں پر تاکید مطلب کے لیے قرآن مجید کی اقتدا کے طور پر ضروری ہے کہ کچھ اور نکات کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ نکات اُن مختلف اعداد و شمار کا مجموعہ ہیں جن میں علیحدہ علیحدہ اُن نقصانات کی گہرائی اور وسعت ظاہر ہوتی ہے جن کا تعلق ان دونوں سے ہے۔

۱۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو انگلستان میں الکحل کے جنون کے بارے میں شائع ہوئے ہیں کہ جن میں دیوانگی کا دوسری چیزوں سے ہونے سے والی دیوانگی اور جنون سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۴۹ الکحل کے دیوانوں کے مقابلہ میں صرف ۵۳ دیوانے دوسرے اسباب کی وجہ سے ہوئے تھے^(۱)

۲۔ دوسرے اعداد و شمار میں جو امریکہ کے اسپتالوں سے ہاتھ لگے ہیں ان کے نفسیاتی مریضوں میں سے ۸۵ فیصد الکحل سے مریض تھے^(۲)

۳۔ ایک انگریزی دانشور جس کا نام ”بنام“ ہے لکھتا ہے: مشروبات الکحل شمالی ممالک میں انسان کو احمق و بے وقوف بناتے ہیں اور جنوبی ممالک میں دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ پھر مزید کہتا ہے: دین اسلام نے تمام قسم کے مشروبات الکحل کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے^(۳)

۴۔ جن لوگوں نے مستی اور نشہ کی حالت میں کوئی قتل یا کسی اور جرم کا ارتکاب کیا ہے اور گھروں کے گھر ویران کر دیئے اور خاندان تباہ کر دیئے ہیں اگر ان کے اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو وہ ہوش ربا حد تک بہت زیادہ ہوں گے^(۴)

۵۔ فرانس میں ہر روز ۴۴۰ افراد اپنی جان الکحل کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں^(۵)

۶۔ ایک اور اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ایک سال میں نفسیاتی بیماریوں سے تلف ہونے والی جانیں دوسری عالمی جنگ امریکیوں کی تلف ہونے والی جانوں سے دو گنی تھیں اور محققین کے نظریہ کے مطابق امریکہ میں نفسیاتی بیماریوں میں مشروبات الکحل اور سگریٹ نوشی کا بنیادی حصہ ہے^(۶)

۷۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو ایک دانشور ”ہوگر“ کے ذریعے مجلہ علوم کی بیسویں سالگرہ کی مناسبت سے شائع ہوئے تھے ۶۰ فیصد قتل عمر، ۵ فیصد ماریٹ اور زخمی کرنے کے جرائم، ۳۰ فیصد اخلاقی جرائم (جن میں محارم سے زنا کے

جرائم بھی شامل ہیں) اور ۲۰ فیصد چوری چکاری کے جرائم شراب اور مشروبات الکحل کے ساتھ مربوط تھے۔ اسی دانشور کے اعداد و شمار کے مطابق ۴۰ فیصد مجرم بچے الکحل کے ساتھ اثر کے حامل ہیں^(۷)

۸۔ اقتصادی نقطہ نظر سے صرف انگلستان میں وہ نقصانات جو کاریگروں کے کارخانوں سے مے نوشی کی وجہ سے غیر حاضر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں سال میں ۵۰ ملین ڈالر (تقریباً اسی کروڑ روپے موجودہ حساب سے) ہیں۔ یہ وہ رقم جو ہزاروں نرسری، پرائمری اور ہائی اسلوکوں کے اخراجات پورے کر سکتی ہے^(۸)

۹۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو مے نوشی کے نقصانات کے سلسلے میں فرانس میں شائع ہوئے ہیں ۱۳۷ ارب فرانک سالانہ انفرادی نقصانات کے علاوہ حکومت فرانس کے مخارج میں الکحل سے درجہ ذیل تفصیل کے مطابق نقصان ہوتا ہیں:

۶۰ ارب فرانک عدالت اور قید خانے کے اخراجات۔

۴۰ ارب فرانک تعاون عمومی اور خیرات کے اخراجات۔

۱۰ ارب فرانک شراب خواری کے ہسپتالوں کے اخراجات۔

۷۰ ارب فرانک معاشرے کے امن و امان کو برقرار رکھنے کے اخراجات۔

تو اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی بیماریوں ہسپتالوں، قتلوں، خونی فسادات، چوریوں، زیادتیوں اور حادثوں کی تعداد میخانوں کی تعداد کے ساتھ براہ راست منسلک ہے^(۹)

۱۰۔ امریکہ میں اعداد و شمار کے سب سے بڑے مرکز نے ثابت کر دیا ہے کہ قمار بازی کا ۳۰ فیصد جرائم میں براہ راست

حصہ ہے۔

دوسرے اعداد و شمار کے مطابق جو قمار بازوں کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں، بڑے افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ۹۰ فیصد جیب تراشی، ۵۰ فیصد اخلاقی خرابیاں، ۳۰ فیصد طلاقیں، ۴۰ فیصد مار پٹائی اور زخمی کرنے کے واقعات اور ۵ فیصد خودکشیاں قمار بازی کی وجہ سے ہوتی ہیں^(۱۰)

۱۔ سمپوزیوم الکحل، ص ۶۵۔

۲۔ کتاب سمپوزیوم الکحل، ص ۶۵۔

۳۔ تفسیر طنطاوی، ج ۱، ص ۱۶۵۔

۴۔ دائرة المعارف، فرید وحیدی، ج ۳، ص ۷۹۰.

۵۔ بلاہائے اجتماعی قرن ما، ص ۲۰۵.

۶۔ مجموعہ انتشارات نسل نو.

۷۔ سمپوزیوم الکحل، ص ۶۶.

۸۔ مجموعہ انتشارات نسل جوان، سال دوم، ص ۳۳۰.

۹۔ نشریہ مرکز مطالعہ پیشرفتہائے ایران (الکحل اور قمار بازی کے بارے میں)

۱۰۔ نشریہ مرکز مطالعہ پیشرفتہائے ایران (برائے الکحل و قمار بازی)

آیت ۹۳

۹۳ ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

ترجمہ:

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس چیز سے روکا جائے اُس سے رکیں اور جو فرمان الہی ہ اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں، اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبری، تفسیر قرطبی اور بعض دوسری تفاسیر میں اس طرح آیا ہے کہ شراب و قمار بازی کی حرمت کی آیت کے فزول کے بعد بعض اصحاب پیغمبر نے کہا کہ اگر ان دونوں کاموں کے یہ سب گناہ ہیں تو پھر ہمارے اُن مسلمان بھائیوں کا کیا بنے گا جو اس آیت کے فزول پہلے کرچکے ہیں اور انھوں نے اس وقت تک ان دونوں کاموں کو ترک نہیں کیا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجالائیں

اس آیت میں اُن لوگوں کے بارے میں جواب دیتے ہوئے جو شراب و قمار بازی کی حرمت کے نزول سے پہلے مرچکے تھے اُن لوگوں کے بارے میں کہ جن کے کانوں تک ابھی تک یہ حکم نہیں پہنچا تھا اور وہ دور دراز کے علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے اور عمل صالح انجام دیتے تھے اور یہ حکم اُن تک نہیں پہنچا تھا، اگر انھوں نے شراب پی ہے یا قمار بازی کی کمائی سے کھاتے رہے تو اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾^(۱)

اس کے بعد اس حکم کو اس بات کے ساتھ مشروط کرتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجالائیں ﴿إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾۔

پھر اس امر کی تکرار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لے آؤ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا﴾۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی حکم کی تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور نیکی کرو ﴿ثُمَّ اتَّقُوا وَأَحْسِنُوا﴾

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے ﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾۔

ان تین جملوں کی تکرار کے سلسلے میں قدیم و جدید مفسرین کے درمیان زیادہ اختلاف ہے، بعض انھیں تاکید پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ تقویٰ، ایمان اور عمل صالح کے موضوعات کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں پختگی کے ساتھ بار بار بیان کیا جائے اور تاکید کی جائے۔

لیکن بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ ان تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں علیحدہ اور جناگانہ حقیقت بیان ہوئی ہے، انھوں نے ان کے خلاف کے سلسلے میں کئی احتمال پیش کیے ہیں کہ جن میں بہت سے ایسے ہیں کہ جن کی کوئی دلیل اور شاہد نہیں ہے۔

شاید اس سلسلے میں بہترین بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ ذکر ہونے والے ”تقویٰ“ سے مراد اندرونی تقویٰ اور باطنی احساسِ ذمہ داری ہے جو انسان کو دین کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے، پیغمبر کے معجزے میں غور و فکر کرنے اور حق کے بارے میں جستجو کرنے پر ابھارتی ہے جس کا نتیجہ ایمان اور عمل صالح ہے، دوسرے لفظوں میں جب تک تقویٰ کا ایک مرحلہ وجود انسانی میں پیدا نہیں ہوتا اُس وقت تک اُسے تحقیق کی جستجو کی فکر لاحق نہیں ہوتی، اس بنا پر پہلی مرتبہ اُپر والی آیت میں تقویٰ کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ تقویٰ کے اسی مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ چیز آیت کے ابتدا کے اس حصے کے منافی نہیں ہے: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آیت کی ابتدا میں ایمان ظاہری تسلیم کے معنی میں ہو لیکن جو ایمان تقویٰ کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی ایمان ہے۔

دوسری دفعہ جو تقویٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہ اُس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے اندر اور باطن میں نفوذ کر جائے کہ جس کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ایمان متسقر و ثابت ہے، کہ عمل صالح جس کا ایک حصہ اور جز ہے، اسی لیے دوسرے مرحلے ایمان کے ذکر کے بعد عمل صالح کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تیسری مرتبہ ”تقویٰ“ سے متعلق جو گفتگو ہے اس سے مراد وہ تقویٰ ہے جو اپنے بلند ترین مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اس طور پر کہ اب اُسے حتمی فرائض کی انجام دہی کی دعوت کے علاوہ احسان یعنی نیک کاموں کی دعوت بھی دی گئی ہے، یہاں تک کہ اُن کاموں کے لیے بھی کہ جو داخل نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ کے بارے میں تین مرتبہ کا یہ تذکرہ احساسِ ذمہ داری اور پرہیزگاری کے ایک ایک مرحلہ کی طرف اشارہ ہے، ”ابتدائی مرحلہ“، ”درمیانہ مرحلہ“ اور ”آخری مرحلہ“ اور ان میں سے ہر ایک خود آیت میں ایک قرینہ رکھتا ہے کہ جس کا سہارا لے کر مقصد معلوم کیا جاسکتا ہے، بخلاف ان احتمالات کے جو بعض مفسرین نے ان تین قسم کے تقویٰ اور ایمان کے فرق کے بارے میں پیش کیے ہیں کہ جن کے لیے کوئی قرینہ اور شاہد موجود نہیں ہے۔

۱۔ یہ بات قابل توجہ رہے کہ ”طعام“ زیادہ تر کھانے کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ پینے کی چیزوں کے لیے لیکن بعض اوقات پینے کی چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ میں ہے: **فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي**

آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶

۹۴ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمْ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ فَمَن

اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ -

۹۵ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ وَمَن قَتَلَهُ مِنْكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا

عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَامًا لَّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ وَمَن

عَادَ فَيَنْتَقِمِ اللَّهُ مِنْهُ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ﴾ -

۹۶ ﴿أَحِلَّ لَكُم صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلْسَيَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرْمًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ

تُحْشَرُونَ﴾ -

ترجمہ

۹۴ - اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار کی اس مقدار کے ساتھ کہ (جو تمہارے قریب آجائیں اور) تمہارے ہاتھ اور

نیزے اُن تک پہنچ جاتے ہیں، آزمائے گا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون شخص غیب پر ایمان رکھتے ہوئے خدا سے ڈرتا ہے

اور جو شخص اُس کے بعد تجاوز کرے تو اُس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

۹۵ - اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار کو قتل نہ کرو اور جو شخص تم میں سے جان بوجھ کر اُسے قتل کرے گا تو

اُسے چاہیے کہ اُس کا معادل کفارہ چوپاؤں میں سے دے۔ ایسا کفارہ کہ جس کے معادل ہونے کی دو آدمی تصدیق کریں اور

وہ قربانی کی شکل میں (حریم) کعبہ میں پہنچے یا (قربانی کے بجائے) مساکین و فقرا کو کھانا کھلائے یا اس کے معادل روزے

رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھے جو کچھ گزشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا نے وہ معاف کیا اور جو شخص تکرار کرے خدا

اُس سے انتقام لے گا اور خدا توانا اور صاحب انتقام ہے۔

۹۶ - دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے تاکہ تم اور مسافرین اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن جب تک تم

حالت احرام میں ہو تو صحرا کا شکار تم پر حرام ہے اور خدا (کی نافرمانی) سے کہ جس کی طرف تم محسور ہوں گے ڈرتے رہو

شانِ نزول

جیسا کہ کتاب کافی اور بہت سی تفاسیر میں منقول ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام اور مسلمان حدیبیہ والے سال عمرہ کے لئے احرام باندھ کر چل پڑے تو انھیں راستے میں بہت سے وحشی جانوروں کا اس طرح سے سامنا ہوا کہ اُن کے لئے آسان تھا کہ ہاتھ یا نیزے سے انھیں شکار کر لیں۔ یہ شکار اس قدر زیادہ تھے کہ بعض نے لکھا ہے کہ سوار یوں کے دوش بدوش اور خیموں کے نزدیک آتے جاتے تھے تو اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو شکار کرنے سے ڈرایا اور انھیں اس خطرے سے آگاہ کیا کہ یہ امر ان کے لئے ایک طرح کا امتحان ہے۔

حالت احرام میں شکار کرنے کے احکام

یہ آیات عمرہ اور حج کے احکام میں سے ایک حکم یعنی حالت احرام میں صحرائی اور دریائی جانوروں کے شکار کا مسئلہ بیان کرتی ہیں، پہلے تو اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جس کا ”حدیبیہ“ والے سال مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا تھا ارشاد ہوتا ہے: ”اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار میں سے ایک چیز کے ساتھ آزمائے گا، ایسے شکار جو تمہارے اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ تم نیزہ اور ہاتھ کے ساتھ انھیں شکار کر سکتے ہو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمْ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ﴾“۔

آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ پیش بینی کے طور پر لوگوں کو ایک ایسے واقعہ سے جو انھیں پیش آنے والا تھا آگاہ کرے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شکار کا وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں کی پہنچ میں آجانا ایک ایسا امر تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ مسلمانوں کے لئے ایک قسم کی آزمائش تھی خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے جانوروں کے گوشت سے غذا مہیا کرنے کی انھیں ضرورت بھی تھی۔

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ جانور و سوسہ انگیزی کی صورت میں خیموں کے اطراف میں اور ان کے گرد اگرد آتے جاتے تھے، اس قسم کی میسر غذا سے محروم رہنا، وہ بھی اس زمانے اور وقت میں ایسے لوگوں کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس جملہ سے مراد کہ ”تمہارے ہاتھ سے شکار کے قابل ہوں گے“ یہ ہے کہ وہ انھیں جال وغیرہ سے پکڑ سکتے تھے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حقیقتاً ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ خود ہاتھ سے انھیں پکڑ سکتے تھے۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا ہے: یہ ماجر اس لئے ہوا تھا کہ وہ لوگ جو ایمان بالغیب کی بنا پر خدا سے ڈرتے ہیں

دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جائیں ﴿لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ﴾۔

جیسا کہ ہم جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ ”لنعلّم“ تاکہ ہم جان لیں یا ”لیعلم“ تاکہ خدا جان لے“ وغیرہ جیسی تعبیرات سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا کسی چیز کو جانتا نہیں اس لئے وہ چاہتا ہے کہ آزمائش اور امتحان وغیرہ کے ذریعہ سے جان لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم چاہتے کہ اپنی واقعیت علمی کو عملی جامہ اور مستحق خارجی کا لباس پہنائیں کیونکہ باطنی نیتیں اور لوگوں کی آمادگیاں، تکامل و ارتقاء، اور جزا و سزا کے لئے اکیلی ہی کافی نہیں ہیں بلکہ انھیں خارجی افعال کی شکل میں ظہور پذیر ہونا چاہیے تاکہ وہ ان آثار کے حامل ہو سکیں (مزید وضاحت کے لئے مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیجئے)۔

آیت کے آخر میں اُن اشخاص کو کہ جو اس خدائی حکم کی مخالفت کرتے ہیں درناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے ﴿فَمَنْ اَعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فْلَهُ عَذَابٌ اَلِيمٌ﴾ اگرچہ آیت کا آخری جملہ اجمالی طور پر حالت احرام میں شکار کی حرمت پر دلالت کرتا ہے لیکن بعد والی آیت میں مزید صراحت اور قطعیت کے ساتھ اور بطور عموم حالت احرام میں شکار کے حرام ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ”اے ایمان لانے والو! حالت احرام میں شکار نہ کرو“ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾۔

کیا شکار کی حرمت (جو بعد والی آیت کے قرینہ کے ساتھ صحرائی شکار ہے) صحرا کی تمام اقسام شکار پر محیط ہے چاہے وہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت یا حلال گوشت شکار سے مخصوص ہے۔

مفسرین اور فقہاء کے درمیان اس سلسلے میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے۔

تاہم فقہاء و مفسرین امامیہ میں مشہور یہ ہے کہ حکم عام ہے اور جو روایات اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں بعض فقہائے اہل سنت مثلاً ابو حنیفہ ہمارے ساتھ اس سلسلے میں متفق ہیں مگر دوسرے بعض مثلاً شافعی اسے حلال گوشت جانوروں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں بہر حال یہ حکم گھریلو جانوروں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ گھریلو جانوروں کو صید و شکار نہیں کہا جاتا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہماری روایات میں نہ صرف یہ کہ حالت احرام میں شکار کرنا حرام ہے بلکہ اس میں مدد کرنا، اشارہ کرنا اور شکار کی نشاندہی کرنا بھی حالت احرام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ صید و شکار کا مفہوم حرام گوشت جانوروں پر محیط نہیں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جانوروں کا شکار مختلف مقاصد کے لئے انجام پاتا ہے۔ بعض اوقات مقصود اُن کے گوشت سے فائدہ

اٹھانا ہوتا ہے، بعض اوقات ان کی کھال سے نفع حاصل کرنے لئے ہوتا ہے اور بعض اوقات ان کی مزاحمت کو دور کرنے لئے ہوتا ہے۔ وہ مشہور شعر جو حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے وہ بھی عمومیت کا مشاہدہ بن سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں: صید الملوک ارانب و ثعالب و اذا رکت فصیدی الا بطل

بادشاہوں کے شکار خرگوش اور لومڑیاں ہیں لیکن میرا شکار، جب میں میدان جنگ میں وارد ہوتا ہوں تو شجاع اور بہادر ہوتے ہیں۔

(مزید وضاحت کے لئے فقہی کتب کی طرف رجوع کیا جائے)۔

اس کے بعد حالت احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جو شخص جان بوجھ کر شکار کو قتل کر دے تو اُسے چاہیے کہ چوپاؤں میں سے اُن جیسے جانور کفارہ میں دے یعنی انھیں قربانی کر کے ان کا گوشت فقراء و مساکین کو دے ﴿وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾

یہاں مثل سے مراد کیا ہے؟ کیا شکل و صورت اور مقدار میں ایک جیسا ہونا، اس معنی میں کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بڑے وحشی جانور مثلاً شتر مرغ کو شکار کرتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اس کا کفارہ اونٹ کی صورت میں دے؟ یا اگر ہرن کا شکار کرتا ہے تو کفارہ کے لئے بھیڑ بکری کی قربانی دے جو تقریباً جیسی ہے؟ یا یہ کہ مثل سے مراد قیمت میں ایک جیسا ہونا ہے؟ فقہاء اور مفسرین میں پہلا معنی ہی مشہور ہے اور آیت کا ظاہری مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے، کیونکہ حلال گوشت اور حرام گوشت کے حکم عمومی کو مد نظر رکھتے ہوئے دیکھیں تو بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی قیمت ثابت و مشخص نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ اُن جیسے گھریلو جانوروں کا انتخاب کیا جاسکے اور اس کا مثل شکل و صورت اور مقدار کے مطابق ہی مل سکے ورنہ دوسری صورت میں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کہ کسی طرح سے اس شکار کی قیمت معین کی جائے اور اُس کا مثل قیمت کے لحاظ سے حلال گوشت گھریلو جانوروں میں سے انتخاب کریں، ممکن ہے کہ بعض اوقات مثل کے معاملے میں کوئی شک و تردید ہو جائے لہذا قرآن نے حکم دیا ہے کہ یہ کام دو باخبر اور عادل افراد کے زیر نظر انجام پذیر ہو ﴿يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ﴾۔

اس سلسلے میں کہ یہ قربانی کہاں ذبح ہو، حکم دیتا ہے کہ وہ قربانی اور ”ہدی“ کی صورت میں کعبہ کا ہدیہ بنایا جائے اور سرزمین کعبہ میں پہنچے

﴿هَذِيَّا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ - ضمنی طور توجہ رہے کہ ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور ہے کہ احرام عمرہ کی حالت میں شکار کا کفارہ مکہ میں ذبح ہونا چاہیے اور احرام عمرہ کی حالت میں منیٰ اور قربان گاہ میں اور یہ بات اوپر والی آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت، احرام عمرہ کی حالت میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ضروری نہیں ہے حتماً کفارہ قربانی کی صورت میں ہو بلکہ دو اور چیزوں میں سے بھی ہر ایک اُس کی جانشین ہو سکتی ہے، پہلا یہ کہ اُس کے برابر رقم مساکین کو کھانا کھلانے میں صرف کی جائے ﴿أَوْ كَفَّارَةً طَعَامًا مَسَاكِينَ﴾ یا اُس کے مساوی روزے رکھے ﴿أَوْ عَدْلُ ذَلِكَ صِيَامًا﴾ -

اگرچہ آیت میں اُن مساکین کی تعداد جنہیں کھانا کھلایا ہے بیان نہیں ہوئی اور نہ ہی روزوں کے دنوں کی تعداد بتائی گئی ہے لیکن ایک طرف سے ان دونوں کا ایک دوسرے سے ساتھ ہونا اور دوسری طرف یہ صراحت کہ روزوں کے درمیان موازنہ ضروری ہے، نشاندہی کرتا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جتنے مسکینوں کو وہ کھانا کھلانا چاہے کھلا دے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قربانی کی قیمت کے برابر ہونا چاہیے، باقی رہا یہ کہ روزہ اور مسکین کو کھانا کھلانے کے درمیان تعادل و برابری کس طرح قائم ہو تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ”مد“ طعام کے مقابلہ میں ایک روزہ رکھے - یہ حقیقت میں اس بنا پر ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں جو اشخاص روزہ پر قدرت نہیں رکھتے تو وہ ہر دن کے بدلے میں ایک یا دو مد کھانا مساکین کو کھلائیں (اس امر کے بارے میں مزید وضاحت فقہی کتب میں ملاحظہ فرمائیں) -

اس بارے میں کہ وہ شخص جو حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہوا ہے کیا وہ ان تین چیزوں میں سے جس کو چاہے کمرے یا اُسے ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے - پہلے تو اُسے قربانی کرنا چاہیے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو مساکین کو کھانا کھلائے اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو پھر روزہ رکھے - اس سلسلہ میں مفسرین اور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے لیکن آیت کا ظاہر اختیار کا معنی دیتا ہے - یہ کفارے تو اس بنا پر ہیں کہ وہ اپنے غلط کام کی سزا اور انجام دیکھ لیں ﴿لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهٖ﴾ (۱) -

اور اس بنا پر کہ عموماً کوئی حکم بھی گزشتہ امور کو شامل نہیں ہوتا صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اُن غلط کاریوں کو جو اس سلسلے میں گزشتہ زمانے میں تم نے انجام دی ہیں معاف کر دیتا ہے ﴿عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ﴾ -

اور جو شخص ان بار بار کے اظہار کے خطر اور کفارہ کے حکم کی پروا نہ کرے اور پھر بھی حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہو تو خدا ایسے شخص سے انتقام لے گا اور خدا توانا و صاحب قدرت ہے اور بر محل انتقام لیتا ہے ﴿وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ﴾ -

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا شکار کا کفارہ دوبارہ شکار کرنے سے دوگنا ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تکرار کی صورت میں صرف انتقال الہی کی تہدید اور دھمکی ہی دی گئی ہے اور اگر کفارہ کا تکرار بھی ہوتا تو صرف انتقال الہی کے ذکر پر اکتفا نہ کی جاتی اور تکرار کفارہ کی تصریح بھی ہوتی۔ ان روایات میں جو اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں یہی بات بیان کی گئی ہے۔

بعد والی آیت میں دریائی شکار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: (حالت احرام میں) دریائی شکار اور اسے کھانا تمہارے لئے حلال ہے

﴿أَحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾ -

اس بارے میں کہ طعام اور کھانے سے کیا مراد ہے؟

مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو شکار کیے بغیر مرجاتی ہیں اور پانی کے اوپر رہ جاتی ہیں، جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مردہ مچھلی کا کھانا حرام ہے، اگرچہ اہل سنت کی بعض روایات میں ان کے حلال ہونے کی صراحت موجود ہے۔

آیت کے ظاہری مفہوم سے جو بات زیادہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ طعام سے مراد وہی خوراک ہے کہ جو شکار شدہ مچھلیوں سے تیار کی جاتی ہے کیونکہ آیت دو امور کو جائز قرار دے رہی ہے پہلے شکار کرنا اور دوسرے شکار شدہ کھانا کھانا۔ ضمناً اس تعبیر سے اس معروف فتویٰ کے لئے بھی اجمالی طور پر استفادہ ہوتا ہے جو ہمارے فقہاء کے درمیان موجود ہے اور جو بڑی (وصحرائی) جانوروں کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف انھیں شکار کرنے کا اقدام حرام ہے بلکہ شکار شدہ جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد اس حکم کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ تم اور مسافر اس سے فائدہ اٹھا سکیں ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلْغَيَّارَةِ﴾ -

یعنی اس غرض سے کہ تم حالت احرام میں کھانے کے لئے زحمت و مشقت میں نہ پڑو اور ایک قسم کے شکار سے فائدہ اٹھا سکو یہ اجازت تمہیں دریائی شکار کے بارے میں دی جاتی ہے۔

اور چونکہ عموماً اگر مسافر یہ چاہیں کہ شکار شدہ مچھلی اپنے ساتھ لے جائیں تو اس میں نمک ملا کر اُسے ”ماہی شور“ کی صورت میں تیار کر لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کی اس طرح کی تفسیر کی ہے کہ مقیم افراد تازہ مچھلی سے اور مسافر نمک لگی مچھلی سے استفادہ کریں۔

ہم نے درج بالا آیت میں یہ پڑھا ہے کہ دریائی شکار تمہارے لئے حلال ہے۔ یہاں اشتباہ نہیں ہونا چاہیے، اس کا مفہوم دریائی شکاروں کے بارے میں ایک عمومی حکم نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے خیال کر لیا ہے۔ آیت یہاں پر دریائی شکاروں کا اصل حکم بیان کرنا نہیں چاہتی، بلکہ آیت کا مقصد و ہدف یہ ہے کہ وہ احرام باندھے ہوئے شخص کو اس بات کی اجازت دے کہ دریا کے دو شکار جو احرام سے پہلے حلال تھے احرام کی حالت میں بھی وہ اُس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آیت یہاں اصل تشریع قانون بیان نہیں کر رہی بلکہ اس کی نظر اُن قانونی خصوصیات کی طرف ہے جو پہلے سے تشریع ہو چکا ہے۔ اصطلاح میں یہ بیان حکم عمومی کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ آیت صرف محرم کے احکام بیان کر رہی ہے۔

مگر دوسری مرتبہ تاکید کے طور پر حکم سابق کی طرف لوٹتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب تک تم حالت احرام میں ہو صحرائی اور وحشی جانوروں کا شکار تم پر حرام ہے ﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا﴾۔

آیت کے آخر میں اُن تمام احکام کی تاکید کے لئے جو ذکر ہو چکے ہیں فرماتا ہے: اس خدا سے ڈرو جس کی بارگاہ میں تمہیں قیامت کے دن محشور ہونا ہے ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾۔

۱۔ وبال جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے: اصل میں ”وبل“ اور ”وابل“ سے سخت بارش کے معنی میں ہے۔ اس کے مشکل، شاق اور سخت کام پر بھی بولا جانے لگا اور چونکہ سزا و عذاب میں بھی شدت اور سختی ہوتی ہے اسے وبال کہتے ہیں۔

حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ

ہمیں معلوم ہے کہ حج و عمرہ ان عبادات میں سے ہے جو انسان کو عالم مادہ سے جدا کر کے ایک ایسے ماحول میں جو روحانیت و معنویت سے معمور ہیں مستغرق کر دیتی ہیں۔ مادی زندگی کے مقررات، جنگ و جدال، جھگڑے، فساد، جنسی ہوس رانیاں اور مادی لذات حج و عمرہ کے مراسم میں کلی طور پر چھوڑنا پڑتی ہیں اور انسان ایک قسم کی شرعی الہی ریاضت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ حالت احرام میں حرمت شکار بھی اسی مقصد کے ماتحت ہے۔

علاوہ ازیں اگر خانہ خدا کے زائر کے لئے شکار کرنا ایک مشروع اور جائز کام ہوتا تو اس آمد و رفت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ جو ہر سال اس مقدس سرزمین میں ہوتی ہے، اس علاقہ کے بہت سے جانوروں کی نسل کہ جو خشکی اور پانی کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی کم ہے، ختم ہو جاتی لہذا یہ حکم اس علاقے کے جانوروں کی نسل کی بقا کے لئے ایک قسم کی حفاظت و ضمانت ہے۔

خصوصاً اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ حالت احرام کے علاوہ بھی حرم میں شکار اور اسی طرح اس کے درختوں اور گھاس پھونس کا اکھاڑنا ممنوع ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم زندگی کے ماحول کی حفاظت اور اس علاقے کے سبزہ زاروں اور جانوروں کو فنا و نابودی سے بچانے کے مسئلہ سے نزدیکی ربط رکھتا ہے۔

یہ حکم اس قدر دقیق تشریع ہوا ہے کہ نہ صرف جانوروں کا شکار کرنا بلکہ اس سلسلہ میں مدد کرنا، یہاں تک کہ شکاریوں کو شکار کی نشاندہی کرنا اور انھیں شکار کرنے کی رائے دینا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اہل بیت (علیہ السلام) کے طریق سے وارد شدہ روایات میں ہے کہ امام صادق (علیہ السلام) نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

”لا تستحلن شیئاً من الصيد وأنت حرام ولا وانت حلال فی الحرم ولا تدلن علیہ محلاً ولا محرماً فی صطادہ ولا تشر الیہ فیستحل من اجلک فان فیہ فداء لمن تعمدہ“ ”ہرگز شکاریں سے کسی چیز کو حالت احرام میں حلال شمار نہ کرنا اور اسی طرح حرم کا شکار غیر حالت احرام میں بھی حلال نہیں۔ محرم و غیر محرم کو شکار کی نشاندہی بھی نہ کرنا کہ وہ شکار کر لے، یہاں تک کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہ کرنا (اور اُسے کوئی حکم نہ دینا) کہ وہ تیری وجہ سے شکار کو حلال سمجھے کیونکہ یہ کام اس شخص کا شمار ہوگا جس نے شکار کا حکم دیا ہے یا اشارہ کیا ہے اور کفارہ بھی اس پر واجب ہوگا۔“ (۱)

آیات ۹۷، ۹۸، ۹۹

۹۷ ﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذَلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ -

۹۸ ﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ﴾ -

۹۹ ﴿مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ﴾ -

ترجمہ:

۹۷- خدا نے کعبہ، بیت الحرام کو لوگوں کے کام کے لئے سامان مہیا کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا ہے اور اس طرح حرمت والا مہینہ اور بے نشان قربانیاں اور نشاندار قربانیاں، اس قسم کے (حساب شدہ اور دقیق) احکام اس لئے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو کہ خدا جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، جانتا ہے۔

۹۸- جان لو کہ خدا شدید سزا دینے والا ہے (اور اس کے باوجود) وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

۹۹- پیغمبر کی ذمہ داری ابلاغ رسالت (اور احکام الہی پہنچانے) کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے (اور وہ تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے) اور خدا جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کو آشکار اور کن چیزوں کو مخفی رکھتے ہو۔

خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا

گذشتہ آیات میں حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کے بارے میں بحث تھی۔ اس آیت میں ”مکہ“ کی اہمیت اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترتیب میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا ﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ﴾ -

یہ مقدس گھر لوگوں کے اتحاد کی علامت، دلوں کے مجتمع ہونے کا ایک وسیلہ اور مختلف رشتوں اور گروہوں کے استحکام کے لئے ایک عظیم مرکز ہے۔ اس مقدس گھر اور اس کی مرکزیت و معنویت کے سائے میں کہ جو گہری تاریخی بنیادوں پر استوار ہے، وہ اپنی بہت سی بے سامانیوں کا سامان (اور بہت سی خرابیوں اور کمزوریوں کی اصلاح) کر سکتے ہیں اور اپنی سعادت کا محل اس کی بنیادوں پر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس لئے سورہ آل عمران میں خانہ کعبہ کو وہ پہلا گھر بتایا گیا ہے جو لوگوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے۔^(۱)

حقیقت یہ ہے کہ ”﴿فِيَمًا لِلنَّاسِ﴾“ کے معنی کی وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمان اس گھر کی پناہ میں اور حج کے اسلامی حکم کے سائے میں اپنے تمام معاملات کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

چونکہ ضروری تھا کہ یہ مراسم جنگ، کشمکش اور نزاع سے ہٹ کر امن و امان کے ماحول میں صورت پذیر ہوں، حرام مہینوں (وہ مہینے کہ جن میں جنگ مطلقاً حرام ہے) کے اثر کی طرف اس موضوع میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ﴿وَالشَّهْرُ الْحَرَامُ﴾ - (۲)

علاوہ ازیں اس نظر سے کہ بے نشان قربانیوں (صدی) اور نشاندار قربانیوں (قلائد) کا وجود، کہ جو مراسم حج و عمرہ میں مشغول ہونے کے دونوں میں لوگوں کو غذا مہیا کرتا ہے اور ان کی سوچ کو اس جہت سے آسودہ خاطر کرتا ہے، اس پروگرام کی تکمیل میں مخصوص اثر رکھتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿وَالْهَدْيِ وَالْقَلَائِدِ﴾۔۔

اور چونکہ یہ تمام پروگرام، قوانین اور مقرر شدہ احکام شکار، اور اسی طرح حرم مکہ و ماہ حرام وغیرہ ایک قانون ساز کی وسعت علم اور تدبیر کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں لہذا آیت کے آخر میں اس طرح کہتا ہے کہ: خدا نے یہ منظم پروگرام اس لئے مقرر کیے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس کا علم اس قدر وسیع ہے کہ جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کو جانتا ہے اور تمام چیزوں سے خصوصاً اپنے بندوں کی روحانی اور جسمانی ضروریات سے باخبر ہے ﴿ذَلِكَ لِّتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾۔

ہم جو کچھ سطور بالا میں کہہ آئے ہیں اسے مد نظر رکھتے ہوئے آیت کی ابتدا و انتہا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان گہرے تشریع احکام کو وہی ذات منظم کر سکتی ہے جو قوانین تکوینی کی گہرائی سے آگاہ اور باخبر ہو۔ جب تک کوئی زمین اور آسمان کے تمام جزئیات اور روح و جسم کے تخلیقی رموز سے آگاہ نہ ہو، وہ ایسے احکام کی پیش بینی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہی قانون درست اور اصلاح کنندہ ہو سکتا ہے جو قانون خلقت و فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

پھر بعد والی آیت میں گذشتہ احکام کی تاکید، لوگوں کو ان کے انجام دینے کی تشویق اور مخالفین اور نافرمانوں کی تہدید کے طور پر فرماتا ہے: جان لو کہ خدا شدید العقاب (ہونے کے ساتھ) غفور رحیم بھی ہے ﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ وَأَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾۔

نیز یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں ”شدید العقاب“ کو ”غفور رحیم“ پر مقدم رکھا گیا ہے، تو شاید یہ امن بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدائی سزا کو اس کی پوری شدت کے باوجود توبہ کہ پانی سے دھویا جاسکتا ہے اور خدا کی مغفرت و رحمت شامل حال ہو سکتی ہے۔

پھر مزید تاکید کے لئے فرماتا ہے: اپنے اعمال کے جواب دہ خود تمہی ہو، اور پیغمبر کی ذمہ داری تبلیغ رسالت اور احکام خدا تم تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں ﴿مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾۔

اس کے باوجود خدا تمہاری نیتوں سے اور تمہارے سب آشکار و پنہاں اعمال سے باخبر آگاہ ہے ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ﴾۔

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۹۶۔

۲۔ حرام مہینوں کے بارے میں جلد دوم میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۴ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

کعبہ کی اہمیت

کعبہ جس کا ان آیات اور گزشتہ آیات میں دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اصل میں مادہ ”کعب“ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے ”پاؤں کے اوپر کی ابھری ہوئی جگہ“، بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کی بلندی اور ابھری ہوئی چیز کے لئے استعمال ہونے لگا اور ”مکعب“ کو بھی اس لئے مکعب کہتے کہا جاتا ہے کہ وہ چاروں اطراف سے ابھرا ہوا ہوتا ہے، اُن عورتوں کو جن کے سینے تازہ تازہ ابھر رہے ہوتے ہیں ”کاعب“ کہا جاتا ہے جس کی جمع ”کواعب“ ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے بہر حال یہ لفظ (کعبہ) خانہ خدا کی ظاہری بلندی کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے مقام کی عزت و بلندی کی علامت بھی ہے۔

کعبہ ایک طویل اور پُر حوادث تاریخ کا حامل ہے، یہ تمام حوادث بہر حال اس کی عظمت و اہمیت ہی کے باعث ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

کعبہ کی اہمیت اس قدر ہے کہ روایات اسلامی میں اسے خراب ویران کرنے کو پیغمبر اور امام (علیہ السلام) کے قتل کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس کی طرف دیکھنا عبادت اور اس کے گرد طواف کرنا بہترین اعمال میں سے ہے، یہاں تک کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

”لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَرْفَعَ بَنَائِهِ فَوْقَ الْكَعْبَةِ“ ”مناسب نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنا گھر کعبہ سے اونچا بنائے“^(۱)

لیکن اس طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ کعبہ کی اہمیت اور احترام قطعاً اس کی عمارت کی وجہ سے نہیں ہے؛ کیونکہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق:

”خدا نے اپنے گھر کو ایک خشک جلی ہوئی اور سخت پہاڑوں کے درمیان والی زمین میں قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اسے بہت ہی سادہ مصالحہ سے بنایا جائے، عام اور معمولی پتھر سے“^(۲)

لیکن چونکہ خانہ کعبہ ایک قدیم ترین اور بہت ہی سابق ترین توحید اور خدا پرستی کا مرکز ہے اور مختلف ملل و اقوام کی توجہ کی مرکزیت کا نقطہ ہے لہذا اسے درگاہ خداوندی سے ایسی اہمیت میسر آئی ہے۔۔۔

۱۔ سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۴۸۲۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲، خطبہ قاصعہ

۱۰۰ ﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْحَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْحَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

ترجمہ:

۱۰۰۔ کہہ دو کہ پاک و ناپاک (کبھی) برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو، خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو اے صاحبان عقل و خرد! تاکہ تم فلاح و نجات حاصل کر سکو۔

اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں

گذشتہ آیات میں مشروبات الکحل، قمار بازی، انصاب و ازالام اور حالت احرام میں شکار کرنے کی حرمت کے سلسلے میں گفتگو تھی، چونکہ ہو سکتا ہے بعض لوگ ایسے گناہوں کے ارتکاب کے لئے کچھ معاشروں اور علاقوں میں اکثریت کے عمل کو دستاویز قرار دیں اور اس بہانے سے کہ مثلاً شہر کی اکثریت شراب پیتی ہے یا قمار بازی کرتی ہے یا یہ کہ لوگوں کی اکثریت فلاں قسم کے حالات میں حرمت شکار وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتی لہذا وہ ان احکام پر عمل درآمد سے روگردانی کریں اور انھیں طاق نسیاں کر دیں تو اس بنا پر کہ یہ بہانہ اس مقام پر اور اس قسم کے افراد سے دیگر مواقع میں کلی طور پر چھپن لیا جائے، خدا ایک بنیادی کلیہ قاعدہ مختصر سی عبارت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے پیغمبر! پاک و ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک لوگوں کی زیادتی اور آلودہ لوگوں کی کثرت تجھے تعجب میں ڈال دے اور بھلی معلوم ہو ﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْحَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْحَبِيثِ﴾۔

اس بنا پر درج بالا آیت میں خبیث و طیب ہر قسم کے پاک و ناپاک وجود کے معنی میں ہے چاہے وہ پاک و ناپاک کھانے کی چیزیں ہوں یا پاک و ناپاک افکار و نظریات ہوں۔

آیت کے آخر میں صاحبان فکر اور ارباب عقل و ہوش کو مخاطب کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے کہ خدا سے ڈرو تاکہ کامران و کامیاب ہو جاؤ ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

لیکن یہ جو آیت میں ایک واضح چیز کی توضیح کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کوئی یہ خیال کرے کہ کچھ عوارض مثلاً پلید و ناپاک کے طرفداروں کی زیادتی جسے اصطلاح میں ”اکثریت“ کہتے ہیں اس چیز کی باعث بنے کہ ناپاک کی ہم پلہ قرار پاجائے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات کچھ لوگ انبوه کثیر اور کثرت کے میلانات کے زیر اثر آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر اکثریت کسی مطلب کی طرف مائل ہو جائے تو یہ اس مطلب کے بے چون و چرا

درست ہونے کی قطعی نشانی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے مواقع بہت سے ہو گزرے ہیں جن میں معاشروں کی اکثریت واضح اشتباہات اور غلطیوں میں گرفتار ہوئی ہے اور مواقع اور حقیقت میں جو چیز اچھی چیز کی بُری چیز سے (اور خبیث کی طیب سے) پہچان کے لئے لازمی ہے ”وہ اکثریت کیفی“ ہے نہ کہ ”اکثریت کمی“ یعنی قوی تر، والا تر اور اعلیٰ ترین افکار اور توانا تر اور پاک ترین نظریات کی ضرورت ہے، نہ کہ طرفداروں کی کثرت۔ یہ مسئلہ شاید اس زمانہ کے بعض لوگوں کے ذوق کے مطابق نہ ہو کیونکہ تلقین و تبلیغ کے ذریعے بہت کوشش کی گئی ہے کہ لوگ اکثریت کے رجحانات و میلانات کو نیک و بد کے پرکھنے کی ترازو کے طور پر قبول کر لیں۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے باور کر لیا ہے کہ ”حق“ وہ چیز ہے جس کو اکثریت پسند کرتی ہو اور اچھی چیز وہ ہے جس کی طرف اکثریت مائل ہو۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ دنیا کے بہت سے مصائب و آلام اسی طرز فکر کی وجہ سے ہیں۔ ہاں اگر اکثریت صحیح رہبری اور درست تعلیمات سے بہرہ مند ہو جائے اور اصطلاحی طور پر عام معنی کے لحاظ سے ایک رشید اکثریت ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کے میلانات نیک و بد کی پہچان کا مقیاس و میزان بن سکیں، نہ کہ وہ اکثریتیں جن کی رہنمائی نہیں ہوئی اور جو غیر رشید ہیں۔

بہر حال قرآن محل بحث آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: کبھی تمہیں بُروں اور ناپاک چیزوں کی زیادتی تعجب میں نہ ڈالے۔ دیکر مقامات پر بھی متعدد مرتبہ فرمایا ہے: ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾
اکثر لوگوں کے کام علم و دانش کے ماتحت نہیں ہوتے۔

ضمنی طور پر توجہ کرنا چاہیے کہ اگر آیت میں لفظ ”خبیث“، ”طیب“ پر مقدم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محل بحث آیت میں روئے سخن، ان لوگوں کی طرف ہے جو خبیث کی زیادتی کو اس کی اہمیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ انھیں جواب دیا جائے، اس لئے قرآن اُن کے گوش گزار کرتا ہے کہ نیکی و بدی اور اچھائی و بُرائی کا معیار کسی بھی موقع پر کثرت و قلت اور اکثریت و اقلیت نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت ”پاکی“ ”ناپاکی“ سے بہتر ہے اور صاحبانِ عقل و فکر کبھی کثرت سے دھوکا نہیں کھاتے۔ وہ ہمیشہ پلیدی سے دوری اختیار کرتے ہیں اگرچہ اُن کے ماحول کے تمام افراد آلودہ ہوں۔ وہ پاکیزگیوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اگرچہ ان کے معاشرے کے تمام افراد اس کے خلاف ہوں۔

آیات ۱۰۱، ۱۰۲

۱۰۱ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءٍ إِنْ تُبَدَّ لَكُمْ تَسْأَلُونَ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدَّ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ -

۱۰۲ ﴿قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ﴾ -

ترجمہ:

۱۰۱۔ اسے ایمان والوں! تم ایسے مسائل کے متعلق سوال نہ کرو کہ وہ تمہارے سامنے واضح ہو جائیں تو تمہیں بُرے لگیں اور اگر قرآن کے نزول کے وقت ان کے متعلق سوال کرو تو وہ تمہارے لئے آشکار ہو جائیں گے، خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے (اور ان سے صرف نظر کر لیا ہے) اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔

۱۰۲۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان چیزوں کے متعلق سوال کیا تھا اور پھر ان کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو گئے تھے (ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ)۔

شانِ نزول

اوپر والی آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں کتبِ حدیث و تفسیر میں مختلف اقوال نظر آتے ہیں لیکن جو اوپر والی آیت اور ان کی تعبیرات کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ، وہ شانِ نزول ہے جو تفسیر مجمع البیان میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے۔ اور وہ یہ ہے:

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور حج کے بارے میں خدا کا حکم بیان کیا تو ایک شخص جس کا نام ”عکاشہ“ تھا (اور ایک روایت کے مطابق ”سراقہ“) نے کہا: کیا یہ حکم ہر سال کے لئے ہے اور ہر سال ہمیں حج بجالانا ہوگا؟ پیغمبر نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا، لیکن اس نے اصرار کیا اور دو مرتبہ یا تین مرتبہ اپنے سوال کا تکرار کیا، پیغمبر نے فرمایا: وائے ہوتم پر، کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہو، اگر تمہارے جواب میں میں ہاں کہدوں تو ہر سال تم پر حج واجب ہو جائے گا اور اگر ہر سال واجب ہو گیا تو اس کی انجام دہی کی تم میں طاقت نہیں ہوگی اور اگر اس کی مخالفت کی تو گنہگار ہو گے، لہذا جب تک میں تم سے کوئی چیز بیان نہ کروں تم اس پر اصرار نہ کیا کرو کیونکہ (ایک چیز) اُن امور میں سے

جو (بعض) گذشتہ اقوام کی ہلاکت کا سبب بنی یہ تھی کہ وہ ہٹ دھرمی کرتے تھے اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے اور اپنے پیغمبر سے زیادہ سوال کرتے تھے، اس بنا پر جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی توانائی کے مطابق اُسے انجام دو۔

”إِذَا أَمَرْتَكُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ“

اور جب تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اجتناب کرو، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے روکا گیا^(۱) کہیں اس سے اشتباہ نہ ہو کہ اس شانِ فزول سے مراد۔ جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے۔ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے لئے راہ پرش و سوال اور مطالبِ علمی سمجھنا بند کر دیا جائے، کیونکہ قرآن تو خود اپنی آیات میں صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے اس کا اہلِ علم سے سوال کریں۔

”فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“

بلکہ اس سے مراد بے جا سوال، بہانہ سازیاں اور ہٹ دھرمیاں ہیں، یہ طریقہ کار زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں کی خرابی، گفتگو کرنے کی مزاحمت اور اس کے سلسلہ گفتگو اور پروگرام کی پراکندگی کا سبب بنتا ہے۔

تفسیر

غیر مناسب سوالات

اس میں شک نہیں کہ سوال کرنا حقائق کو سمجھنے کی کلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کم پوچھتے ہیں کم جانتے ہیں۔ آیات و روایاتِ اسلامی میں بھی مسلمان کو تاکیدِ حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ نہیں جانتے پوچھیں، لیکن چونکہ ہر قانون کا کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے لہذا تعلیم و تربیت کی یہ بنیاد بھی استثنا سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مسائل کا مخفی رہنا اجتماعی نظام کی حفاظت اور لوگوں کی مصلحتوں کے پیش نظر بہتر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر واقعیت اور حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے لئے جستجو کرنا اور پے در پے سوال کرنا نہ صرف یہ کہ فضیلت نہیں رکھتا، بلکہ مذموم و ناپسندیدہ بھی ہے۔ مثلاً زیادہ تر ڈاکٹر اسی میں مصلحت جانتے ہیں کہ سخت اور وحشت ناک بیماریوں کو بیمار سے مخفی رکھیں۔ بعض اوقات صرف ساتھ والے لوگوں کو اصل ماجرا کی خبر دیتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ بیمار سے چھپائے رکھیں۔ کیونکہ تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ بہت سے لوگ اگر اپنی بیماری کے گہرے پن سے باخبر ہو جائیں تو وحشت و سرگردانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ وحشت انہیں مارنے ڈالنے تو کم از کم بیماری سے صحت یابی میں تاخیر کا سبب ضرور بن جاتی ہے۔

لہذا ایسے مواقع پر بیمار کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے ہمدرد و طبیب کے سامنے سوال و اصرار کرنے لگے کیونکہ اس کا بار بار اصرار بعض اوقات طبیب پر میدان کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے کہ وہ اپنی آسودگی اور دوسرے بیماروں کی خبر گیری کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں دیکھتا کہ اس ”ہٹ دھرم“ بیمار کے لئے حقیقت واضح کر دے، اگرچہ اسے اس سے بہت نقصانات اٹھانا پڑیں۔

اسی طرح لوگ اپنے ساتھیوں کے بارے میں خوش گمانی کے محتاج ہیں اور اس عظیم سرمائے کی حفاظت کے لئے بہتر ہی ہے کہ ایک دوسرے کے حالات کی تمام تفصیلات سے باخبر ہوں، کیونکہ آخر کام ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے، اور تمام کمزوریوں کا فاش ہو جانا، لوگوں کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مشکلات پیدا کر دے گا۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک فرد جو موثر شخصیت کا مالک ہے، اتفاق سے کسی پست اور نچلے خاندان میں پیدا ہوا ہے اب اگر اس کا سابقہ حال فاش ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی تاثیر معاشرے میں متزلزل ہو جائے۔ اس لئے اس قسم کے مواقع پر لوگوں کو کسی طرح بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے اور کسی جستجو میں نہیں پڑنا چاہیے۔

یا یہ کہ مبارزات اجتماعی کے بہت سے منصوبے ایسے ہوتے ہیں جنہیں عملی شکل دینے تک پوشیدہ رہنا چاہیے اور ان کے افشا پر اصرار کرنا معاشرے کی کامیابی پر منفی طور پر اثر انداز ہوگا۔

یہ اور ان جیسے کئی ایک مواقع ایسے ہیں جن میں سوال کرنا صحیح نہیں ہے اور رہبر اور قائدین کو جب تک وہ بہت زیادہ دباؤ اور فشار میں نہ ہوں ان کا جواب نہیں دینا چاہیے۔

قرآن زیر نظر آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! ایسے امور کے افشا کے متعلق سوال نہ کرو کہ جو موجب رنج و تکلیف ہوں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءٍ إِنْ تُبَدَّ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ﴾۔

لیکن اس سبب سے کہ بعض افراد کی طرف سے پے در پے سوالات کا ہونا اور ان کا جواب نہ دینا ممکن ہے دوسروں کے لئے شک و شبہ کا باعث بن جائے اور بہت سے مفاسد پیدا کر دے تو مزید کہتا ہے: اگر ایسے مواقع پر زیادہ اصرار کرو گے تو آیات قرآن کے ذریعے تمہارے لئے افشاء ہو جائیں گے اور تم زحمت و تکلیف میں پڑ جاؤ گے ﴿وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلَ الْقُرْآنُ تُبَدَّ لَكُمْ﴾۔

یہ جوان کے افشاء کرنے کو نزول قرآن کے زمانے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سوالات ایسے مسائل سے مربوط تھے جنہیں وحی کے ذریعے ہی واضح اور روشن ہونا تھا۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: یہ خیال نہ کرو کہ اگر خدا کچھ مسائل بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتا ہے تو اُن سے غافل تھا بلکہ وہ تمہارے لئے وسعت چاہتا ہے اور انہیں معاف کر دیا ہے اور خدا بخشنے والا حلیم و بردبار ہے (عَفَا اللہُ عَنْہَا وَاللہُ غَفُورٌ حلیم)۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”ان الله افترض عليكم فرائض فلا تضيعوها وحد لكم حدوداً فلا تعتدوها و نهي عن اشياء فلا تنتهكوها و سكت لكم عن اشياء ولم يدعها نسياناً فلا تتكلفوها“
خدا نے کچھ واجبات تمہارے لئے مقرر کیے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ حدود تمہارے لئے نافذ کی ہیں اُن سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے اُن کی پردہ درسی نہ کرو اور کچھ امور سے خاموش رہا ہے اور ان کے پوشیدہ رکھنے کو اس نے بہتر سمجھا ہے اور یہ پوشیدہ رکھنا نسیان اور بھول چوک کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔ ایسے امور کے افشاء اور ظاہر کرنے پر اصرار نہ کرنا۔^(۱)

۱۔ مجمع البیان آیہ محل بحث کے ذیل میں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہا جائے کہ اگر ان امور کا افشا کرنا لوگوں کی مصلحت کے خلاف ہے تو پھر اصرار کی صورت میں اُسے کیوں افشاء کیا جاتا ہے؟

اس کی دلیل وہی ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ بعض اوقات اگر پے در پے سوالات کے مقابلے میں سکوت اور خاموشی اختیار کر لی جائے تو اُس سے کئی دوسرے مفسد پیدا ہو جاتے ہیں، بدگمانیاں سر اٹھا لیتی ہیں، اور لوگوں کے اذہان خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر طبیب بیمار کے پے در پے سوالات کے جواب میں سکوت اختیار کرے تو بعض اوقات ہو سکتا ہے یہ امر بیمار کو طبیب کے بارے میں بیماری کی اصل تشخیص کے سلسلے میں شک میں ڈال دے اور وہ یہ خیال کرے کہ اصولی طور پر اس کی بیماری کی شناخت نہیں ہو سکی۔ لہذا وہ طبیب کی ہدایات پر عمل نہ کرے تو اس صورت میں طبیب کے پاس بیماری کے افشاء کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگرچہ بیمار اس طریقے سے کئی ایک مشکلات اور دشواریاں پیدا کرے گا۔

بعد والی آیت میں اِس آیت کی تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: گذشتہ اقوام میں سے بھی بعض لوگ اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے اور جب انھیں جواب دیا گیا تو مخالفت اور نافرمانی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے **﴿قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكَ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ﴾**۔

اس سلسلے میں کہ یہ اشارہ گذشتہ اقوام میں سے کس قوم سے مربوط ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ اس کا تعلق حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اپنے شاگردوں کے ذریعہ ماندہ آسمانی کی درخواست سے مربوط ہے کہ جس کے صورت پذیر ہو جانے کے بعد بعض مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس کا ربط حضرت صلح (علیہ السلام) سے معجزہ طلب کرنے کے ساتھ ہے لیکن ظاہراً یہ تمام احتمالات صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت ایسے سوال کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جس کا معنی ”پوچھنا“ اور کشفِ مجہول کرنا ہے نہ کہ وہ سوال جس کا معنی تقاضا کرنا اور کسی چیز کی درخواست کرنا ہے۔ گویا لفظ ”سوال“ کا دونوں معنی میں استعمال ہونا اس قسم کے اشتباہ کا سبب بنا ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ جماعت بنی اسرائیل مراد ہو کہ جب وہ ایک جرم (قتل) کی تحقیق کے سلسلے میں ایک گائے کے ذبح کرنے پر مامور ہوئے تھے (جس کی توضیح جلد اول میں گزر چکی ہے) تو انہوں نے موسیٰ سے ٹیڑھے سوال کیے اور گائے کی جزئیات کے بارے میں ایسے پے در پے سوالات کیے جن کے بارے میں کوئی خاص حکم انہیں نہیں دیا گیا تھا۔ اسی بناء پر انہوں نے کام اپنے اوپر اتنا سخت کر لیا تھا کہ ایسی گائے کا ہاتھ آنا اس قدر مشکل اور قیمتی ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے صرف نظر کر لیں۔

”﴿أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ﴾“۔ اس جملے کے بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں: پہلا یہ کہ ”کفر“ سے مراد نافرمانی اور مخالفت ہو جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ ”کفر“ اپنے مشہور معنی میں ہو، کیونکہ بعض اوقات ایسے تکلیف دہ جوابات سننا جو سننے والے کے ذہن پر بوجھ بن جاتے ہیں کہ وہ اصل موضوع اور کہنے والے کی صلاحیت کا ہی انکار کرنے پر آمادہ ہو جائے، مثلاً یہ کہ بعض اوقات طیب کی طرف سے ایک تکلیف دہ جواب کا سننا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بیمار اپنی طرف سے مخالفت کا اظہار کرے اور اس کی صلاحیت کا ہی انکار کر دے اور اس تشخیص کو بڑھاپے کا نتیجہ قرار دے یا یہ کہے کہ طیب مجبوط الحواس ہے۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ نکتہ دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ زیر بحث آیات کسی صورت میں بھی، منطقی، علمی، تہذیبی اور تربیتی سوالات کی راہ لوگوں بند نہیں کرتیں بلکہ یہ پابندی منحصر طور پر صرف بے جا اور نامناسب سوالات اور ایسے امور کے متعلق جستجو سے مربوط ہے جس کے پوچھنے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت و احتیاج نہیں ہے بلکہ ان کا چھپا رہنا ہی بہتر بلکہ بعض اوقات تو لازمی اور ضروری ہوتا ہے

آیات ۱۰۳، ۱۰۴

۱۰۳ ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَكَثُرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾

۱۰۴ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَائَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾

ترجمہ:

۱۰۳۔ خدا نے کوئی ”بحیرہ“، ”سائبہ“، ”وصیلہ“، ”حام“ قرار نہیں دیا^(۱) لیکن جو لوگ کافر ہو گئے انھوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور اُن میں سے زیادہ تر تو سمجھتے نہیں ہیں۔

۱۰۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں جانتے اور انھوں نے ہدایت حاصل نہیں کی تھی۔

چار غیر مناسب ”بدعات“

آیت میں پہلے تو چار غیر مناسب ”بدعات“ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں موجود تھیں، انھوں نے کچھ جانوروں کے بارے میں کسی جہت سے علامت اور نشانی مقرر کر رکھی تھی اور ان کا گوشت کھانا ممنوع قرار دے رکھا تھا یہاں تک کہ اُن کا دودھ کا پینا، اُن کا ٹٹنا اور اُن پر سواری کرنا جائز شمار نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات ان جانوروں کو آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور کوئی شخص اُن سے متعرض نہ ہوتا۔ یعنی کلی طور پر اس جانور کو بے کار اور فضول چھوڑ دیتے تھے۔

لہذا قرآن مجید کہتا ہے: خدا ان احکام میں سے کسی کو بھی قانونی طور پر قبول نہیں کرتا نہ اس نے بحیرہ قرار دیا نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ﴾۔

باقی رہی ان چار قسم کے جانوروں کی تشریح اور وضاحت تو وہ یہ ہے:

۱۔ بحیرہ: اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس نے پانچ مرتبہ بچہ جنا ہو کہ جن میں پانچواں بچہ مادہ یا ایک روایت کے مطابق فر ہو۔ ایسے جانور کے کان میں ایک وسیع سوراخ کر دیتے تھے اور اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے اور اسے ذبح یا قتل نہیں کرتے تھے۔

”بحیرہ“ بحر کے مادہ سے وسعت اور پھیلاؤ کے معنی میں ہے۔ عرب سمندر کو بحر اس کی وسعت کی بنا پر ہی کہتے ہیں اور بحیرہ کو جو اس نام سے پکارتے تھے تو یہ اُس وسیع شگاف کی وجہ سے تھا جو اُس کے کان میں وہ کر دیتے تھے۔

۲۔ سائبہ وہ اونٹنی جس نے بارہ یا ایک روایت کے مطابق دس بچے جنے ہوں اُسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوتا تھا اور وہ جس چراگاہ میں جاتی آزاد تھی اور جس گھاٹ اور چشمے سے چاہتی پانی پیتی۔ کوئی اُس سے مزاحمت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کبھی کبھار صرف اس کا دودھ وہ لیتے اور مہمان کو پلاتے (سائبہ سیب کے مادہ سے، پانی جاری ہونے، اور چلنے میں آزادی کے معنی میں ہے)۔

۳۔ وکیلہ اس گوسفند کو کہتے تھے جس نے سات دفعہ بچہ جنا ہو اور ایک روایت کے مطابق اس گوسفند کو کہتے تھے جو دو بچوں کو ایک ہی مرتبہ جنم دے (وکیلہ وصل کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے باہم بستگی) ایسے جانور کو قتل کرنا بھی حرام سمجھتے تھے۔

۴۔ حام: ”مادہ حمایت“ کا اسم فاعل ہے، جو حمایت کرنے والے کے معنی میں ہے۔ حام اُس فر جانور کو کہتے ہیں جس سے مادہ جانوروں کی تلقیح اور جفتی میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ جب عرب دس مرتبہ اس جانور سے جفتی میں استفادہ کر لیتے اور ہر دفعہ اس کے نطفہ سے بچہ پیدا ہو جاتا تو کہتے کہ اس جانور نے اپنی پشت کی حمایت کی ہے یعنی اب کوئی شخص اس پر سوار ہونے کا حق نہیں رکھتا (ایک معنی اس کا ”حمی“ نگہداری، رکاوٹ اور ممنوعیت بھی ہے)۔

اوپر والے چار عناوین کے معنی میں مفسرین کے درمیان اور احادیث کے اندر دوسرے احتمال بھی نظر آتے ہیں لیکن سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ مراد ایسے جانور تھے جنہوں نے حقیقت میں اپنے مالکوں کی زیادہ بار بار نتیجہ بخش طور پر خدمت کی ہو۔ وہ بھی ان کی اس خدمت کے صلے میں ان جانوروں کے لئے ایک قسم کے احترام اور آزادی کے قائل ہو جاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ان تمام مواقع پر جانوروں کی خدمات کے بدلے میں شکر گزاری اور قدر دانی کی روح کار فرما نظر آتی ہے اور اس لحاظ سے ان کا عمل قابل احترام تھا چونکہ ان جانوروں کے بارے میں ان سے استفادہ نہ کرنا ایک ایسا احترام

تھا جس کا کوئی مفہوم نہ تھا علاوہ ازیں ایک قسم کا مال کا اتلاف، نعمات الہی کا ضیاع اور انھیں معطل کرنا بھی شمار ہوتا تھا سب چیزوں کو چھوڑتے ہوئے یہ جانور اس احترام کی وجہ سے جانکاه تکالیف اور مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے کیونکہ عملی طور پر بہت کم افراد اس کے لئے تیار ہوتے تھے کہ انھیں صحیح غذا مہیا کریں اور ان کی حفاظت اور نگہداری کریں اور اگر اس چیز کو مد نظر رکھا جائے کہ یہ جانور بہت زیادہ سن کے ہوتے تھے تو مزید اندازہ ہوگا کہ وہ تکلیف دہ حالت میں بے پناہ محرومیوں میں زندگی بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مر جاتے، انہی وجوہ کی بنا پر اسلام نے سختی سے ان امور سے منع کیا۔

ان سب باتوں کو چھوڑتے ہوئے کئی ایک روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ان سب چیزوں کو یا ان میں سے بعض کو بتوں کے لئے انجام دیتے تھے اور درحقیقت انھیں بت کی نذر کرتے تھے، لہذا اس صورت میں اسلام کا اس کام سے مبارزہ بت پرستی سے مقابلہ بھی تھا۔

تجرب کی بات یہ ہے بعض روایات کے مطابق جب اُن میں سے بعض جانور طبعی موت مر جاتے تو بعض اوقات اُن کے گوشت سے گویا بطور تبرک و تین استعمال کرتے جو بذاتِ خود ایک قبیح فعل تھا^(۲)

اس کے بعد فرماتا ہے: کافر لوگ اور بت پرست ان چیزوں کی طرف نسبت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قانونِ الہی ہے (وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَقْتُرُونَ عَلَى اسِرِ الْكُذِبِ) اُن میں سے اکثر اس بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر نہیں کرتے تھے اور اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتے تھے، بلکہ دوسروں کی اندھی تقلید کرتے تھے ﴿وَأَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾

بعد والی آیت میں ان کی بے تکی اور غیر مناسب تحریکوں کی دلیل و منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جب اُن سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ، تو وہ اس کام سے روگردانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے بڑوں کے رسم و رواج اور ان کے طریقے اور دستور کافی ہیں ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَائَنَا﴾۔

حقیقت میں ان کی غلط کاریاں اور بت پرستیاں ایک دوسری قسم کی بت پرستی سے پھوٹی تھیں، وہ اپنے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کے بیہودہ رسم و رواج اور طور طریقوں کو بلاقید و شرط اختیار کرتے تھے، گویا وہ صرف ”بوڑھوں“ اور ”آباؤ اجداد“ سے نسبت کو اپنے عقیدہ اور عادت و رسوم کی صحت و درستی کے لئے کافی سمجھتے تھے۔

قرآن صراحت سے انھیں جواب دیتا ہے: کیا ایسا نہیں کہ اُن کے آباؤ اجداد صاحب علم و دانش نہیں تھے اور انھیں ہدایت حاصل نہیں ہوئی تھی ﴿أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ -

یعنی اگر تمہارے وہ بڑے بوڑھے اور بزرگ جن پر تم اپنے عقیدہ اور اعمال کے لئے تکیہ ہوئے ہو، ارباب علم و دانش اور ہدایت یافتہ ہوتے تو تمہارا ان کی پیروی کرنا جاہل کا عالم کی تقلید کرنے کے زمرے میں شمار ہوتا، لیکن اس صورت میں جبکہ تم خود بھی جانتے ہو کہ وہ کوئی چیز تم سے زیادہ نہیں جانتے تھے بلکہ شاید تم سے بھی پیچھے تھے تو اس حالت میں تو تمہارا معاملہ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنے کا واضح مصداق ہے، جو کہ عقل و خرد کے ترازو میں بہت ہی ناپسندیدہ فعل ہے۔ چونکہ اوپر والے جملے میں قرآن نے لفظ ”اکثر“ استعمال کیا ہے اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس جہالت و تاریکی کے ماحول میں بھی ایک سمجھدار اقلیت اگرچہ وہ کمزور تھی، موجود تھی، جو ایسے اعمال کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

۱۔ یہ چار قسم کے گھریلو جانوروں کی طرف اشارہ ہے، زمانہ جاہلیت میں ان سے استفادہ ممنوع سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس بدعت کا خاتمہ کر دی۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۴۸۶۔

اپنے بزرگوں اور بڑوں کے نام کا بت

منجملہ اُن امور کے جو زمانہ جاہلیت بڑی شدت کے ساتھ رائج تھے ایک اپنے بزرگوں اور بڑوں پر فخر کرنا اور پرستش کی حد تک بلاقید و شرط ان کی شخصیات، افکار، عادات اور رسوم کا احترام کرنا تھا، قرآن نے بھی اس امر کا مختلف آیات میں ذکر کیا ہے، نیز یہ امر زمانہ جاہلیت سے مخصوص نہیں تھا بلکہ بہت سی اقوام و ملل میں موجود ہے اور شاید یہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف خرافات اور بیہودہ چیزیں پھیلنے اور منتقل ہونے کے اصلی عوامل میں سے ایک ہے، گویا ”موت“ گزرے ہوئے لوگوں کے لئے ایک قسم کی مصونیت اور تقدس پیدا کر دیتی ہے اور انھیں احترام و تقویٰ کے حوالے میں لے لیتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدردانی کی روح اور اصول انسانی کے احترام کا تقاضا یہی ہے کہ آباؤ اجداد اور اپنے بزرگوں کو محترم سمجھا جائے لیکن اس معنی میں نہیں کہ معصوم عن الخطاء جان لیا جائے اور ان کے افکار و آداب پر تنقید، تحقیق اور تجسس چھوڑ ہی دیا جائے اور ان کی بیہودہ باتوں کی بھی اندھی پیروی اور تقلید اختیار کر لی جائے۔

یہ عمل حقیقت میں ایک قسم کی بت پرستی اور جاہلانہ منطق ہے، بلکہ ضروری یہ ہے ان کے حقوق اور مفید افکار و سنن کے احترام کے باوجود، ان کے غلط مراسم اور طور طریقوں کو سختی سے کچلا جائے، خاص طور پر جبکہ آئندہ نسلیں زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش کی ترقی اور زیادہ تجربات کی بنا پر عام طور سے گزشتہ نسلوں کی نسبت زیادہ دانا اور ہوشمند ہیں اور کوئی عقل و خرد گزشتہ لوگوں کی اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتی۔

تجرب کی بات یہ ہے کہ بعض علماء یہاں تک کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اس کمزور منطق سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور بعض اوقات بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے مضحکہ خیز خرافات کو عملاً قبول کر لیتے ہیں مثلاً بعض اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں سال کے آخر میں آگ کے اوپر کودتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنے بڑوں کی آتش پرستی کو زندہ رکھ سکیں اور درحقیقت ان کی یہ منطق زمانہ جاہلیت کے بدوؤں کی سی منطق کے سوا اور کچھ نہیں۔

بے دلیل تضاد

تفسیر المیزان میں تفسیر در مشور سے اہل سنت کے علماء کے ایک گروہ سے منقول ہے کہ ابوالاحوص نامی ایک شخص سے مروی ہے، وہ کہتا ہے: میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے پُرانا اور بوسیدہ

لباس پہن رکھا تھا، پیغمبر نے فرمایا: کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! پیغمبر نے فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ میں نے کہا: ہر قسم کا مال میرے پاس موجود ہے؛ اونٹ، گوسفند، گھوڑے وغیرہ، پیغمبر نے فرمایا: جب خدا تجھے کوئی چیز دے تو ضروری ہے کہ اُس کے آثار بھی تم میں دکھائی دیں (نہ یہ کہ اپنی ثروت کو ایک طرف رکھ دو اور غریبوں مسکینوں کی طرح زندگی بسر کرو)۔

اس کے بعد فرمایا: کیا تمہارے اونٹوں کے بچے پھٹے ہوئے کانوں کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں یا سالم کانوں کے ساتھ، میں نے کہا: یقیناً صحیح و سالم کانوں کے ساتھ، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اونٹنی کٹے ہوئے کان والا بچہ جنے؟ تو آپ نے فرمایا: پھر تو لازماً خود تم ہی تلوار ہاتھ میں لے کر اُن میں سے بعض کے کانوں کو چیرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ ”بحر“ ہے اور کچھ دوسروں کے کانوں کو کاٹ کر کہتے ہو کہ یہ ”صرم“ ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں ایسا ہی کرتا ہوں۔ فرمایا: ہرگز ایسا کام نہ کرو، جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے، وہ تیرے لئے حلال ہے، اس کے بعد آپ نے (اس آیت کی) تلاوت کی: ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِيَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ﴾ (المیزان، ج ۶، ص ۱۷۲)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کے ایک حصے کو معطل اور بے مصرف چھوڑ دیتے تھے اور کنجوسی کر کے پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے۔ دراصل یہ ایک بے دلیل تضاد تھا۔

آیت ۱۰۵

۱۰۵ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُونَ﴾

ترجمہ:

۱۰۵۔ اے ایمان والو! اپنے اوپر نظر رکھو، جب تمہیں ہدایت حاصل ہو جائے تو ان لوگوں کی گمراہی جو گمراہ ہو چکے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا نہیں سکے گی، تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہ تمہیں اس عمل سے جو تم کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا۔

تفسیر

ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے

گذشتہ آیت میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے متعلق گفتگو تھی۔ قرآن نے واضح طور پر انہیں ڈرایا کہ اس قسم کی تقلید عقل و منطق کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال ان کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر ہم ایسے مسائل میں اپنا معاملہ اپنے بزرگوں سے الگ کر لیں تو پھر ان کی سرنوشت کیا ہوگی، علاوہ ازیں اگر ہم اس قسم کی تقلید سے دست بردار ہو جائیں تو ایسی ہی تقلید کرنے والے دیگر بہت سوں کے بارے میں کیا صورت ہوگی۔ زیر نظر آیت اس قسم کے سوالات کے جواب میں کہتی ہے: اے ایمان لانے والو! تم اپنے ہی جوابدہ ہو، اگر تم ہدایت یافتہ ہو گئے تو دوسروں کی گمراہی (چاہے، وہ تمہارے اپنے بڑے ہوں یا ہم عصر دوست و احباب) تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾۔ اس کے بعد قیامت، حساب کتاب اور ہر کسی کے اعمال کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور تم میں سے ہر ایک کا حساب الگ ہوگا اور جو کچھ تم نے انجام دیا اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا ﴿إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

ایک سوال کا جواب

اس آیت کے بارے میں بہت زیادہ آوازیں بلند ہوئی ہیں، بعض نے یہ خیال کر لیا ہے کہ اس آیت کے درمیان اور ”امر بمعروف“، ”و نہی از منکر“ کے حکم کے درمیان کہ جو اسلام کا ایک قطعی اور مسلم حکم ہے ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ تم اپنے حالات کی طرف توجہ کرو (اور اپنے ہی متعلق سوچ بچار کرو اور اپنی حالت میں مگن رہو) دوسروں کا انحراف اور کجروی تمہاری حالت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

اتفاقاً روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کا اشتباہ آیت کے فزول کے زمانے میں بھی بعض کم علم لوگوں میں پایا جاتا تھا۔

”جیر ابن نفیل“ کہتے ہیں:

میں چند اصحاب پیغمبر کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا اور میں اُن میں سب سے زیادہ کم سن تھا۔ اُنہوں نے امر بمعروف اور نہی از منکر کے متعلق گفتگو شروع کر دی، میں ان کی باتوں کے درمیان بول پڑا اور میں نے کہا کہ کیا خدا قرآن میں یہ نہیں کہتا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ اس بنا پر امر بمعروف اور نہی از منکر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اچانک اُن سب نے مجھے سرزنش کی اور کہنے لگے: تم قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر الگ کر رہے ہو۔ میں اپنی گفتگو سے بہت ہی شرمندہ ہوا اور انھوں نے اپنا مباحثہ جاری رکھا، جب وہ وہاں سے مجلس برخاست کر کے اٹھنے لگے تو میری طرف رخ کر کے کہنے لگے: تُو کمسن جوان ہے اور تم نے قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر اُسے باقی سے الگ کر لیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تم ایسے زمانے کو پاؤ کہ تم یہ دیکھو کہ بخل لوگوں پر چھایا ہوا ہے اور ان پر اس کی فرمانروائی ہے، ہوا ہوس لوگوں کا پیشوا ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے پسند کرتا ہے، ایسے زمانے میں تم صرف اپنی ہی خیر مناء، دوسروں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہچائے گی (یعنی آیت ایسے زمانے کے ساتھ مربوط ہے)۔

ہمارے زمانے کے بعض آرام پرست بھی جب دو عظیم خدائی فرائض امر بمعروف اور نہی از منکر کی انجام دہی کی گفتگو ہوتی ہے تو جواب دہی سے اپنے کندھوں کو خالی رکھنے کے لئے اس آیت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے معنی میں تحریف کرتے ہیں حالانکہ تھوڑے غور و فکر کے بعد یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان دو احکام کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے؛ کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ محل بحث آیت کہتی ہے کہ ہر شخص کا حساب کتاب الگ الگ ہے اور دوسروں کی گمراہی، مثلاً اپنے گزرے ہوئے بزرگوں یا غیروں کی گمراہی ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت پر کوئی ضرب نہیں لگاتی، یہاں تک کہ اگر وہ بھائی بھائی بھی ہوں، یا باپ بیٹا ہوں لہذا تم ان لوگوں کی پیروی نہ کرو اور خود اپنے آپ کو بچاؤ (غور کیجئے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت اس موقع کی طرف اشارہ کرتی ہے جس وقت امر بمعروف اور نہی از منکر کارگر نہ ہوں، یا ان کی تاثیر کے حالات موجود نہ ہوں، بعض اوقات کچھ لوگ ایسے موقع پر پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ تمہارے لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ تم نے اپنے فرض کی انجام دہی کر دی ہے اور انہوں نے قبول نہیں کیا، یا ان میں قبول کرنے والوں کی اہلیت اور اسباب موجود نہیں تھے، اس بنا پر کوئی نقصان تمہیں نہیں پہنچے گا۔

یہی مفہوم اُس حدیث میں جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں موجود ہے، اسی طرح بعض دوسری احادیث میں نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

”أُيْتَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ فَإِذَا رَأَيْتَ دُنْيَاً مُّوْتَرَةً وَشَحْطاً مُّطَاعاً وَهَوًى مُّتَبِعاً وَاعْجَابَ كُلِّ رَأًى بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ بِخُوصِصَةِ نَفْسِكَ وَذَرِ عَوَامَهُمْ“

”امر بمعروف و نہی از منکر کرو، لیکن جب دیکھو کہ لوگ دنیا پسند کو ترجیح دیتے اور مقدم سمجھتے ہیں، بخل اور ہوا و ہوس ان پر حکمران ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے پسند کرتا ہے (اور اس کے کان کسی دوسرے کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہیں) تو اپنے آپ میں لگ جاؤ اور لوگوں کو چھوڑ دو“^(۱)

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ امر بمعروف اور نہی از منکر ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین مسئلہ ہے، جس کی جوابدہی سے کسی طرح بھی سبکدوشی ممکن نہیں، صرف ان مواقع پر یہ دونوں فرائض ساقط ہو جاتے ہیں جب ان کے اثر انداز ہونے کی اُمید نہ ہو اور لازمی و ضروری شرائط ان میں موجود نہ ہوں^(۲)

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۶۸۴۔

۲۔ اس سلسلے میں تفصیلی اسلامی احکام جاننے کے لئے امام خمینی کی توضیح المسائل کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب کی طرف رجوع فرمائیں، نیز دیگر متعلق اسلامی کتب کا مطالعہ کریں (مترجم)۔

آیات ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸

۱۰۶ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنَكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمْ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْسِبُوهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنْ اَرْتَبْتُمْ لَأَنْشُرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّآ إِذَا لَمِنَ الْأَثِمِينَ﴾

۱۰۷ ﴿فَإِنْ عَثَرَ عَلَىٰ أَهْمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا فَآخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأُولَيَانِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ﴾

۱۰۸ ﴿ذَلِكَ أَذْنَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُوا أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانٌ بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاسْمَعُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

ترجمہ:

۱۰۶۔ اے ایمان لانے والو! جب تم سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو وصیت کرتے وقت اپنے میں سے دو عادل افراد کو بلاؤ، اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں موت آپہنچے (اور راستے میں تمہیں کوئی مسلمان نہ ملے) تو اغیار میں سے دو فرد، اور اگر شہادت ادا کرتے وقت ان کے سچے ہونے میں شک کرو تو انہیں نماز کے بعد روک رکھو تاکہ وہ یہ قسم کھائیں کہ ہم حق کو کسی چیز کے بدلے فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اگرچہ ہمارے رشتہ داروں کے بارے میں ہو اور ہم خدائی شہادت کو نہیں چھپاتے کہ مبادا ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں۔

۱۰۷۔ اور اگر اطلاع حاصل ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے حق کو چھپایا ہے) تو دو اور افراد کہ جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے ان کی جگہ قرار پائیں گے اور خدا کی قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کی نسبت حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز و زیارتی کے مرتکب نہیں ہوئے اور اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالمین میں سے ہوں گے۔

۱۰۸۔ یہ کام زیادہ سبب بنے گا کہ وہ حق کی گواہی دیں (اور خدا سے ڈریں) اور یا (لوگوں سے) ڈریں کہ (ان کا جھوٹ فاش ہو جائے گا اور) ان کی قسموں کی جگہ دوسروں قسمیں لے لیں گی اور خدا (کی مخالفت) سے ڈرو اور کان دھر کربات سنو اور خدا فاسقین کی ہدایت نہیں کرتا۔

شان نزول

مجمع البیان اور بعض دوسری تفاسیر میں درج بالا آیات کی شان نزول کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ مسلمانوں میں سے ”ابن ابی ماریہ“ نامی ایک شخص دو عرب عیسائیوں کی ہمراہی میں جن کے نام ”تمیم“ اور ”عدی“ تھے اور وہ دونوں بھائی تھے، تجارت کے ارادے سے مدینہ سے نکلا۔ اثنائے راہ میں ”ابن ابی ماریہ“ جو مسلمان تھا بیمار ہو گیا اس نے وصیت نامہ لکھا اور اُسے اپنے سامان میں چھپا دیا اور اپنا مال اپنے دو ہمسفر عیسائیوں کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کی کہ وہ اسے اس کے رشتہ داروں تک پہنچادیں وہ مر گیا۔ اُس کے ہمسفر دونوں افراد نے اس کا مال و اسباب کھولا اور اس میں سے گراں قیمت اور زیادہ اہم چیزیں اٹھالیں اور باقی مال وارثوں کو پہنچا دیا۔ وارثوں نے جب سامان کھولا تو انھیں اس میں اُن چیزوں میں سے جو ”ابن ابی ماریہ“ اپنے ساتھ لے گیا تھا، کچھ چیزیں نہ ملیں۔ اچانک اُن کی نظر وصیت نامے پر پڑی۔ انہوں نے دیکھا کہ تمام چوری شدہ مال کی تفصیل اس میں درج ہے۔ انہوں نے اُن دو ہمسفر عیسائیوں کے سامنے ماجر اپیش کیا۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ اُس نے ہمیں دیا وہ ہم نے تمہارے سپرد کر دیا۔ مجبوراً انہوں نے پیغمبر سے شکایت کی تو زیر نظر آیات نازل ہوئیں جن میں اس سلسلے میں حکم بیان کیا گیا۔

لیکن اس شان نزول سے کہ جو کتاب کافی میں بیان ہوئی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو دوسرے مال و متاع کا انکار کیا اور معاملہ پیغمبر کی خدمت میں لایا گیا۔ پیغمبر کے پاس چونکہ ان دو افراد کے خلاف کوئی دلیل موجود نہیں تھی تو انھیں قسم کھانے پر آمادہ کیا اور اُن سے قسم لینے کے بعد انھیں بری کر دیا، لیکن کچھ وقت نہیں گزرا تھا کہ اُن دونوں آدمیوں کے پاس سے مال متنازعہ میں سے کچھ مال مل گیا اور اس طرح سے اُن کا جھوٹ ثابت ہو گیا، ماجر اپیش کی خدمت میں عرض کیا گیا، پیغمبر انتظار میں ہی تھے کہ درج بالا آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ مرنے والے کے ورثا قسم کھائیں اور پھر آپ نے مال لے کر ان کے سپرد کر دیا۔

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظِ حقوق

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظِ حقوق اور لوگوں کے اموال اور مکمل عدالت اجتماعی کے اجراء کرنے کا مسئلہ ہے۔ اوپر والی آیات اس حصہ سے مربوط احکام کا ایک گوشہ ہیں۔

پہلے اس بنا پر کہ وارثوں کے حقوق مرنے والے کے مال میں سے ضائع نہ ہوں اور پسماندگان، یتیم اور چھوٹے بچوں کا حق پائمال نہ ہو، صاحب ایمان افراد کو حکم دیتا ہے اور اُن سے یہ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کو موت آگھرے تو وصیت کرتے وقت دو عادل افراد کو گواہی کے لئے بلاؤ اور اپنا مال امانت کے طور پر ورثا کے

حوالے کرنے کے لئے ان کے سپرد کرو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ -

یہاں عدل سے مراد وہی عدالت ہے جو گناہ کبیرہ وغیرہ سے پرہیز کرنے کے معنی میں ہے۔ البتہ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ عدالت سے مراد ”امور مالی میں امانت“ اور ”عدم خیانت“ ہو مگر یہ کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہو کہ اس سے مزید شرائط بھی اس سلسلے میں ضروری ہیں۔

”منکم“ سے مراد یعنی تم مسلمانوں میں سے، غیر مسلم افراد کے مقابلے میں ہے کہ جس کی طرف بعد والے جملے میں اشارہ ہوگا۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہاں عام شہادت کے متعلق بحث نہیں ہے، بلکہ یہ وہ شہادت ہے جو وصیت کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی یہ دونوں افراد وصی بھی ہیں اور گواہ بھی۔ باقی رہا یہ احتمال کہ یہاں پر دو گواہوں کے علاوہ ایک تیسرے شخص کا وصی کے طور پر انتخاب بھی ضروری ہے تو وہ ظاہر آیت کے خلاف اور شانِ فزول کے مخالف ہے، کیونکہ ہم شانِ فزول میں پڑھ چکے ہیں کہ ابن ماریہ کے ہمسفر صرف دو افراد تھے کہ جنہیں اُس نے اپنی میراث پر وصی اور گواہ اٹھرایا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اگر تم مسافرت میں ہو اور تم پر موت کی مصیبت آپڑے (اور مسلمانوں میں سے کوئی وصی اور شاہد تمہیں نہ مل سکے) تو اس مقصد کے لئے غیر مسلمانوں میں سے دو افراد کا انتخاب کر لو ﴿أَوْ آخَرَانِ مِّنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ﴾ -

اگرچہ اس آیت میں اس موضوع سے متعلق کوئی بات دکھائی نہیں دیتی کہ غیر مسلموں میں سے وصی و شاہد کا انتخاب مسلمانوں میں سے کسی مسلمان کے نہ ملنے کے ساتھ مشروط ہے البتہ یہ بات واضح ہے کہ مراد ایسی صورت میں ہی ہے جب مسلمان تک رسائی نہ ہو اور مسافرت کی قید کا ذکر بھی اسی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح کلمہ ”او“ اگرچہ عام طور پر اختیار کے لئے آتا ہے لیکن یہاں بھی بہت سے دوسرے مواقع کی طرح ”ترتیب“ ہی منظور ہے، یعنی پہلے تو مسلمانوں میں سے انتخاب ہونا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر غیر مسلموں میں سے انتخاب کرو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے یہاں صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی مراد ہیں کیونکہ اسلام مشرکوں اور بت پرستوں کی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا۔

پھر حکم دیتا ہے کہ اگر گواہی دینے کے وقت، رفعِ شک کی غرض سے، ان دونوں افراد کو نماز کے بعد اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں ﴿تَحْسِبُوهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللّٰهِ اِنْ اَرْتَبْتُمْ﴾ اور ان کی شہادت اس طرح سے ہونا چاہیے کہ وہ کہیں کہ: ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ حق کو مادی منافع کی خاطر بیچ ڈالیں اور ناحق گواہی دیں اگرچہ ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو ﴿لَا نَشْتَرِيْ بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی﴾ اور ہم کبھی خدائی گواہی کو نہیں چھپائیں گے کیونکہ اس طرح تو تم گنہگاروں میں سے ہو جائیں گے ﴿وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّا اِذَا لَمِنَ الْاٰثِمِيْنَ﴾

اس حقیقت پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ:

اولاً یہ تمام لوازمات شک و شبہ اور اتہام کی صورت میں ادائے شہادت کے سلسلے میں ہیں۔
دوسرا یہ کہ حفاظت کے لئے ایک طرح کی محکم ضمانت ہے اور یہ بات شہادت عدلین کو بغیر قسم کے قبول کر لینے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ حکم عدم اتہام کے موقع کے ساتھ مربوط ہے، لہذا اس بنا پر نہ تو اس آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی یہ غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے (غور کیجیے)۔

تیسرا یہ کہ نماز سے مراد غیر مسلموں کی صورت میں از روئے اصول وقاعدہ خود ان کی ہی نماز ہونا چاہیے جو ان میں توجہ اور خوف خدا پیدا کرتی ہے، باقی رہا مسلمانوں کے بارے میں تو ایک گمروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ اس سے مراد خاص طور پر نماز عصر ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں بھی اس بارے میں اشارہ ہوا ہے لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور وہ ہر نماز کے لئے ہے، ہو سکتا ہے کہ ہماری روایات میں خصوصیت کے ساتھ نماز عصر کا ذکر استجبائی پہلو رکھتا ہو کیونکہ نماز عصر میں لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ علاوہ ازیں فیصلہ اور قضاوت کا وقت بھی مسلمانوں کے نزدیک زیادہ تر یہی ہوتا تھا۔

چوتھا یہ کہ شہادت کے لئے نماز کے وقت کا انتخاب اس بنا پر تھا کہ کیونکہ اس موقع پر انسان میں خدا خونی کی روح بیدار ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾^(۱)

زمان و مکان کی حالت انسان کو حق کی طرف متوجہ کرتی ہے، یہاں تک کہ بعض فقہانے کہا ہے کہ اگر گواہی کے لئے مکہ میں ہوں تو بہتر ہے خصوصاً کعبہ کے پاس ”رکن“ و ”مقام“ کے درمیان کہ جو بہت ہی مقدس جگہ ہے اور اگر مدینہ میں ہوں تو پیغمبر کے منبر کے پاس یہ شہادت ادا ہو۔

بعد والی آیت میں ایسے مواقع کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں گواہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور انھوں نے حق کے خلاف گواہی دی ہے جیسا کہ آیت کی شان فزول میں بیان ہوا ہے۔ ایسے موقع کے لئے حکم یہ ہے کہ: اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دونوں گواہ گناہ، جرم اور تعدی کے مرتکب ہوئے ہیں اور انھوں نے حق کو پامال کر دیا ہے تو دوسرے دو آدمی اُن لوگوں میں سے لئے جائیں جب پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے یعنی مرنے والے کے ورثا میں سے اور وہ اپنا حق ثابت کرنے کے لئے گواہی دیں گے ﴿فَإِنْ غُثِرَ عَلَىٰ أَكْثَرَهُمَا اسْتَحَقَّ إِثْمًا فَآخَرَانِ يَفْضُلَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأُولَيَانِ﴾ -

مرحوم طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں کہا ہے کہ یہ آیت معنی اور اعراب کے لحاظ سے پیچیدہ قرین اور مشکل قرین آیات قرآن میں سے ہے، لیکن دونکات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس قدر پیچیدہ بھی نہیں ہے

پہلا نکتہ ہے کہ لفظ ”اثم“ (گناہ) کے قرینہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ”استحق“ سے مراد جرم اور دوسرے کے حق پر تجاوز ہے اور دوسرے یہ کہ ”اولیان“ یہاں ”اولان“ کے معنی میں ہے یعنی دو گواہ کہ جنہیں پہلے گواہی دینا چاہیے تھی اور اب وہ راہ راست سے منحرف ہو گئے ہیں، بنا بریں آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ اگر کوئی ایسی اطلاع مل جائے کہ پہلے والے دو گواہ غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں تو دو افراد ان کی جگہ لے لیں گے یہ دو گواہ ان لوگوں میں ہوں گے کہ جن پر پہلے دو گواہوں نے زیادتی اور تجاوز کیا ہے^(۲)

آیت کے ذیل میں دوسرے دو گواہوں کی ذمہ داری یوں بیان کی گئی ہے: خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو افراد کی گواہی کی نسبت زیادہ صحیح اور حق کے زیادہ قریب ہے اور تجاوز اور کسی ظلم و ستم کے مرتکب نہیں ہوں گے اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ظالموں میں سے قرار پائیں گے ﴿فَيَقْسِمَانِ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَا إِنَّا إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ﴾ -

حقیقت میں مرنے والے کے اولیاء پہلے سے اس کے مال و متاع کے بارے میں مسافرت کے وقت یا مسافرت کے علاوہ جو کچھ جانتے ہیں اس کی بنیاد پر گواہی دیں گے کہ پہلے دو گواہ ظلم و خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور یہ گواہی مشاہدہ و حس کی بنا پر ہے نہ کہ حدس و قرائن کی رو سے۔

زیر بحث آیت کے آخر میں در حقیقت ان احکام کا فلسفہ بیان ہو رہا ہے جو شہادت کے سلسلے میں پہلی آیات میں گزر چکے ہیں کہ اگر اُپر والے حکم کے مطابق عمل ہو یعنی دونوں گواہوں کو نماز کے بعد جماعت کی موجودگی میں گواہی کے لئے طلب کریں اور ان کی خیانت ظاہر ہونے کی صورت میں دوسرے افراد و رثاء میں سے ان کی جگہ لے لیں اور حق کو واضح کریں تو یہ لائحہ عمل اس بات کا سبب بنے گا وہ گواہ گواہی کے معاملے میں غور و خوض سے کام لیں گے اور خدا کے خوف یا خلق خدا کے ڈر سے واقع کے مطابق گواہی دیں گے ﴿ذَلِكَ أَذْنٰی اَنْ يَّاتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰی وُجُوْهِهَا اَوْ يَخَافُوْا اَنْ تُرَدَّ اِيْمَانٌۢ بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ -

در حقیقت یہ کام اس بات کا سبب بنے گا کہ اُن میں خدا کے سامنے یا بندگانِ خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ باز پرس کا خوف پیدا ہو جائے گا اور وہ حق کے مرکز سے روگرداں نہ ہوں -

آیت کے آخر میں تمام گزشتہ احکام کی تاکید کے لئے ایک حکم دیا گیا ہے:

پرہیزگاری اختیار کرو اور فرمان خدا کا ان لگا کر سنو اور یہ جان لو کہ خدا فاسق گروہ کو ہدایت نہیں کرتا ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ -

۱- سورہ عنکبوت، آیت ۴۵-

۲- اس بنا پر اعراب کے لحاظ سے ”آخران“ بتدا ہے اور ”يُفَوِّمَانِ مَقَامَهُمَا“ خبر ہے اور ”اولیان“ ”استحق“ کا فاعل ہے ”الَّذِيْنَ“ و رثاء کے معنی میں ہے جن پر ظلم ہوا ہے اور جار و مجرور ”مِنَ الَّذِيْنَ“ کا ”آخران“ کی صفت ہوگا (غور کیجیے)

۱۰۹ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾

ترجمہ:

۱۰۹۔ اُس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور انہیں کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے ہمیں تو پتہ نہیں تو خود تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا

یہ آیت حقیقت میں گزشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ گزشتہ آیات کے ذیل میں جو حق و باطل کی شہادت کے مسئلہ کے ساتھ مربوط تھیں، تقویٰ اور حکم خدا کی مخالفت سے ڈرنے کا حکم دیا گیا تھا، اس آیت میں کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور اُن سے رسالت اور ان کی ماموریت کے بارے میں سوال کرے گا اور اُن سے کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ﴾۔

وہ اپنے کسی بھی قسم کے ذاتی علم کی نفی کرتے ہوئے تمام حقائق کو علم پروردگار کے ساتھ وابستہ کر کے کہیں گے: خداوند! ہمیں کوئی علم نہیں ہے تو ہی تمام پوشیدہ اور چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہ ہے ﴿قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾۔ اسی طرح تمہارا ایسے علام الغیوب خدا اور ایسی عدالت سے سامنا ہوگا، اسی لئے تم اپنی گواہیوں میں حق و انصاف کو ملحوظ نظر رکھو^(۱) یہاں پر دو سوال سامنے آتے ہیں:

پہلا: یہ کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و مرسلین (علیہ السلام) اپنی اُمت کے گواہ اور شاہد ہیں جب کہ اوپر والی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے علم کی نفی کرتے ہیں اور تمام چیزوں کو خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ مرحلوں کے ساتھ مربوط ہیں، پہلے مرحلہ میں جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہے انبیاء علیہم السلام نے پروردگار کے سوال کے جواب میں اظہارِ ادب کیا اور اپنے آپ سے علم کی نفی کی ہے اور تمام چیزوں کو خدا کے علم سے وابستہ کیا ہے، لیکن بعد کے مرحلوں میں اپنی اُمت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اس کو واضح کریں گے اور اس کی گواہی دیں گے، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے کہ بعض استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کے سوال کا جواب دو

اور شاگرد پہلے تو اظہار ادب کے طور پر اپنے استاد کے علم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر قرار دیتا ہے اور پھر جو کچھ وہ جانتا ہے اسے بیان کرتا ہے۔

دوسرا: یہ کہ انبیاء علیہم السلام اپنے سے علم کی نفی کیسے کریں گے حالانکہ وہ عام عادی علم کے علاوہ بہت سے مخفی پروردگار کی تعلیم کے ذریعے جانتے ہیں۔ اگرچہ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے طرح طرح کی بحثیں کی ہیں لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق یہ بات بالکل واضح و روشن ہے کہ یہاں پر انبیاء علیہم السلام کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو خدا کے علم کے مقابلے میں ہیج سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے، ہماری ہستی اس کی بے پایاں ہستی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے اور ہمارا علم اس کے علم کے سامنے کوئی علم ہی شمار نہیں ہوتا اور خلاصہ یہ ہے کہ ”ممکن“ جو کچھ بھی ہو ”واجب“ کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا علم و دانش اپنے مقام پر بہت زیادہ ہے لیکن جب اس کا قیاس علم پروردگار کے ساتھ کیا جائے گا تو وہ کوئی شمار نہیں ہوگا۔

حقیقت میں عالم واقعی وہ ذات ہے کہ جو ہر جگہ اور ہر وقت حاضر و ناظر ہو اور تمام ذرات عالم کے ایک دوسرے سے وصل و بیوند سے باخبر ہو اور جہان کی تمام خصوصیات سے کہ جو ایک وحدت کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہ صفت صرف خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت پیغمبروں اور اماموں سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کیونکہ علم غیب ذاتی طور پر تو اُسے علم غیب دیا اتنا ہی وہ جانتا ہے، قرآن کی متعدد آیات اس چیز کی گواہ ہیں کہ جن میں سے سورہ جن کی آیت ۲۶ میں ہے:

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا، إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾

”خداوند تعالیٰ عالم الغیب ہے اور سوائے ان رسولوں کے کہ جنہیں اس نے برگزیدہ کیا اور کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا“ نیز سورہ ہود کی آیت ۴۹ میں ہے: ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ﴾

”یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں“

ان آیات اور ان جیسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب ذات خدا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے لیکن جس شخص کے لئے وہ جتنا مصلحت سمجھتا ہے اسے تعلیم دیتا ہے اور اس کی کمیت و کیفیت اس کی خواہش اور مشیت سے مربوط ہے۔

آیت ۱۱۰

۱۱۰ ﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِأَمْرِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِأَمْرِي وَثُبْتُ الْأَعِصَىٰ عَلَىٰ يَدَيْكَ وَأَلَبَّسْتُكِ آلَافَ بَرَصَ بِأَمْرِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِأَمْرِي وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾

ترجمہ:

۱۱۰۔ وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ بن مریم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے جب میں نے روح القدس کے ذریعے تیری تقویت کی کہ تو گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے گفتگو کرتا تھا، اور جب میں نے تجھے کتاب و حکمت اور توریت و انجیل کی تعلیم دی اور جب کہ تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا اور اُس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور مادر زاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا تھا اور مردوں کو (بھی) تو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھے اذیت و تکلیف پہنچانے سے باز رکھا جب تو ان کے پاس واضح دلائل لے کر آیا تھا لیکن اُن میں سے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

۱۔ جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب کے لحاظ سے ”یوم“ تقوا کا مفعول ہے کہ جو اس کی تقدیر ہے اور پہلی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

مسیح (علیہ السلام) پر انعامات الہی

یہ آیت اور سورہ مائدہ کے آخر تک بعد والی آیات حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سرگزشت اور ان انعامات سے مربوط ہیں جو آنجناب (علیہ السلام) اور ان کی اُمت کو بخشی گئیں اور وہ یہاں پر مسلمانوں کی بیداری اور آگاہی کے لئے بیان ہوئی ہیں پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ (علیہ السلام) ابن مریم سے فرمایا کہ تم اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ﴾۔

اس تفسیر کے مطابق اوپر والی آیات ایک مستقل بحث شروع کر رہی ہیں جو مسلمانوں کے لئے تربیتی پہلو رکھتی ہے اور اس کا اسی دنیا کے ساتھ ربط ہے، لیکن بعض مفسرین مثلاً طبرسی، بیضاوی اور ابو الفتوح رازی نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کا ضمیمہ ہے اور اس کا ربط ان سوالات اور باتوں سے ہے جو خداوند تعالیٰ قیامت کے دن پیغمبروں سے کرے گا اور اس بنا پر ”قَالَ“ جو فعل ماضی ہے یہاں ”یَقُولُ“ یعنی فعل مضارع کے معنی میں ہوگا، لیکن یہ احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہے، خاص طور پر جبکہ معمول یہ ہے کہ کسی کے لئے نعمتوں کا شمار کرنا اس میں روح شکرگزاری زندہ کرنے کی غرض سے ہوتا ہے، جبکہ قیامت میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ اس کے بعد اپنی نعمات کا ذکر شروع کر دیا ہے، پہلے کہتا ہے: میں نے تجھے روح القدس کے ذریعے تقویت دی ہے ﴿إِذْ أَيْدُتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾۔

روح قدس کے معنی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے^(۱)

خلاصہ یہ کہ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وحی لانے والا فرشتہ یعنی جبریل ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہی غیبی طاقت ہو جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو معجزے دکھانے اور رسالت کے کام سرانجام دینے کے لئے تقویت دیتی تھی اور یہ چیز انبیاء (علیہ السلام) کے علاوہ دوسروں میں بھی ضعیف تر درجہ موجود ہوتی ہے۔ نعمات الہی میں سے دوسری نعمت تجھ پر یہ ہے کہ روح القدس کی تائید کے ذریعے تو گہوارے میں اور پختہ کار ہو کر گفتگو کرتا تھا (تَكَلَّمَ النَّاسُ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا)۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تیری گہوارہ کی باتیں بھی بڑے ہونے کے بعد کی باتوں کی مانند پختہ اور چچی تلی ہوتی تھیں اور وہ بچوں کی طرح بے وزن نہیں ہوتی تھیں۔

تیسری نعمت یہ کہ میں نے تجھے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی ﴿وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾۔ کتاب کے ذکر کے بعد تورات و انجیل کا تذکرہ ہے جبکہ وہ بھی آسمانی کتابوں میں سے ہیں حقیقت میں اجمال کے بعد تفصیل کی صورت میں ہے۔

چوتھی نعمت یہ ہے کہ تو میرے حکم سے پرندے کی شکل کی ایک چیز مٹی سے بناتا تھا اس کے بعد اس میں پھونکتا تھا تو وہ میرے حکم سے ایک زندہ پرندہ ہو جاتی تھی ﴿وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِأَذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِأَذْنِي﴾۔ پانچویں نعمت یہ ہے کہ تو میرے اذن سے مادر زاد واندھے اور برص کی بیماری میں مبتلا شخص کو شفا دیتا تھا ﴿وَتُبْرِئُ الْأَكْمَةَ وَالْأَبْرَصَ بِأَذْنِي﴾۔ اور بالآخر میری نعمتوں میں سے ایک اور نعمت تجھ پر یہ تھی کہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھے پہنچانے سے اس وقت باز رکھا جبکہ ان کے کافر تیرے واضح اور روشن دلائل کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور

انہیں کھلا جادو کہنے لگے، میں نے اس تمام شور و غل اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلے میں تیری حفاظت کی تاکہ تو اپنی دعوت کو آگے بڑھا سکے ﴿وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾۔

یہاں پر ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں چار مرتبہ لفظ ”بإذنی“ (میرے حکم سے) دہرایا گیا ہے تاکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لئے غلو اور دعائے الوہیت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے، یعنی جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اگرچہ بہت عجیب و غریب اور حیرت انگیز تھا اور خدائی کاموں کے ساتھ شبہا بہت رکھتا تھا لیکن اُن میں سے کام خود عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف سے نہیں تھا کہ بلکہ یہ سب کام خدا کی طرف سے انجام پذیر ہوتے تھے، وہ ایک بندہ خدا تھے اور خداوند تعالیٰ کے تابع فرمان تھے اور ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ خدائے لایزال کی قدرت سے تھا۔

ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ یہ تمام نعمتیں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ مربوط تھیں تو اس آیت میں ان نعمتوں کو ان کی والدہ جناب مریم (علیہ السلام) کے لئے بھی نعمت کیوں شمار کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ جو نعمت بیٹے تک پہنچتی ہے وہ حقیقت میں اس کی ماں کو بھی پہنچتی ہے کیونکہ دونوں ایک اصل سے ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخ اور جڑ ہیں۔

ضمنی طور پر جیسا کہ ہم سورہ آل عمران کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں یہ آیت اور اسی قسم کی آیات اولیاء خدا کی ولایت تکوینی کے واضح دلائل میں سے ہیں کیونکہ مسیح (علیہ السلام) کے قصے میں مردوں کو زندہ کرنے، مادر زاد اندھوں اور لاعلاج بیماروں کو شفا دینے کو مسیح (علیہ السلام) کی ذات کی طرف منسوب کیا گیا ہے البتہ اذن و فرمان خدا کے ساتھ۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات عین ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ عالم تکوین میں تصرف کرنے کے لیے اس قسم کی قدرت کسی شخص کے اختیار میں دے دے کہ وہ کبھی اس قسم کے اعمال انجام دے لیا کرے اور اس آیت کی تفسیر انبیاء کے دعا کرنے اور خدا کی طرف سے ان کی دعا قبول ہونے کے ساتھ کرنا مکمل طور پر ظواہر آیات کے خلاف ہے۔ البتہ اولیاء خدا کی ولایت تکوینی سے ہماری مراد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جسے ہم اُپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس مقدار سے زیادہ کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے جلد دوم کی طرف رجوع کریں۔

آیات ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵

۱۱۱ ﴿وَإِذْ أُوحِثْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾

۱۱۲ ﴿إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ

مُؤْمِنِينَ﴾ -

۱۱۳ ﴿قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ -

۱۱۴ ﴿قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا

وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ -

۱۱۵ ﴿قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدَ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۱ - اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے پر ایمان لاؤ۔ تو

انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں -

۱۱۲ - وہ وقت کہ جب حواریوں نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تیرا پروردگار آسمان سے مائدہ نازل کر سکتا ہے تو

اُس نے (جواب میں) کہا اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو -

۱۱۳ - وہ کہنے لگے (ہم یہ بات بُری نیت سے نہیں کہتے بلکہ) ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل

(آپ کی رسالت پر) مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچی بات کہی ہے اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں -

۱۱۴ - عیسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے خدا! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما، تاکہ وہ

ہمارے اوّل و آخر کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما، تو بہترین روزی دینے

والا ہے -

۱۱۵ - خداوند تعالیٰ نے (اس کی دعا قبول فرمائی اور) کہا: میں اُسے تم پر نازل کروں گا، لیکن جو شخص تم میں سے اس

کے بعد کافر ہو جائے گا (اور وہ انکار کی راہ اختیار کرے گا) اُسے میں ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے ویسی سزا کسی کو نہ

دی ہوگی -

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

اس بحث کے بعد جو مسیح (علیہ السلام) اور ان کی والدہ کے بارے میں نعمات الہی کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے ان آیات میں اُن نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزدیکی اصحاب و انصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے، اُس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح (علیہ السلام) پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا! گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں

﴿وَ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَ بِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَ أَشْهَدُ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ﴾۔

البتہ یہ بات ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ لفظ وحی قرآن کریم میں ایک وسیع معنی کا حامل ہے اور ان وحیوں میں منحصر نہیں ہے کہ جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہیں بلکہ وہ الہام بھی جو مختلف افراد کے دلوں پر ہوتے ہیں اس کے مصداق ہیں اور اسی لیے مادر موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں (سورہ قصص آیت ۷ میں) وحی کا لفظ آیا ہے۔^(۱) یہاں تک کہ حیوانات کے طبعی و فطری الہامات کے لیے بھی قرآن میں لفظ وحی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھیوں کے لیے ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے وہ وحی مراد ہو جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ذریعے اور معجزات کی شکل میں ان کی طرف بھیجی جاتی تھی، ہم نے حواریوں کے بارے میں یعنی حضرت عیسیٰ کے اصحاب اور شاگردان خاص کے لیے جلد دوم صفحہ ۳۳۷ پر بحث کی ہے۔^(۲)

اس کے بعد ماندہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لیے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے؟ ﴿إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رُبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ﴾۔

”ماندہ“ لغت میں خوان، دسترخوان اور طبق کو بھی کہا جاتا ہے اور اُس غذا کو بھی کہتے ہیں جو اُس میں رکھی ہوئی ہو، اصل میں یہ ”مید“ کے مادہ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی حرکت دینے اور ہلانے کے ہیں اور شاید دسترخوان اور غذا پر ماندہ کا اطلاق اس نقل و انتقال کی وجہ سے ہی جو اُن میں صورت پذیر ہوتا رہتا ہے۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے معجزات و آیات دکھانے کے باوجود شک اور تردید کی بو آ رہی تھی، غور کیا اور انھیں تنبیہ کی اور کہا کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو ﴿قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنُتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ -

لیکن انھوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بتادیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کئے کھانے سے نورانیت ہمارے دل میں پیدا ہوگی، کیونکہ غذا مسلسلہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم علم الیقین کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تاکہ ہم اس پر گواہی دے سکیں

﴿قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتُنَا وَعَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ -

جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان کے اس مطالبہ میں ان کی حُسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا کہ خداوند ہمارے لیے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول و آخر کے لئے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین رزی رساں ہے ﴿قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ﴾ -

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی و عمومی مصلح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے -

خداوند تعالیٰ نے اس دعا کو کہ جو حُسن نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول کر لیا اور اُن سے فرمایا کہ: میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اُسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی ﴿قَالَ اللَّهُ إِنَّي مُنْزِلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ﴾ -

چند ضروری نکات کی یاد دہانی

ان آیات میں چند ایسے نکات ہیں کہ جن کا مطالعہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ ماندہ کے مطالبہ سے کیا مراد تھی؟

اس میں تو شک نہیں ہے کہ حواریں اس درخواست میں کوئی بُرا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور ان کا مقصد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلے میں ہٹ دھرمی کرنا نہیں تھا بلکہ مزید اطمینان کی جستجو تھا تاکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں جو شکوک و شبہات اور دسو سے باقی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مطلب کو استدلال کے ذریعے یہاں تک کہ کبھی کبھی تجربہ کی بنیاد پر بھی ثابت کر لیتا ہے لیکن جب مسئلہ زیادہ اہم ہوتا ہے تو بہت سے دسو سے اور شکوک و شبہات اس کے دل کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں لہذا اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یا تو بار بار کے تجربے اور آزمائش کے ذریعے اور یا استدلال علمی کو عینی مشاہدات کے ساتھ بدل کر شکوک و شبہات اور دسوسوں کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) باوجود اس کے کہ وہ ایمان و یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے پھر بھی خداوند تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ مسئلہ معاد کا اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کریں تاکہ ان کا وہ ایمان جو آزر وئے علم تھا ”عین الیقین“ اور شہود سے بدل جائے۔

لیکن اس سبب سے کہ حواریوں کے مطالبہ کا ظاہری طور پر جو مطلب نکلتا تھا وہ چھبتا ہوا معلوم ہوتا تھا لہذا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسے بہانہ جوئی پر محمول کیا اور ان پر اعتراض کیا، لیکن جب انہوں نے کافی وضاحت کے ساتھ اپنا مقصد روشن کر دیا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بھی ان کی بات کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ ”هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ“ سے کیا مراد ہے؟

مسئلہ طور پر ابتدا میں یہ جملہ یہی معنی دیتا ہے کہ حواریں نزول ماندہ کے سلسلے میں قدرت خدا میں شک رکھتے تھے لیکن اس کی تفسیر میں اسلامی مفسرین کے بعض بیانات جالب نظر ہیں، پہلا یہ کہ یہ درخواست انہوں نے ابتدائے کار میں کی تھی، جبکہ وہ مکمل طور پر صفات خداوندی سے آشنا نہیں ہوئے تھے، دوسرا یہ کہ ان کی مراد یہ تھی کہ کیا خداوند تعالیٰ کے نزدیک اس میں مصلحت ہے کہ وہ اس قسم کا ماندہ ہم پر نازل کر دے، جیسا کہ مثال کے طور پر ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ میں اپنی ساری دولت فلاں شخص کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا، یعنی میں اس میں مصلحت نہیں سمجھتا، نہ یہ کہ میں قدرت نہیں رکھتا، تیسرا یہ کہ ”یستطیع“ کا معنی ”یستحیب“ ہو، کیونکہ مادہ طوع کا معنی انقیاد و مطیع ہونا ہے اور جب وہ باب (استفعال) میں چلا جائے تو پھر اس سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر اس جملے کا یہ معنی ہوگا کہ کیا تیرا پروردگار ہماری اس بات کو قبول کرے گا کہ آسمانی ماندہ ہم پر نال کرے۔

۳۔ یہ آسمانی ماندہ کیا تھا؟

یہ آسمانی ماندہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں کہ جن میں سے ایک حدیث امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔ شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے سُن رکھا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر ماندہ آسمانی اُترا تھا۔ لہذا انھوں نے بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

۴۔ کیا ان پر کوئی ماندہ نازل ہوا؟

باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا آیات نزول ماندہ کو تقریباً صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے نزول ماندہ کی تردید کی ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ جب حواریں نے نزول ماندہ کے بعد سخت ذمہ داری کا احساس کیا تو انھوں نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا لیکن حق بات یہ ہے کہ ماندہ ان پر نازل ہوا۔

۵۔ عید کسے کہتے ہیں؟

عید لغت میں مادہ عود سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی بازگشت (لوٹ آنا) کے ہیں، اسی لئے اُن دنوں کو جن میں کسی قوم و ملت کی مشکلات برطرف ہو جاتی ہیں اور وہ پہلے جیسی کامیابیوں اور راحتوں کی طرف پلٹ آتی ہے، عید کہا جاتا ہے، اسلامی عیدوں کو اس مناسب سے عید کہا جاتا ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں ایک مہینے کی اطاعت کے بعد یا حج کا عظیم فریضہ انجام دینے کی وجہ سے روح میں پہلی سی فطری صفائی اور پاکیزگی لوٹ آتی ہے اور وہ آلودگیاں جو خلاف فطرت ہیں ختم ہو جاتی ہیں، چونکہ نزول ماندہ کا دن کامیابی، پاکیزگی اور خدا پر ایمان لانے کی طرف بازگشت کا دن تھا لہذا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس کا نام عید رکھا، جیسا کہ روایات میں آیا ہے ماندہ کا نزول اتوار کے دن ہوا تھا لہذا شاید عیسائیوں کے نزدیک اتوار کے احترام کی علتوں میں سے ایک علت یہ بھی ہو۔

حضرت علی علیہ السلام سے نقل شدہ ایک روایت میں ہے کہ:

”وکل يوم لا يعصى الله فيه فهو يوم عید“

”یعنی ہر وہ دن کہ جس میں خداوند تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے وہ عید کا دن ہے“ (۳)

یہ بھی اس امر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ گناہ کو چھوڑنے کا دن کامیابی، پاکیزگی اور فطرت اولیہ کی طرف لوٹنے کا دن ہے۔

۶۔ عذاب شدید کس بنا پر تھا؟

یہاں پر ایک اہم نکتہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ جب ایمان مرحلہ شہود اور عین الیقین کو پہنچ جائے یعنی حقیقت کو آنکھ سے دیکھ لے اور کسی قسم کے تردد اور وسوسے کی گنجائش باقی نہ رہے تو پھر ایسے شخص کی ذمہ داری اور مسئولیت بہت زیادہ سخت ہو جاتی ہے، کیونکہ اب یہ وہ سابق انسان نہیں ہے کہ جس کا ایمان پایہ شہود پر نہیں تھا اور کبھی کبھار اس میں وسوسے پیدا ہو جاتے تھے، وہ ایمان اور ذمہ داری کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، اب اس کی تھوڑی تقصیر اور کوتاہی بھی مجازات شدید اور سخت سزا کا سبب بنے گی، اسی لیے تو انبیاء اور اولیائے خدا کی مسئولیت بہت سخت تھی اسی طرح کہ وہ ہمیشہ اُس سے وحشت و پریشانی میں رہتے تھے، ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اس قسم کی باتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں، مثلاً اصولی طور پر ہر کسی کو معلوم ہے کہ اُس کے شہر اور علاقے میں کتنی بھوکے ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں اُس سے باز پرس ہوگی، لیکن جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ایک بے گناہ انسان بھوک کی شدت سے فریاد کر رہا ہے تو اب اس کی جوابدہی کی صورت مل جائے گی اور سخت تر ہو جائے گی۔

۷۔ عہد جدید اور مائدہ: موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں، اگرچہ انجیل یوحنا باب ۲۱ میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور اُن کی طرف سے روٹی اور مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے^(۴)

کتاب ”اعمال رسولان“ میں بھی جو ”عہد جدید“ کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر فزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اُس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہذا اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے فزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی^(۵)

۱۔ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا جَفَتْ عَلَيْهِ فَلَأْقِيهِ فِي الْيَمِّ ---- ”ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ اُسے دودھ پلاؤ اور جب اس کے بارے میں تمہیں ڈر ہو تو اُسے دریا میں پھینک دو“

۲۔ اردو ترجمہ میں دیکھئے۔

۳۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۴۲۸۔

۴۔ الہدی الی دین المصطفیٰ، ج ۲، ص ۲۴۹۔

۵۔ حوالہ سابقہ۔

آیات ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸

۱۱۶ ﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّي إِهْنِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾-

۱۱۷ ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾-

۱۱۸ ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾-

ترجمہ:

۱۱۶۔ وہ وقت یاد کرو جب خداوند تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو خدا بنالو، وہ جواب دیں گے کہ تیری ذات پاک ہے، مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے، اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا۔ تو ان سب باتوں کو جاننا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں، لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے اُسے نہیں جانتا کیونکہ تو تمام اسرار اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

۱۱۷۔ مجھے تو نے جس کام پر مامور کیا تھا اُس کے سوا اُن سے اور کوئی بات نہیں کہی تھی۔ میں نے تو اُن سے یہی کہا تھا کہ اُس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی اُن کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ اُن کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو پھر تو ہی اُن کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔

۱۱۸۔ (اس صورت میں) اگر تو انھیں سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں (اور وہ تیری عدم حکمت کی نشانی ہے اور نہ ہی تیری بخشش کمزوری کی علامت ہے)۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اپنے پیروکاروں کے شرک سے بیزاری

یہ آیات قیامت کے دن حضرت مسیح (علیہ السلام) سے گفتگو کے بارے میں ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بعد کی چند آیات میں ہے کہ: ﴿هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴾

”آج کا دن وہ دن ہے کہ جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی“
اور یہ بات مسلم ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کے علاوہ ﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ کا جملہ اس پر دوسری دلیل ہے کہ یہ گفتگو مسیح (علیہ السلام) کی نبوت و رسالت کا زمانہ گزرنے کے بعد کی ہے اور آیت کی ابتدا ”قال“ کے جملے ساتھ کرنا کہ جو فعل ماضی کے لیے ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا، کیونکہ قرآن مجید میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ قیامت سے مربوط مسائل زمان ماضی کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں اور یہ چیز قیامت کے قطعی و یقینی ہونے کی دلیل ہے یعنی اس کا زمانہ آئندہ میں واقع ہونا ایسا مسلم ہے گویا کہ وہ زمانہ ماضی میں واقع ہو چکا ہے لہذا اسے فعل ماضی کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

بہر حال پہلی آیت یہ کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہے گا کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ اپنا معبود قرار دو اور ہماری پرستش کرو ﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّي إِلَهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے بلکہ صرف توحید اور عبادت خدا کی دعوت دی ہے، لیکن اس استفہام کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے اُن کی اُمت کے سامنے اقرار لے کر اُن کی اُمت کا جرم ثابت کیا جائے۔

مسیح علیہ السلام اس سوال کے جواب میں انتہائی احترام کے ساتھ چند جملے کہیں گے:

۱۔ پہلے خداوند تعالیٰ کو ہر قسم کے شریک و شبیہ سے پاک کرتے ہوئے کہیں گے: اے خدا! تو ہر قسم کے شریک سے پاک ہے ﴿قَالَ سُبْحَانَكَ﴾۔

۲۔ کس طرح ممکن ہے کہ میں ایسی بات کہوں جو میرے لیے شائستہ اور مناسب نہیں ہے ﴿مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ﴾۔

حقیقت میں نہ صرف اس بات کے کہنے کی وہ اپنے سے نفی کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں اس قسم کا کوئی حق ہی نہیں رکھتا اور اس قسم کی گفتگو میں مرتبہ و مقام کے ساتھ ہرگز سازگار ہی نہیں۔

۳۔ اس کے بعد پروردگار عالم کے علم بے پایاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: میری گواہ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا کیونکہ تو اس سے بھی آگاہ ہے جو میری روح کے اندر ہے جبکہ میں اُس سے بے خبر ہوں جو تیری ذات پاک میں ہے، کیونکہ علام الغیوب ہے اور تمام رازوں اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے ﴿إِنْ كُنْتَ قُلْتُمْ فَقَدْ عَلِمْتُمْ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ - (۱)

۴۔ میں نے جو بات ان سے کہی ہے وہ صرف وہی تھی جس کے لئے تو نے مجھے مامور کیا تھا اور وہ یہ کہ میں انھیں تیری عبادت کی طرف دعوت دوں اور اُن سے کہوں کہ اس خدائے یگانہ کی پرستش کرو کہ جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾ -

۵۔ اور جس وقت تک میں اُن کے درمیان رہا ان کا نگران و گواہ تھا اور میں نے انھیں راہِ شرک اختیار نہیں کرنے دیا، لیکن جب تو نے مجھے اُن کے درمیان سے اٹھالیا تو پھر تو ہی اُن کا نگران و نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ - (۲)

۶۔ ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی حکم تو تیرا چلے گا ہی اور جو تو چاہے گا وہی ہوگا، اب اگر تو انھیں ان کے اس عظیم انحراف پر سزا دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اور وہ تیری سزا سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکیں گے اور تیرا یہ حق تیرے نافرمان بندوں کے لیے ثابت ہے اور اگر تو انھیں بخش دے اور ان کے گناہوں کی طرف سے چشم پوشی کرے تو تو انا و حکیم ہے نہ تو تیری بخشش ہی کمزوری کی علامت ہے اور نہ ہی تیری سزا حکمت و حساب سے خالی ہے ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ -

۱۔ یہاں پر لفظ نفس کا اطلاق روح اور جان کے معنی میں نہیں ہے بلکہ نفس کا ایک معنی ذات ہے (جیسے کہتے ہیں وہ نفس بنفیس آئے)۔

۲۔ ”توفی“ کے معنی کے بارے میں اور یہ کہ اس سے مراد مرنا نہیں ہے، سورہ آل عمران کی آیت ۵۵ کے ذیل میں صفحہ ۲۴۱ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے (جلد ۲، اردو ترجمہ)

دوسوال اور ان کا جواب

۱۔ کیا عیسائیوں کی تاریخ میں کہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ مریم کو اپنا معبود قرار دیتے ہوں۔ یا یہ کہ وہ صرف تثلیث یعنی تین خداؤں ”باپ خدا“، ”بیٹا خدا“ اور ”روح القدس“ کے قائل تھے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے نظریہ کے مطابق ”روح القدس“ ”باپ خدا“ اور ”بیٹا خدا“ کے درمیان واسطہ ہے اور وہ مریم کے علاوہ ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ عیسائی حضرت مریم کو خدا تو نہیں جانتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے اور ان کے مجسمے کے سامنے مراسم عبادت سرانجام دیتے رہے تھے جیسا کہ بت پرست بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے پھر بھی انھیں عبادت میں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور زیادہ واضح الفاظ میں ”اللہ“ بمعنی خدا اور ”الہ“ بمعنی معبود میں فرق ہے، عیسائی جناب مریم کو الہ یعنی معبود جانتے تھے نہ کہ خدا۔

ایک مفسر کی تعبیر کے مطابق اگرچہ کوئی عیسائی فرقہ ”الہ“ اور ”معبود“ کا اطلاق جناب مریم پر نہیں کرتا بلکہ انھیں صرف خدا کی ماں سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے سامنے خضوع خشوع اور مراسم عبادت بجالاتے ہیں، چاہے یہ نام ان کے لیے رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ بیروت میں عیسائیوں کے مجلہ ’مشرق‘ کے ساتویں سال کے نویں شمارے میں پاپ بیوس نہم کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر حضرت مریم کی شخصیت کے بارے میں چند قابل ملاحظہ مطالب منتشر ہوئے تھے اس شمارہ میں پوری صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ مشرقی گرجوں میں بھی مغربی گرجوں کی طرح حضرت مریم کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی مجلہ کے پانچویں سال کے چودھویں شمارے میں ایک مقالہ انتہائی کرملی کے قلم سے لکھا ہوا درج تھا جس میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ حضرت مریم کی عبادت کے مسئلہ کے سلسلہ میں عہد عتیق اور تورات سے بھی کوئی دلیل پیدا کی جائے۔ چنانچہ وہ سانپ (شیطان) اور عورت (حوا) کی دشمنی کی داستان کو مریم کے عنوان سے تفسیر کرتا ہے۔ اس بنا پر حضرت مریم (علیہ السلام) کی پرستش اور عبادت ان میں موجود ہے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) ایسے الفاظ میں جس سے شفاعت کی بو آتی ہے اپنی امت کے مشرکین کے بارے میں کیوں گفتگو کرتے ہیں اور یہ کیوں عرض کرتے ہیں کہ اگر تو انھیں بخش دے تو تو عزیز و حکیم ہے

اس کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ہدف شفاعت ہوتا تو آپ یوں فرماتے کہ ﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْعَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ کیونکہ خدا کا غفور و رحیم ہونا مقام شفاعت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کی عزیز و حکیم کے ساتھ توصیف کر رہے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے شفاعت اور بخشش کی درخواست منظور نہیں ہے بلکہ اس میں اصل ہدف اپنی ذات سے ہر قسم کے اختیار کی نفی کرنا اور معاملہ کو پروردگار کے سپرد کرنا ہے یعنی یہ کام تیرے ہی ہاتھ میں ہے اگر چاہے تو بخش دے اور اگر چاہے تو سزا دے اگرچہ نہ تیری سزا بغیر دلیل کے ہے اور نہ ہی تیری بخشش بغیر علت و سبب کے ہے اور ہر حالت میں تیری قدرت و توانائی سے تو باہر ہی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے درمیان کسی گروہ نے اپنے اشتباہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے توبہ کی راہ اختیار کر لی ہو اور یہ جملہ اُس گروہ کے بارے میں ہو۔

آیات ۱۱۹، ۱۲۰

۱۱۹ ﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ -

۱۲۰ ﴿لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۹ - خدا کہتا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ بخشے گی۔ ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے (درختوں) کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، خدا اُن سے راضی و خوشنود ہوگا اور وہ خدا سے راضی اور خوشنود ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۲۰ - آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا

ہے۔

تفسیر

عظیم کامیابی

روز قیامت خداوند تعالیٰ کی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے گفتگو جس کی تشریح گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے کے ذکر کے بعد اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس گفتگو کے بعد یوں فرماتا ہے: آج کا دن وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی فائدہ دے گی ﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴾ -

یقیناً اس جملے میں صدق و راستی سے مراد دنیا میں گفتار و کردار اور راستی و سچائی ہے جو آخرت میں مفید ہوگی ورنہ آخرت کی سچائی اور راستی جو کہ محل تکلیف ہی نہیں ہے وہ کوئی فائدہ بھی نہیں دے گی اس کے علاوہ اس دن کی تو حالت و کیفیت ہی ایسی ہوگی کہ کوئی شخص سچائی کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہ سکے گا۔ یہاں تک کہ سب ہی گنہگار و خطاکار اپنے اپنے اعمالِ بد کا اعتراف کر لیں گے اور یوں اس دن جھوٹ بولنے کا کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا اور اپنی رسالت کا کام انجام دیا اور سچائی اور درستی کے سوا انہوں نے اور کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے سچے پیرو یا باقی تمام انبیاء علیہم السلام کے سچے پیروکار کہ جو اس دنیا میں سچائی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ وہ اپنے اعمال سے پوری طرح بہرہ مند ہوں گے۔

ضمناً اس جملے سے اجمالی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدق و راستی میں تمام نیکیوں کا خلاصہ آجاتا ہے۔ گفتار میں صداقت و راستی اور عمل میں صداقت و راستی اور قیامت کے دن صرف صداقت و راستی ہی وہ سرمایہ ہے کہ جو کام آئے گا اس کے علاوہ اور کچھ کام نہیں آئے گا۔

اس کے بعد سچوں کو ملنے والی جزا کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے: ان کے لیے بہشت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے ﴿هُمْ جَنَّاتٌ بَجْرٍ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾۔

اور اس مادی نعمت سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں بہشت کے باغوں کا اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد خدا کی اپنے بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی کی نعمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد ﴿ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ کا جملہ ہے اس سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ طرفین کی یہ رضایت و خوشنودی کس قدر اہمیت کی حامل ہے (خدا کی بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی)۔

کیونکہ عین ممکن ہے کہ انسان اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں میں غرق ہو لیکن جب وہ یہ احساس کرے گا کہ اس کا مولیٰ اور اس کا معبود و محبوب اس سے ناراض ہے تو وہ تمام نعمتیں اس کی روح کے لئے تلخی اور اذیت کا سبب بن جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کو ہر چیز میسر ہو لیکن جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ اُس پر راضی و قانع نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تمام نعمتیں اس کیفیت کے ساتھ سب سے اس کو خوش بخت نہیں رکھ سکتیں اور اُسے اندرونی تکلیف ہمیشہ آزار میں رکھے گی اور روحانی اطمینان جو کہ سب سے بڑی نعمت الہی اُس سے چھین لے گی۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی سے خوش ہوگا تو جو کچھ وہ چاہے گا خدا اُسے دے گا اور جب یہ اُس کو وہ کچھ دے دے، جو وہ چاہتا ہے تو وہ بھی اُس سے خوش ہوگا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ خدا انسان سے خوش ہو اور وہ بھی اپنے خدا سے راضی ہو۔

آخری آیت میں آسمانوں، زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے پر خدا کی حاکمیت و مالکیت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اس کی قدرت کی عمومیت تمام چیزوں پر بیان ہوئی ہے ﴿اللَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ -

یہ تذکرہ حقیقت میں خدا سے بندوں کی رضا و خوشنودی کی دلیل اور علت کے عنوان سے آیا ہے کیونکہ جو ہستی تمام چیزوں پر قدرت رکھتی ہو اور جو سراسر عالم ہستی پر حکومت رکھتی ہو وہ قدرت رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے بندے اس سے چاہیں وہ انھیں بخش دے اور انھیں خوشنود و راضی کرے -

ضمنی طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں مریم کی پرستش کے سلسلے میں عیسائیوں کے عمل کے غلط ہونے کی طرف اشارہ ہو کیونکہ عبادت کے لائق تو صرف وہ ذات ہے جو سراسر عالم آفرینش پر حکمران ہو نہ کہ مریم جو کہ مخلوق ہونے کے علاوہ کچھ نہیں -

یہاں پر سورہ مائدہ کی تفسیر اختتام کو پہنچتی ہے

سورہ انعام

فضیلت تلاوت سورہ انعام

شرک کی مختلف اقسام اور بت پرستی کے خلاف جہاد

کہا جاتا ہے کہ یہ انہتر واں (۶۹) سورہ ہے جو مکہ میں پیغمبر پر نازل ہوا، البتہ اس کی چند آیات کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان روایات سے جو اہلبیت (علیہ السلام) کے طریقہ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تمام آیات ایک جگہ نازل ہوئی ہیں، اس بنا پر وہ سب کی سب - ”مکی“ ہوں گی۔

اس سورہ کا بنیادی ہدف اور مقصد دوسری مکی سورتوں کی طرح ہی تین اصولوں ”توحید“ ”نبوت“ اور ”قیامت“ کی طرف دعوت دینا ہے، لیکن سب سے پڑھ کر اس میں مسئلہ توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کیا گیا ہے اور وہ اس طور پر کہ اس سورہ کی آیات کے اہم حصہ میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہی ہے اور اسی مناسبت سے بعض اوقات بحث کا سلسلہ مشرکین کے اعمال و کردار اور بدعت تک پہنچ جاتا ہے۔

بہر حال اس سورہ کی آیات میں تدبر و تفکر جو انتہائی جاندار اور واضح اور روشن دلائل پر مشتمل ہے، انسان کے اندر روئے توحید و خدا پرستی کو زندہ کرتا ہے اور شرک کی بنیادوں کو اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے، شاید اسی معنوی وابستگی اور مسئلہ توحید کی باقی سب مسائل اولویت کی بنیاد پر ہی اس سورہ کی تمام آیات یکجائی طور پر ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہے۔

اور وہ روایات جو اس سورہ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس امر کے سبب سے ہی ہیں ہم بارہا پڑھتے ہیں کہ سورہ انعام کے نزول کے وقت ستر ہزار فرشتہ اسے لے کر نازل ہوئے تھے اور جو شخص اس سورہ پڑھے (اور اس کے سایہ میں اس کی روح سرچشمہ توحید سے سیراب ہو) تو وہ تمام فرشتوں کے لئے طلب مغفرت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سورہ کی آیات میں غور فکر کرنا مسلمانوں میں سے روح نفاق و پر اکندگی کو نکال باہر کرے اور کانوں کو سننے والا، آنکھوں کو دیکھنے والا اور دلوں کو دانا بنادے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس سورہ سے صرف اس کے الفاظ کے پڑھنے پر قناعت کرتے ہیں اور اپنی ذات اور خاص مشکلات کے حل کے لئے طویل و عریض تقریبات اور نشستیں منعقد کرتے ہیں جنہیں ”ختم انعام“ کے نام سے یاد کرتے ہیں، مثال کے طور پر اگر ان تقریبات میں سورہ کے مضامین میں غور فکر کیا جائے تو نہ صرف مسلمانوں

کی شخصی و ذاتی مشکلات حل ہوں گی بلکہ ان کی عمومی مشکلات بھی حل ہو جائے گی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کو ایک ایسا سلسلہ اور اد کے طور سے دیکھتے ہیں کہ جس میں ایسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو راز ہی راز ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہے اور اس کے الفاظ کو پڑھنے کے علاوہ کچھ بھی غور نہیں کرتے، حالانکہ قرآن سارے کا سارا سبق ہے اور مدرسہ، ایک پروگرام ہے اور بیداری، ایک رسالت ہے اور علم و آگاہی۔

آیات ۱، ۲

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾۔

۲ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ ثُمَّ أَنْتُمْ مَمْنُونُونَ﴾۔

ترجمہ:

شروع اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے

۱۔ حمد و ستائش اس خدا کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور نور کو ایجاد کیا لیکن کافر خدا کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اس کی توحید اور یکتائی کی دلیلیں تخلیق کائنات میں ظاہر و عیاں ہیں۔
۲۔ وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اس نے ایک مدت مقرر کی (تاکہ انسان درجہ کمال کو پہنچ جائے) اور حتمی اجل اس کے پاس ہے (اور وہ اس سے آگاہ ہے) اس کے باوجود تم (مشرک لوگ اس کی یکتائی یا اس کی قدرت میں) شک و شبہ رکھتے ہو اور اس کا انکار کرتے ہو۔

وہ خدا جو نور و ظلمت دونوں کا مبدا ہے،

اس سورہ میں خداوند تعالیٰ کی حمد و ستائش کے ساتھ آغاز ہوا ہے۔

پہلے عالم کبیر (آسمان و زمین) اور ان کے نظاموں کی پیدائش کے طرے ق سے اور اس کے بعد ”عالم منعیہ یعنی انسان“ کی آفرینش کے راستہ سے لوگوں کو اصل توحید کی طرف متوجہ کیا گیا، پہلے کہتا ہے: حمد و ستائش اس خدا کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾

وہ خدا جو نور و ظلمت دونوں کا مبدا ہے، دو خداؤں کی پرستش کا عقیدہ رکھنے والوں نظر سے کے برخلاف وہی تنہا تمام چیزوں کے پیدا کرنے والا ہے۔

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ لیکن مشرکین و کفار بجائے اس کے کہ اس نظام واحد سے توحید کا سبق حاصل کریں اپنے پروردگار کے لئے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں ﴿ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾^(۱)

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مشرکین کے عقیدہ کو لفظ ”ثم“ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے و کہ لغت عرب میں (ترتیب با فاصلہ کے لئے) بولا جاتا ہے اور اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہا بتدائیں تمام نوع بشر میں توحید ایک اصل فطری اور عقیدہ عمومی کی حیثیت سے موجود تھی اور شرک بعد میں اس اصل فطری سے ایک انحراف کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔

اس بارے میں کہ آسمان و زمین کی پیدائش کے سلسلہ میں لفظ ”خلق“ اور نور و ظلمت کے بارے میں لفظ ”جعل“ کیوں استعمال کیا گیا ہے، مفسرین نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں، لیکن وہ بات جو ذہن سے زیادہ قریب معلوم تر ہوتی ہے یہ ہے کہ خلقت کسی چیز کے اصل وجود کے بارے میں اور جعل ان خواص و آثار کے بارے میں و کیفیات کے بارے میں ہوتا ہے جو اس کے بعد وجود پیدا کرتے ہیں۔ کیوں کہ نور و ظلمت تبعی پہلو رکھتے ہیں اس لئے انھیں جعل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ آیت حقیقت میں تین قسم کے انحراف کرنے والے گروہوں کو جواب دے رہی ہے، پہلا گروہ مادہ پرستوں کا ہے جو دنیا کو ازلی ”قدیمی“ سمجھتے تھے اور خلق و آفرینش کے منکر تھے، دوسرا گروہ دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کا ہے جو نور و ظلمت کو دو مستقل مبدا قرار دیتے تھے، تیسرا گروہ مشرکین عرب کا ہے جو خدا کے لئے شریک و شبیہ کے قائل تھے یہ ان کا رد بھی ہے۔

۱۔ یعدلون، مادہ عدل (بروزن حفظ) سے ہے جس کے معنی مساوی اور ہم وزن کے ہیں اور یہاں شریک و شبیہ کا قائل ہونے کے معنی میں ہے۔۔

کیا تاریکی بھی مخلوقات میں سے ہے

اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نور خدا کی مخلوق ہے اسی طرح ظلمت بھی اس کی مخلوق ہے، حالانکہ فلسفہ اور علم طبیعیات کے علماء میں یہ مشہور ہے کہ ”ظلمت“ عدم نور کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ معدوم کو مخلوق کا نام نہیں دیا جاسکتا اس بنا پر زیر بحث آیت میں ظلمت کو کس طرح خدا کی مخلوق شمار کیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ظلمت ہمیشہ ظلمت مطلقہ کے معنی میں نہیں ہوتی، بلکہ زیادہ تر فراوان وقوی نور کے مقابل میں بہت کم اور ضعیف نور کے لئے بھی ظلمت کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً ہم سب کہتے ہیں ”تاریکی رات“ حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ رات میں ظلمت مطلقہ نہیں ہوتی، بلکہ رات کی تاریکی ہمیشہ کم رنگ ستاروں کے نور کی آمیزش رکھتی ہے یا دوسرے منابع نور سے ملی ہوئی ہوتی ہے اس بنا پر آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمہارے لئے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی قرار دی ہے کہ جن میں سے ایک کا نور بہت قوی ہے اور دوسرا کا نور بہت کمزور ہے اور یہ بات واضح و بدیہی ہے کہ اس قسم کی ظلمت مخلوق خدا میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ ظلمت مطلقہ ایک ایسا امر ہے جسے عدم کہا جاتا ہے لیکن کوئی بھی امر معدوم جب مخصوص حالات میں واقع ہو تو حتماً اور یقیناً اس عدم کا سرچشمہ ایک ایک وجودی بھی ہوتا ہے، یعنی وہ چیز جو ظلمت مطلقہ کو مخصوص حالت میں معین اہداف و مقاصد کے لئے وجود میں لاتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ وسائل وجودی سے استفادہ کرے، مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ ایک مخصوص وقت کے لئے کمرے کو ایک عکس ظاہر کرنے کے لئے تاریک کریں، تو اس کے لئے ہم مجبور ہیں کہ کسی تدبیر سے نور کو روکیں تاکہ اس معین وقت میں تاریکی پیدا ہو جائے تو ایسی ظلمت مخلوق ہے (مخلوق بالتبع) اور اصطلاحی طور پر اگرچہ عدم متعلق مخلوق نہیں لیکن عدم خاص وجود ہی ایک حصہ ہے اور وہ مخلوق ہے۔

نور رمز وحدت ہے اور ظلمت رمز پر اکندگی

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہئے یہ ہے کہ یہ آیات قرآن میں نور صیغہ مفرد کے ساتھ ہے اور ظلمت جمع کی صورت میں (ظلمات)۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ظلمت (خواہ حسی ہو یا معنوی) ہمیشہ پر اکندگیوں، جدائیوں اور دوریوں کا سرچشمہ ہوتی ہے جب کہ نور رمز وحدت و اجتماع ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہم گرمی کی کسی رات صحن کے درمیان یا بیابان کے ابدار ایک چراغ روشن کرتے ہیں تو ہر قسم کے جانور تھوڑی سی دیر میں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور باقی زندگی مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے، لیکن جب اس ”چراغ“ کو بجھا دیتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کسی طرف چل دیتا ہے اور سب پر اکندہ

اور منتشر ہو جاتے ہیں، اجتماعی اور معنوی مسائل میں بھی یہی صورت ہے، علم، قرآن اور ایمان کا نور سرمایہ وحدت ہے اور جہل، کفر اور نفاق کی تاریکی پر اکندگی کا سبب ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ خدا پرستی اور توحید کی بنیادوں کو دلوں میں مستحکم کرنے کے لئے پہلے انسان کو عالم کبیر کی طرف متوجہ کرتی ہے اور بعد والی آیت میں عالم صغیر یعنی انسان کی طرف توجہ دلاتی ہے، اس سلسلہ میں انتہائی حیرت انگیز مسئلہ یعنی اس کی خاک اور گیلی مٹی سے پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ﴾

یہ صحیح ہے کہ ہماری خلقت ہمارے ماں باپ سے ہوئی ہے نہ کہ خاک سے لیکن چونکہ سب سے پہلے انسان کی پیدائش خاک اور گیلی مٹی سے ہوئی تھی لہذا ہمیں اسی طرح خطاب کرنا درست ہے۔

اس کے بعد انسان کی عمر کے کمال کو پہنچنے کے مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس کے بعد ایک مدت مقرر کی کہ جس میں انسان روئے زمیں میں پرورش پا کر کمال کو پہنچے ﴿ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا﴾

”اجل“ اصل میں ”دت معین“ کے معنی میں ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری وقت یا موقع کو بھی اجل کہا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ اجل دین آپہنچا یعنی قرض کی ادائیگی کا وقت آخر آپہنچا ہے، یہ جو موت کے آجانے کو اجل کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان کا عمر کا آخری لمحہ اس وقت پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بحث کی تکمیل کے لئے قرآن کہتا ہے: اجل مسمیٰ خدا کے پاس ہے ﴿وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ﴾۔

اس کے بعد کہتا ہے: تم مشرک لوگ اس پیدا کرنے والے کے بارے میں کہ جس نے انسان کو بے قدر و قیمت اور حقیر چیز یعنی گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے اور تمہیں ایسے ایسے حیرت انگیز مرحلوں سے گزارا ہے، شک کرتے ہو اور انکار کا راستہ اختیار کرتے ہو، تم نے بتوں جیسی حقیر مخلوق کو خدا کہا ہم پہلے قرار دیا ہے یا تم مردوں کے زندہ کرنے اور قیامت کے برپا کرنے کے بارے میں خداوند تعالیٰ کی قدرت میں شک و شبہ رکھتے ہو ﴿ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ﴾۔

اجل مسمیٰ کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ”اجل مسمیٰ“ ”اجلا“ آیت میں دو الگ الگ معنی کے لئے ہیں اور یہ جو بعض نے دونوں کو ایک ہی معنی میں لیا ہے تو یہ لفظ ”اجل“ کے تکرار کے ساتھ، خصوصاً دوسری مرتبہ ”مسمیٰ“ کے ہوتے ہوئے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اسی لئے مفسرین نے ان دونوں کے فرق کے بارے میں کتنی بحثیں کیں ہیں لیکن جو کچھ قرآن کریم کی دوسری تمام آیت کے قرینہ سے اور اسی ان روایات سے جو اہل بیت پیغمبر کے وسیلہ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا فرق اس بات میں ہے ”اجل“ اکیلا ہو تو یہ غیر حتمی عمر، مدت اور وقت کے معنی میں ہوتا ہے اور ”اجل مسمی“ حتمی عمر اور معین مدت کے معنی میں ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں ”اجل مسمی“ طبعی موت کو کہتے ہیں اور ”اجل“ وقت سے پہلے آنے والی موت ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بہت سی موجودات اپنی طبعی و فطری ساخت اور ذاتی استعداد و قابلیت کے مطابق ایک طولانی مدت تک باقی رہ سکتی ہے لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس مدت کے دوران کچھ ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جو انہیں ان کی آخری عمر طبعی تک پہنچ دے، مثلاً ایک تیل سے جلنے والا چراغ، اس کے تیل کی مقدار کے پیش نظر ممکن ہے کہ بیس گھنٹے روشنی دینے کی استعداد رکھتا ہو، لیکن ایک آندھی کا جھونکا یا بارش کا چھینٹا یا اس کی یا اس کی نگہداشت نہ کرنا اس کی کوتاہ عمری کا سبب بن جائے۔

اگر چراغ کو کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا نہ ہو اور تیل کے آخری قطرے تک جلتا ہوا خاموش ہو جائے تو وہ اپنی حتمی اجل کو پہنچ گیا ہے اور اگر اس سے پہلے ہی کچھ رکاوٹیں چراغ کی خاموشی کا سبب بن جائیں تو اس کی عمر کی مدت ”اجل غیر حتمی“ کہیں گے۔

ایک انسان کے بارے میں بھی معاملہ اسی طرح ہے، اگر اس کی بقا کے لئے تمام شرائط جمع ہوں اور موانع ہر طرف ہوں تو اس کی ساخت اور استعداد اس بات کی مقتضی ہوگی کہ وہ ایک طولانی مدت تک زندگی بسر کرے، اگرچہ اس مدت میں آخر کار ختم ہو جانا ہے اور اس کی ایک حد ضرور ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ غذا کی بدپرہیزی کے اثر سے یا مختلف چیزوں کی عادت میں مبتلا ہونے یا خودکشی کرنے یا کچھ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے اس مدت سے بہت پہلے ہی مر جائے موت کی پہلی صورت کو ”اجل مسمی“ اور دوسری صورت کو اجل غیر حتمی کہتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں حتمی اجل اس صورت میں ہے جب ہم تمام علل اسباب پر نظر رکھیں اور اجل غیر حتمی اس صورت میں ہے جب صرف مقتضیات کی طرف دیکھیں، ان دونوں طرح کے اجل کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے مطالب واضح ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ صلہ رحمی عمر کو زیادہ اور قطع رحمی عمر کو کم کر دیتی ہے

(یہاں عمر اور اجل سے مراد غیر حتمی اجل مراد ہے)۔

ایک آیت میں ہے کہ: ”فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ“۔
جب ان کی (موت) اجل آتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتی ہے اور نہ آگے^(۱)۔

تو یہاں اجل سے مراد وہی حتمی موت ہے۔

اس بنا پر یہ آیت اس موقع سے مربوط ہے جب انسان اپنی آخری عمر کو پہنچ گیا ہو لیکن وہ موتیں جو قبل از وقت واقع ہو جائیں ان پر اس آیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اور ہر صورت میں اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہئے کہ دونوں اجلیں خدا ہی کی طرف سے معین ہوتی ہیں، ایک مطلق طور پر اور دوسری مشروط اور معلق طریقہ سے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ چراغ بیس گھنٹوں کے بعد بلا شرط خاموش ہو جائے گا، اور یہ بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ اگر آندھی چل پڑی تو دو وہی گھنٹوں کے بعد بجھ جائے گا، یہ بات انسان، قوموں اور ملتوں کے بارے میں بھی اسی طرح ہے، ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص یا فلاں قوم، فلاں مقدار عمر کے بعد قطعی و یقینی طور پر ختم ہو جائی گی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ ظلم و ستم، نفاق و اختلاف اور سہل انگاری و سستی اختیار کریں گے تو اس مدت کے ایک تہائی حصہ میں ہی ختم ہو جائے گی، دونوں اجلیں خدا کی طرف سے ہیں ایک مطلق ہے اور دوسری مشروط۔

امام صادق علیہ السلام سے اوپر والی آیت کے ذیل میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

”ہما اجلان، اجل محتوم و اجل موقوف“

یہ دو قسم کی اجلوں کی طرف اشارہ ہے، اجل حتمی اور اجل مشروط۔

دوسری احادیث میں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی تصریح ہو گئی ہے کہ اجل غیر حتمی (مشروط) آگے پیچھے ہو سکتی ہے لیکن اجل حتمی قابل تغیر نہیں ہے^(۱)۔

آیت ۳

﴿وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ﴾

ترجمہ:

۳۔ اور آسمانوں اور زمینوں میں خدا تو وہی ہے جو تمہاری پوشیدہ باتوں کا بھی جانتا ہے اور آشکار بھی اور جو کچھ تم (انجام دیتے ہو اور) کسب کرتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

تمام چیزوں کا خالق وہی ہے

اس آیت میں توحید اور خداوند تعالیٰ کی یگانگی کے سلسلہ میں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے اور ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو موجودات کی ہر نوع کے لئے علیحدہ علیحدہ خداؤں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ بارش کا خدا، جنگ کا خدا، صلح کا خدا، آسمان کا خدا وغیرہ وغیرہ، کہتا ہے: وہی ہے وہ خدا کہ جس کی الوہیت تمام آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتی ہے۔ ﴿وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ﴾^(۱)

یعنی اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ تمام چیزوں کا خالق وہی ہے تو ان سب کا مدبر و مدیر بھی وہی ہوگا، کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی خالق اور آفریدگار اسے ہی کو جانتے تھے لیکن تدبیر و تصرف بتوں کے ہاتھ سمجھتے تھے۔

آیت انھیں جواب دیتی ہے کہ جو ذات خالق ہے تمام چیزوں میں تدبیر و تصرف بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خداوند تعالیٰ ہر جگہ حاضر ہے، آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے یہ بات بھی نہیں کہ وہ جسم ہے یا اس کا کوئی مکان ہے بلکہ وہ تمام جگہوں پر احاطہ رکھتا ہے۔

یہ بات ضروری ہے کہ جو ہر جگہ حکومت کرتا ہوں اور ہر چیز کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہوں اور وہ ہر جگہ حاضر ہو، وہ تمام اور اسرار اور پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے لہذا بعد والے جملہ میں کہتا ہے کہ: اے سا خدا وہی ہے جو تمہارے پوشیدہ اور آشکار امور کو جانتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے بھی باخبر ہے (يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ)

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ”سر“ و ”جھر“ آیت میں انسانوں کے اعمال اور ان کی نیتوں پر بھی محیط ہے اس بنا پر ”ما تَكْسِبُونَ“ (جو کچھ انجام دیتے ہو) کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ”کسب“ عمل کے نیتوں اور روحانی حالت کے معنی میں اچھے اور برے اعمال کا حاصل ہے، یعنی وہ تمہارے اعمال اور نیتوں سے بھی باخبر ہے

اور ان کے اثرات سے بھی جو یہ اعمال تمہاری روح میں پیدا کرتے ہیں، بہر حال اس جملہ کا ذکر انسانوں کے اعمال کے سلسلہ میں تاکید کے لئے ہوا ہے۔

۱۔ اس جملہ کی ترکیب کے سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ”ہو“ مبتدا ہے اور ”اللہ“ خبر ہے اور فی السموات۔۔۔ کا جار مجرور اس فعل سے متعلق ہے جو لفظ اللہ سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت میں جملہ کا معنی اس طرح ہے ”ہو المنفرد فی السموات بالالوہیۃ“۔

آیات ۲، ۵

۴ ﴿وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ﴾ -

۵ ﴿فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ -

ترجمہ:

۴۔ کوئی نشانی اور آیات خدا میں سے کوئی آیت ان تک نہیں پہنچی مگر یہ کہ وہ ان سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

۵۔ انہوں نے حق کا انکار کر دیا جب کہ وہ ان کی طرف آیا، لیکن جس بات کا وہ مزاق اڑایا کرتے تھے بہت جلد انھیں اس کی اطلاع مل جائے گی اور وہ اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو جائیں گے۔

مشرکین کی تکبر، لاپرواہی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ سورہ انعام میں زیادہ تر روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور قرآن مجید ان کی بیداری اور آگاہی کے لئے طرح طرح کے وسائل و ذرائع سے کام لیتا ہے، یہ آیت اور بہت سی دوسری آیات جو اس کے بعد آئیں گی اسی موضوع سے متعلق ہے۔

اس آیت میں حق اور خدائی نشانیوں کے مقابلہ میں مشرکین کی تکبر، لاپرواہی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ اے سے ہٹ دھرم اور لاپرواہ ہے کہ وہ پروردگار کی نشانیوں میں سے جس نشانی کو بھی دیکھتے ہیں فوراً

اس سے منہ پھیر لیتے ہیں ﴿وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ﴾^(۱)

یعنی ہدایت اور راہ یابی کی سب سے پہلی شرط ہی جو کہ تحقیق و جستجو ہے ان میں موجود نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ حق کو حاصل کرنے کا جوش و ولولہ اور عشق ان میں موجود نہیں ہے، کہ وہ ان پیاسوں کی طرح جو پانی کے پیچھے دوڑتے ہیں، حق کی تلاش میں ہوں، بلکہ اگر صاف و شفاف پانی کا چشمہ بھی ان کے گھر کے سامنے جوش مارنے لگے، تو وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیں اور بالکل اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، خواہ یہ آیات ان کے پروردگار کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو ”رہم“ اور ان کی تربیت و تکامل کے لئے ہی کیوں نہ نازل ہوئی ہو۔

یہ صورت زمانہ جاہلیت اور مشرکین عرب میں ہی منحصر نہیں، اب بھی ہم ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جو صرف ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں لیکن وہ خدا اور مذہب کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے کی ایک لمحہ کے لئے بھی زحمت اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ تو معمولی بات اگر اتفاق سے کوئی کتاب یا تحریر اس سلسلے کی ان کے ہاتھ

میں آجائے تو اس کی طرف نگاہ تک نہیں کرتے، اور اگر کوئی شخص اس کے بارے میں ان سے گفتگو کرے تو وہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے یہ ہٹ دھرم جاہل اور بے خبر لوگ ہیں جو ممکن ہے بعض اوقات عالم کے لباس میں ملبوس ہیں۔ اس کے بعد ان کے اس عمل کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی حالانکہ اگر وہ پروردگار کی آیات اور نشانیوں میں غور و فکر کرتے تو حق کو اچھی طرح دیکھ لیتے اور پہچان لیتے اور اس کو یاد کر لیتے ﴿فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ﴾ اور اس تکذیب اور جھٹلانے کا نتیجہ وہ بہت جلدی پالیں گے اور اس کی خبر کے جس کا انھوں نے مذاق اڑا تھا ان تک پہنچ جائے گی

﴿فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾۔

اوپر والی آیات میں درحقیقت کفر کے تین مراحل کی طرف اشارہ ہوا ہے جس میں مرحلہ بامرحلہ شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

پہلا مرحلہ اعراض و روگردانی کا ہے، اس کے بعد تکذیب اور جھٹلانے کا مرحلہ ہے اور بعد میں حقائق اور آیات خدا کے استہزاء تمسخر اور مذاق اڑانے کا مرحلہ ہے۔

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کفر کی راہ میں کسی ایک مرحلہ پر رکتا نہیں ہے، بلکہ جس قدر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی شدت انکار، عداوت، حق سے دشمنی اور خدا سے بے گانگی میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ آیت کے آخر میں جو تہدید کی گئی اس سے منظوریہ ہے کہ آئندہ چل کر یا جلدی یا بدیر بے ایمانی کا برا انجام دنیا و آخرت میں ان کا دامن پکڑے گا۔ بعد کی آیات بھی اس تفسیر کی گواہ اور شاہد ہیں۔

۱۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ لفظ ”آیہ“ نکرہ سیاق نفی ہے، لہذا عمومیت کا فائدہ دے گا یعنی وہ کسی بھی آیت اور کسی بھی نشانی کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

آیت ۶

﴿أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ تُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا
الْأَنْهَارَ بَحْرَىٰ مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ﴾ -

ترجمہ:

۶۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں ہے کہ ہم نے کتنی گزشتہ اقوام کو ہلاک کیا ہے وہ قومیں کہ (جو تم سے کیں زیادہ طاقتور تھیں اور) جنھیں ہم نے ایسی توانائیاں عطا کی تھیں جو تمھیں دی ہیں، ہم نے ان کی طرف پے در پے بارشیں بھیجیں اور ان کی (آبادیوں) کے نیچے نہریں جاری تھیں (لیکن جب انھوں نے سرکشی اور طغیانی کی تو) ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا، اور ان کے بعد ہم دوسری قوم کو وجود میں لے آئے۔

سرکشی کرنے والوں کو سرگزشت

اس آیت کے بعد قرآن بت پرستوں اور مشرکین کو بیدار کرنے کے لئے شرک و بت پرستی کے مختلف محرکات کی مناسبت سے ایک مرحلہ دار ترتیبی پروگرام پیش کرتا ہے، پہلے تو عامل غرور کو ختم کرنے کے لئے کہ جو عامل طغیان و سرکشی کے اہم عوامل میں سے ایک عامل ہے کام کا آغاز کرتا ہے اور اقوام گزشتہ کی کیفیت اور ان کے دردناک انجام کی یاد دہانی کمرانے کے ساتھ ان افراد کو کہ جن کی آنکھوں کے اوپر غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا انھوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے کیسی کیسی قومیں ان سے پہلے ہلاک کر دی وہ ایسی قومیں تھیں جنھیں ہم نے روئے زمین وہ توانائیاں دے رکھی تھی جو تمھارے اختیار میں نہیں دیں ﴿أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ تُمَكِّنْ لَكُمْ﴾ ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ہم ان کے لئے یکے بعد دیگر برکت والی بارشیں بھیجیں ﴿وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا﴾ (۱)

اور دوسرا یہ ہے کہ جاری پانی نہریں ان کی آبادیوں کے نیچے جاری کی ہیں اور ان کے اختیار میں دیں ہیں ﴿وَجَعَلْنَا الْاَنْهَارَ بَحْرَىٰ مِنْ تَحْتِهِمْ﴾ -

لیکن جب انھوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا تو ان امکانات میں سے کوئی چیز بھی انھیں خدائی سزا سے نہ بچا سکی اور ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے نیست و نابود کر دیا ﴿فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ﴾

ان کے بعد ہم دوسری قوموں کو ان کی جگہ لے آئے ﴿وَأَنشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ﴾

کیا گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ان کے لئے باعث عبرت نہیں ہونا چاہیے اور انھیں خواب و غفلت سے بیدار اور سستی، غرور سے ہوشیار نہیں ہو جانا چاہئے، کیا وہ خدا جس نے گزشتہ لوگوں کے لئے یہ عمل کیا ہے، یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہی ان کے ساتھ بھی کرے۔

۱۔ مدرار، اصل میں ”در“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی دودھ ہے، بعد میں دوسری بہنے والی چیزوں مثلاً بارش کے برسنے پر بھی بولا جانے لگا، اور مدرار مبالغہ کا صیغہ ہے اور ”ارسلنا السماء“ حقیقت میں زیادہ مبالغے کے لئے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ”قرن“ اگرچہ عموماً طویل زمانہ کے معنی میں (مثلاً سو سال، ستر سال یا تیس سال کے لئے) آیا ہے لیکن کبھی کبھی جیسا کہ اہل لغت نے تحریر کی ہے ایسی جمعیت اور قوم کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو ایک ہی زمانے میں موجود رہی ہو، اصولی طور پر قرن مادہ اقتران سے ہے اور نزدیکی کے معنی دیتا ہے اور چونکہ عصر واحد اور قریب والے زمانے کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں لہذا انہیں بھی اور ان کے زمانے کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی آیات میں بارہا اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ مادی وسائل کی فروانی کم ظرف افراد کے غرور و غفلت کا باعث بن جاتی ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں کی اپنے پاس موجودگی کی صورت میں اپنے آپ کو پروردگار عالم کی طرف سے بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں، وہ اس بات کی طرف سے غافل ہوتے ہیں کہ اگر ہر ہر لحظے کے لئے اور ہر ہر ثانیہ کے لئے خداوند تعالیٰ کی کمک اور امداد ان تک نہ پہنچے تو وہ نابود ہو جائیں اور بالکل ختم ہو جائیں جیسا کہ ارشاد الہی ہے:

”﴿ان الانسان ليطغى ان راه استغنى﴾“۔

انسان طغیان و سرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے^(۱)۔

۳۔ یہ تنبیہ صرف بت پرستوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ قرآن آج بھی اس مشینی دور کی سرمایہ دار دنیا کو بھی کہ جو وسائل زندگی فراہم ہونے کی وجہ سے بادہ غرور سے سرمست ہو چکی ہے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کی حالت کو فراموش نہ کرے کہ وہ گناہوں کے اثر سے کس طرح تمام چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایک اور عالمی جنگ کی ایک چنگاری سے سب کچھ ہاتھ سے دے بیٹھو اور اپنے صنعتی تمدن سے پہلے والے زمانے کی طرف پلٹ جاؤ، تمہیں اس بات پر توجہ رکھنی چاہئے کہ ان کی بد بختی کا سبب گناہ، ظلم و ستم، نا انصافی اور عدم ایمان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی یہی کچھ تمہارے معاشرے میں بھی آشکار ہو چکا ہے۔

حقیقتاً فراعنہ مصر، ملوک سبا، سلاطین کلدہ آشور اور قیصران روم کی تاریخ اور ان کے بے حساب ناز و نعمت اور اس افسانوی زندگی کا مطالعہ اور اس کے بعد اس دردناک انجام کا مطالعہ کہ کس طرح ان کے ظلم اور کفر نے ان کی زندگی کے دفتر کو پلیٹ کر رکھ دیا اور ہم سب کے لئے ایک عظیم اور واضح درس عبرت ہے۔

آیت ۷

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوا إِنَّ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ -

ترجمہ:

۷۔ اگر ہم کاغذ پر (لکھی ہوئی کوئی) کتاب تجھ پر نازل کرتے اور وہ (دیکھنے کے علاوہ) اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے بھی تو پھر بھی کفار یہی کہتے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ہٹ دھرمی کا آخری درجہ

ان کے انحراف کے اسباب میں سے دوسری چیز تکبر اور ہٹ دھرمی ہے کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، کیونکہ عام طور پر متکبر لوگ ہی ہٹ دھرم ہوتے ہیں، کیونکہ تکبر انھیں حق سے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی اجازت نہیں دیتا، یہی بات ان کی ہٹ دھرمی کا سبب بن جاتی ہے اور وہ ہر واضح دلیل اور روشن برہان کا اسی طرح سے انکار کرتے ہیں خواہ ان کا وہ انکار بدیہیات کے انکار تک پہنچ جائے جیسا کہ ہم نے بارہا خود اپنی ۱۱۱۱ آنکھوں سے متکبر اور خود خواہ افراد میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔

قرآن اس مقام پر بعض بت پرستوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نصر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد تھے انھوں نے پیغمبر سے یہ کہا تھا کہ ہم صرف اس صورت میں ایمان لائے گا جب خدا کی طرف سے ہم پر چار فرشتوں کے ساتھ ہم پر خط نازل ہوگا، قرآن کہتا ہے: اگر اسی طرح جیسا کہ ان کا مطالبہ ہے کسی کاغذ کے صفحہ پر ہی کوئی تحریر یا اس کی مانند کوئی اور چیز کوئی تم پر نازل کر دے اور مشاہدہ کرنے کے علاوہ اسے اپنے ہاتھ چھوئیں بھی پھر بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے ﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوا إِنَّ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ -

یعنی ان کی ہٹ دھرمی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ وہ روشن ترین محسوسات کا بھی یعنی ان باتوں کا بھی جو دیکھنے اور چھونے سے معلوم ہو سکتی ہے انکار کر دیتے ہیں اور جادو کا بہانہ کر کے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حقائق کے ثبوت کے لئے ان نشانیوں کے دسویں حصہ پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور اسے ہی قطعی اور مسلم جان لیتے ہیں، یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ خود خواہی، تکبر و شدید ہٹ دھرمی نے ان کی روح پر سایہ ڈال رکھا ہے۔

ظنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہئے کہ ”قرطاس“ کا معنی ہر وہ چیز ہے کہ جس پر لکھتے ہیں خواہ وہ چیز کاغذ ہو یا چمڑا یا تختیاں آج قرطاس صرف کاغذ کا کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر لکھا جاتا ہے ان میں سے کاغذ کا ہی سب سے زیادہ رواج ہے۔

آیات ۸، ۹، ۱۰

۸ ﴿وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّفُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ﴾

۹ ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ﴾

۱۰ ﴿وَلَقَدْ اسْتَهْزَأَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾

ترجمہ:

- ۸۔ انھوں نے کہا کہ اس کے اوپر فرشتہ کیوں نہ نازل (تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے میں اس ک مدد کرتا) لیکن اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے (اور اصل امر محسوس طور پر مشاہدہ میں آجاتا) تو پھر تو معاملہ صاف ہو جاتا (اور ایسی صورت میں اگر وہ مخالفت کریں گے) تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے)
- ۹۔ اور اگر اسے فرشتہ قرار دیتے تو یقیناً سے بھی ایک مرد کی صورت میں ہی لاتے پھر بھی (ان کے خیال کے مطابق تو) ہم معاملہ کو ان پر مشتبہ ہی چھوڑ دیتے جیسے وہ دوسروں پر معاملہ مشتبہ بناتے ہیں۔
- ۱۰۔ (اس حالت سے پریشان نہ ہو) تجھ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑا گیا تھا، لیکن آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے ان کا دامن پکڑ لیا (اور ان پر عذاب الہی نازل ہو گیا)۔

بہانہ تراشیاں

کفر اور انکار کے اسباب میں سے ایک اور سبب بہانہ جوئی ہے، اگرچہ بہانہ جوئی کی علامت بھی دوسرے عوامل مثلاً تکبر و خود خواہی وغیرہ ہی ہے، لیکن یہ آہستہ آہستہ ایک منفی فکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ خود حق کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

ان بہانہ تراشیوں میں سے کہ جو مشرکین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں کیا کرتے تھے اور قرآن مجید کی کئی آیات میں ان کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں بھی ان کا بیان ہوا ہے، ایک یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر اتنے عظیم کام کو اکیلے ہی اپنے ہاتھ میں کیوں لے لیا ہے، اس ماموریت میں کوئی اور موجود، جو نوع بشر میں سے نہ ہو بلکہ فرشتوں کی جنس سے ہو، ان کی ہمراہی کیوں نہیں کرتا، کیا ایسا انسان کہ جو ہماری ہی جنس سے ہو تنہا بار رسالت کا اپنے کندھے پر اٹھا سکتا ہے؟ ﴿وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا﴾

حالانکہ آپ کی نبوت کے ثبوت میں واضح نشانیوں اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے ان بہانہ تراشیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے، علاوہ ازیں نہ تو فرشتہ انسان سے زیادہ قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ رسالت کے لئے استعداد بلکہ انسان اس سے کئی درجے زیادہ اہل ہے، قرآن دو جملوں کے ساتھ کہ جن میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک استدلال رکھتا ہے انھیں جواب دیتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر فرشتہ نازل ہو جائے اور پھر وہ ایمان نہ لائے، تو ان سب کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا ﴿وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّفُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ﴾۔

لیکن یہ بات کہ فرشتے کے آنے اور اس کی پیغمبری کی ہمراہی سے منکرین کیوں موت اور ہلاکت میں گرفتار ہوں گے، اس کی دلیل وہی ہے کہ جس کی طرف قبل کی چند آیات میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر نبوت کا محسوس طور پر مشاہدہ ہو جائے، یعنی فرشتے کے آنے سے غیب شہود میں بدل جائے اور تمام چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو پھر تو اتمام حجت کا آخری مرحلہ بھی پورا ہو جائے گا کیوں کہ اس سے بڑھ کر اور کسی دلیل کا تصور ہو ہی نہیں سکتا، تو ان حالات میں اگر کوئی مخالفت کمرے گا تو اس کی سزا اور عذاب یقینی ہو جائے گا۔ لیکن خودوند تعالیٰ اپنے لطف مرحمت کی وجہ سے اور اس غرض سے ان کے پاس نظر ثانی کے لئے موقع باقی رہے یہ کام نہیں کرتا، مگر خاص موقع پر کہ جہاں وہ یہ جانتا ہے کہ مد مقابل اسے قبول کرنے کی مکمل استعداد رکھتا ہے یا ایسے موقع پر جہاں جانب مخالف نابود ہونے کا مستحق ہے، یعنی اس نے ایسے عمل انجام دئے ہوں کہ وہ خدائی سزا کا مستحق بن گیا ہو، تو اس موقع پر اس کے تقاضے کے مطابق ترتیب اثر دیا جاتا ہے، اور جب وہ قبول نہیں کرتا تو اس کی نابودی کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام رہبری اور لوگوں کی تربیت کے ذمہ دار ہونے اور ان کے لئے عملی نمونہ پیش کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ لازماً نوع بشر میں سے ہوں اور ان کے ہم رنگ اور ہم صفات ہوں اور تمام غرائض و صفات انسانی ان میں موجود ہوں کیوں کہ فرشتہ، علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے لئے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ انسان کے لئے نمونہ عمل بن سکے کیونکہ نہ وہ انسان کی ضروریات اور تکالیف سے آگاہ ہے اور نہ ہی وہ اس کے غرائض و خواہشات سے آشنا ہے، اسی دلیل سے اس کی رہبری ایسے موجود کے لئے کہ جو ہر لحاظ سے اس سے مختلف ہے بالکل ناکارہ ہوگی۔

لہذا قرآن دوسرے جواب میں کہتا ہے: اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے اور ان کے مطالبے پر عمل کرتے تو پھر بھی ہمارے لئے یہ لازم تھا کہ ہم انسان کی تمام صفات کو اس میں پیدا کرتے اور اسے صورت و سیرت میں مرد بناتے ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا جَعَلْنَاهُ رَجُلًا﴾^(۱) جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”جعلناہ رجلا“ سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اسے صرف انسانی شکل دیں گے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کر لیا ہے، بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسے ظاہر و باطن کے لحاظ سے صفت انسانی سے متصف کریں گے۔ اس کے بعد اس کا نتیجہ پیش کرتا ہے کہ اس حالت میں وہ ہم پر پھر انھیں سابقہ اعتراضات کو دہراتے کہ کسی انسان کو رہبر کے طور پر کیوں مامور کیا گیا اور حقیقت کو ہم پر پوشیدہ رکھا ہے ﴿وَلَكِنَّا عَلَيْنَاهُمْ مَا يَلْبِسُونَ﴾ - ”لبس“ (بروزن ”درس“) پردہ پوشی اور اشتباہ کاری کے معنی میں ہے اور ”لبس“ (بروزن قفل) لباس پہننے کے معنی میں ہے پہلے کے ماضی لبس (بروزن ضرب) ہے اور دوسرے کی ماضی لبس (بروزن حسب ہے) اور یہ بات واضح ہے کہ پہلا والا مفہوم یعنی اگر ہم فرشتہ کو بھیجتے تو ضروری تھا کہ وہ انسانی صورت و سیرت میں ہو، اس حالت میں ان کے عقیدے کے مطابق ہم نے لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالا ہوتا اور پھر وہ ہمارے لئے انھیں سابقہ نسبتوں کو دہراتے جس طرح کہ وہ خود نادان اور بے خبر لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالتے ہیں اور حقیقت کا چہرہ ان سے چھپاتے ہیں، اس بنا پر ”لبس“ اور پردہ پوشی کی خدا کی طرف نسبت ان کے زاویہ نگاہ سے ہے۔ آخر میں خداوند تعالیٰ پیغمبر کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: ان کی مخالفت، ہٹ دھرمی اور سخت گیری سے پریشان نہ ہو کیوں کہ آپ سے پہلے کہ پیغمبروں میں سے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا، لیکن آخر کار جس چیز کا وہ تمسخر کیا کرتے تھے اسی نے ان کے دامن کو پکڑ لیا اور ان پر عذاب الہی نازل ہوا ﴿وَلَقَدْ اسْتَهْزَؤْا بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ در حقیقت یہ آیت پیغمبر کے دل کی تسلی کا سبب بھی ہے کہ اس کی راہ میں ذرا سا تزلزل بھی ان کے ارادہ میں نہ آئے اور ہٹ دھرم مخالفین کے لئے دھمکی بھی ہے کہ وہ اپنے کام کے برے اور دردناک انجام کا سوچ لیں^(۲)

۱۔ ”جعلناہ“ کی ضمیر پیغمبر کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور اس کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ جو پیغمبر کے ساتھ اس کی نبوت کو مستحکم کرنے کے لئے مبعوث ہو، دوسری صورت میں تو ان کے مطالبے پر عمل ہوگا اور پہلی صورت میں ان کے مطالبے سے بھی بڑھ کر صورت ہوگی۔ ۲۔ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ ”حاق“ کا معنی نازل ہو اور ”وارد ہوا“ ہے اور ما کَانُوا بِهِ یَسْتَهْزِئُونَ سے مراد انبیاء کا عذاب الہی کی خبر دینا ہے، کہ جنھیں ہٹ دھرم، دشمن ٹھٹھے میں اڑا دیا کرتے تھے مثلاً حضرت نوح (علیہ السلام) کا بار بار طوفان کی دھمکی دینا کہ جو بت پرست قوم کے لئے ایک مذاق کا ذریعہ بن گئی تھی، اس بنا پر آیت میں کلمہ ”جزاء“ مقدار ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض نے کہا ہے، بلکہ اس کا معنی اس طرح ہے جن سزاؤں کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر نازل ہو گئیں۔

آیت ۱۱

﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۔ (اے رسول) کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو، اس کے بعد (دیکھو اور) غور کرو جو لوگ آیات خداوندی کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟۔

وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے کس کی ہیں،

قرآن مجید نے اس مقام پر ان ہٹ دھرم اور خود خواہ لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اس نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ وہ انھیں کہیں کہ زمین پر چلیں، پھریں اور جو لوگ حقائق کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، شاید وہ بیدار ہو جائیں

﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ -

اس میں شک نہیں ہے کہ گزشتہ لوگوں اور ان قوموں کے آثار کو دیکھنا کہ جنہوں نے حقائق کو ٹھکرانے کی وجہ سے فنا اور نابودی کا راستہ اختیار کر لیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں ان کے حالات کے پڑھنے سے کہیں بڑھ کر پر اثر ہیں کیونکہ یہ آثار حقیقت کو محسوس اور قابل لمس بناتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ لفظ ”انظروا“ (دیکھو) استعمال کیا گیا ہے نہ کہ ”تفکروا“ (غور و فکر)۔

ضمناً لفظ ”ثم“ کا ذکر جو عام طور عطف بافاصلہ زمانی کے لئے آتا ہے ممکن ہے اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہو کر اپنی سیر اور فیصلہ میں جلدی نہ کرے بلکہ جب گزرے ہوئے لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کرے تو حوصلہ اور وقت کے ساتھ غور و فکر کرے پھر اس سے نتیجہ اخذ کر کے ان کے کام کا انجام آنکھوں سے دیکھے۔

زمین میں سیر و سیاحت کرنے اور افکار کو بیدار کرنے میں اس کی غیر معمولی تاثیر کے بارے میں ہم جلد سوم، آل عمران کی آیت ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

آیات ۱۲، ۱۳

۱۲ ﴿قُلْ لِمَنْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلْ لِلَّهِ كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ لِيَجْمَعَ بَيْنَكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

۱۳ ﴿وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾۔

ترجمہ:

۱۲۔ کہہ دو کہ وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے کس کی ہیں، کہہ دو کہ وہ سب خدا کی ہیں جس نے رحمت (اور بخشش) کو اپنے اوپر ضروری قرار دے لیا ہے (اور اسی دلیل سے) تم سب کو قطعی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا صرف وہی لوگ ایمان نہیں لائیں گے جنہوں نے اپنا سرمایہ حیات ضائع کر دیا ہے اور خسارہ کا شکار ہے۔

۱۳۔ اور جو کچھ رات اور دن میں ہے وہ بھی سب اسی کے لئے ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

معاد پر استدلال

اس آیت میں پہلے کی طرح مشرکین سے بحث ہو رہی ہے، گذشتہ آیات میں مسئلہ توحید کو موضوع بحث بنایا گیا تھا، اس آیت میں مسئلہ معاد پر بحث ہو رہی ہے، توحید کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے بعد مسئلہ قیامت اور معاد کو بڑے عمدہ طریقہ سے بیان کیا جا رہا ہے، آیت سوال و جواب کی صورت میں ہے، سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں ایک ہی ہے جوابیات میں ایک خوبصورت طریقہ ہے۔

معاد پر استدلال

معاد پر استدلال کے لئے مقدمہ کے طور پر دو باتیں کہی گئی ہیں:

۱۔ پہلے کہتا ہے: کہہ دو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے لئے ہے ﴿قُلْ لِمَنْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔

پھر اس کے بعد فوراً بلا فاصلہ کہتا ہے کہ تم خود زبان فطرت اور ان کی روح کا جواب دے دو کہ خدا کے لئے۔ ﴿قُلْ لِمَنْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔ اس مقدمہ کے مطابق تمام جہان خدا کی ملکیت ہے اور اس کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ پروردگار عالم تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے، وہی ہے وہ ذات کہ جس نے رحمت کو اپنے ذمہ لے لیا ہے اور بے شمار نعمتیں سب کے لئے عام کر دی ہیں

﴿كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ -

کیا یہ ممکن ہے کہ ایس خدا اجازت دے کہ انسانوں کا رشتہ حیات موت کے ذریعہ کلی طور پر منقطع ہو جائے اور کمال کی جانب اس کا سفر ختم ہو جائے، کیا یہ بات اس کے اصلا فیاض ہونے اور اس کی رحمت واسعہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کے بارے میں کہ جن کا وہ مالک و مدبر ہے اس قسم کی بے مہری کر سکتا ہے کہ وہ ایک مدت کے بعد بالکل فنا ہو جائے اور ان کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے۔

مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کی رحمت واسعہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ موجودات کو خاص طور پر انسان کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے اور آگے بڑھائے جس طرح اپنی رحمت کے سائے میں ایک بے قدر و قیمت چھوٹے سے بیج کو تناور اور پھلدار درخت میں یا گل زینا کی شاخ میں بدل دیتا ہے۔ جیسا کہ اپنے فیض و کرم کے سایہ میں بے قدر و قیمت نطفہ کو انسان کامل میں بدل دیتا ہے، اسی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو کہ جو بقا اور حیات جاودانی کی استعداد رکھتا ہے موت کے بعد نئی زندگی کے لباس میں اور زیادہ وسیع عالم میں لے آئے اور تکامل کی سیر ابدی میں اس کی رحمت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے۔

لہذا ان دونوں مقدمات کے بعد کہتا ہے مسلمہ طور پر تم سب کو قیامت کے دن جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا ﴿لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ -

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آیت سوال سے شروع ہو رہی ہے جیسے اصطلاح میں استفہام تقریری کہتے ہیں جس میں صرف مقابل سے اقرار لینا مطلوب ہوتا ہے اور چونکہ یہ مطلب فطرت کی نگاہ سے بھی مسلم تھا اور خود مشرکین بھی اس کے معترف تھے کہ عالم ہستی کی ملکیت بتوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ خدا سے مربوط ہے، لہذا وہ خود ہی بلا فاصلہ سوال کا جواب دیتا ہے اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں یہ ایک اچھا شمار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ معاد کے لئے دوسرے مقامات پر مختلف طریقوں سے مثلاً قانون عدالت، قانون تکامل اور حکمت پروردگار کے طریقہ سے استدلال ہوا ہے، لیکن رحمت کے ساتھ استدلال ایک نیا استدلال ہے، جو اوپر والی آیت میں موضوع بحث قرار پایا ہے۔

آیت کے آخر میں ہٹ دھرم مشرکین کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ خدا جو زندگی کے بازار تجارت میں اپنے وجود کا سرمایہ ضائع کر چکے ہیں وہ ان حقائق پر ایمان نہیں لائیں گے ﴿الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

اس قدر عجیب و غریب تعبیر ہے بعض اوقات انسان مال یا مقام یا اپنے سرمایہ میں سے کوئی اور چیز ہاتھ کھو بیٹھتا ہے، ان چیزوں میں اگرچہ اس نے نقصان کیا ہوتا ہے لیکن پھر اس نے ایسی چیزیں اپنے ہاتھ سے دی ہے جو اس کے وجود کا جزء نہیں ہے، یعنی یہ چیزیں اس کے وجود سے باہر ہیں، لیکن سب سے بڑا خسارہ جسے حقیقی خسارے کا نام دیا جاسکتا ہے اس وقت ہوگا جب انسان خود اپنے اصل ہستی ہی کو ہاتھ سے دے بیٹھے اور خود اپنے وجود کو ہی داوے پر لگا دے۔ حق کے دشمن اور ہٹ دھرم لوگ اپنی عمر کی پونجی اور اپنی فکر، عقل، فطرت اور تمام روحانی اور جسمانی نعمات کو جنھیں راہ حق میں کام آنا چاہئے تھا تاکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ سکے، کلی طور پر ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں نہ سرمایہ باقی رہتا ہے نہ سرمایہ دار یہ تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہے اور یہ وہ ہلا دینے والی تعبیرات ہے کہ جو منکرین حق اور گناہگاروں کا دردناک انجام واضح کر دیتی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ابدی زندگی مومنین کے لئے تو مصداق ”رحمت“ ہے لیکن ان کے غیر لئے ہے تو سوائے ”زحمت و بد بختی“ کے اور کوئی چیز نہ ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا کام اسباب رحمت فراہم کرنا ہے، اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے عقل دی اور اس کی رہبری اور راہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجے اور طرح طرح کی نعمتوں کو اس کے اختیار میں دے دیا اور حیات جاوداں کی طرف سب کے لئے راہیں کھول دیں، یہ سب چیزیں بغیر استثناء کے رحمت ہیں۔

اب اگر راستے میں ان رحمتوں کے نتیجہ اور ثمر تک پہنچنے سے پہلے انسان خود راستے کو ٹیڑھا کرے اور تمام اسباب رحمت کو اپنے لئے زحمت میں تبدیل کر دے تو یہ بات ان اسباب کے رحمت ہونے کی نفی نہیں کرتی اور ملامت کا حقدار وہ انسان ہے کہ جس نے اسباب رحمت کو عذاب میں بدل لیا ہے۔

بعد والی آیت اصل میں گزشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے کیوں کہ پہلی آیت میں خداوند تعالیٰ کی تمام موجودات کے بارے میں مالکیت کی طرف اشارہ تھا اس طریق سے کہ وہ سب ایک افق مکان میں واقع ہیں لہذا فرمایا کہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

اب یہ آیت اس کے افق و وسعت زمان میں واقع ہونے کے طریق سے اس کی مالکیت کی طرف اشارہ ہے، لہذا کہتا ہے: اور اس کے لئے ہے جو کچھ رات اور دن میں ہے ﴿وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾۔

حقیقت میں جہاں مادہ اس سے یعنی زمان و مکان سے خالی نہیں ہے، اور تمام موجودات جو ظرف زمان و مکان میں آتے ہیں یعنی تمام جہاں مادہ اس کی ملکیت ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ رات اور دن اس نظام شمسی کے ساتھ ہی مخصوص ہے بلکہ تمام موجودات آسمان و زمین شب و روز رکھتے ہیں اور بعض میں ہمیشہ دن ہوتا ہے رات نہیں ہوتی اور بعض میں ہمیشہ رات ہوتی ہے دن نہیں ہوتا، مثلاً سورج میں ہمیشہ دن ہے کیونکہ وہاں روشنی ہی روشنی ہے اور تاریکی کا کوئی وجود نہیں ہے جب کہ بعض ستارے بجھے ہوئے اور بے نور ہیں وہ آسمان کہ جو ستاروں سے بہت دور ہیں وہاں ہمیشہ رات کی تاریکی چھائی رہتی ہے اور اوپر والی آیت ان سب پر صادق آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہئے کہ ”سکون“ کسی موجود کا کسی چیز میں سکونت، توقف اور قرار پانے کے معنی میں ہے، چاہے وہ موجود حالت حرکت میں ہو یا سکون میں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم فلاں شہر میں ساکن ہیں یعنی ہم وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور مقیم ہیں چاہے ہم اس شہر کی سڑکوں پر حالت حرکت میں ہوں یا کہیں حالت سکون میں ہوں۔

آیت میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہاں ”سکون“ صرف حرکت کے مقابلے میں ہو اور چونکہ یہ دونوں امور نسبتی ہیں لہذا ایک کا ذکر ہمیں دوسرے سے بے نیاز کر دیتا ہے اس بنا پر آیت کا مطلب یوں ہو جاتا ہے کہ جو کچھ روز و شب اور افق زمان میں سکون و حرکت کی حالت میں ہے وہ سب خدا کی ملکیت ہے۔

اور اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ آیت توحید کے استدالات میں سے ایک استدلال کی طرف اشارہ ہو، کیوں کہ ”حرکت“ و ”سکون“ دو عارضی حالتیں ہیں، جو حتمی طور پر حادث ہیں اور وہ قدیم و ازلی نہیں ہو سکتیں کیونکہ حرکت عبارت ایک چیز کا دو مختلف اوقات دو مختلف مکانوں میں ہونے سے اور سکون ہے ایک چیز کا دو زمانوں میں ایک معین

مکان میں رہنا، اس بنا پر حرکت و سکون کی ذات میں سابقہ حالت کی طرف توجہ پوشیدہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ چیز کہ جو اس حالت سے پہلے دوسری حالت میں ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتی۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ”اجسام حرکت و سکون سے خالی نہیں ہیں“ اور جو حرکت و سکون سے خالی نہ ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتا۔

لہذا تمام اجسام حادث ہیں اور چونکہ وہ حادث ہیں لہذا وہ پیدا کرنے والے کے محتاج ہے (غور کیجئے گا)۔
لیکن چونکہ خدا جسم نہیں ہے وہ نہ حرکت رکھتا ہے اور نہ سکون، نہ زمان رکھتا ہے نہ مکان، اسی لئے وہ ازلی و ابدی ہے اور آیت کے آخر میں توحید کا ذکر کرنے کے بعد خداوند تعالیٰ کی دو نمایاں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:
اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿وہو سمیع العلیم﴾۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہان ہستی کی وسعت اور وہ موجودات کہ جو زمان و مکان کے افق میں قرار رکھتے ہیں کبھی بھی اس بات میں منع نہیں ہے کہ خدا ان کے اسرار سے آگاہ ہو، بلکہ وہ ان کی گفتگو سنتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک کمزور چیونٹی کی حرکت کو بھی جانتا ہے جو تاریک رات میں سیاہ پتھر کے اوپر ایک خاموش دور دراز کے درے کی گہرائی میں ہوں اور اس کی ضروریات اور باقی تمام موجودات کی حاجات سے آگاہ ہے اور سب کے اعمال اور کاموں سے مطلع ہے۔

آیات ۱۶، ۱۵، ۱۴

۱۴ ﴿قُلْ أَغَيَّرَ اللَّهُ وَلِيًّا فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ -

۱۵ ﴿قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ -

۱۶ ﴿مَنْ يُصْرِفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ﴾ ،

ترجمہ:

۱۴- کہہ دو کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی بنا لوں جب کہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ، وہ ہے کہ جو روزی دیتا ہے اور کسی سے روزی نہیں لیتا، تم کہہ دو کہ میں اس بات پر مامور ہوں کہ میں سب سے پہلے ”اس کے حکم کو تسلیم کرنے والا“ (مسلمان) ہوں (اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ) مشرکین میں سے نہ ہونا۔

۱۵- کہہ دو کہ میں بھی اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بڑے دن (قیامت کے) عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۱۶- اس دن جس شخص کے اوپر سے عذاب الہی اٹھ جائے (تویوں سمجھو کہ) خدا نے اپنی رحمت اس کے شامل حال کر دی ہے اور یہ واضح کامیابی ہے۔

خدا کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے

بعض نے ان آیات کے لئے ایک شان نزول نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ اہل مکہ سے کچھ لوگ پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے محمد! تو نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کام کا عمل سوائے فقر کے اور کوئی نہیں ہے، ہم اس بات کے لئے حاضر ہیں کہ اپنا مال تیرے ساتھ بانٹ لیں اور تجھے بہت ثروت مند کر دیں تاکہ تم ہمارے خداؤں سے دستبردار ہو جاؤ اور ہمارے اصلی دین کی طرف پلٹ آؤ تو اوپر والی آیات نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا (۱) البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وارد شدہ روایات کے مطابق اس سورہ کی آیات مکہ میں یکجا طور پر نازل ہوئی ہے اس بنا پر ہر ایک آیت کے لئے خاص اور علیحدہ شان نزول نہیں ہو سکتا، لیکن اس سورہ کے نازل ہونے سے پہلے پیغمبر اور مشرکین کے درمیان گفتگو اور بحثیں ہوتی رہتی تھیں لہذا اس سورہ کی بعض آیات میں ان بحثوں کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے، اس بنا پر کوئی منع نہیں ہے کہ رسول اللہ اور مشرکین کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوئی ہوں اور خداوند تعالیٰ ان آیات میں ان باتوں کی طرف اشارہ دے رہا ہو۔

بہر حال ان آیات میں بھی ہدف و مقصد اثبات توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ ہی ہے، مشرکین باوجود اس کے کہ وہ خلقت عالم کو خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہی مخصوص سمجھتے تھے لیکن انھوں نے بتوں کو اپنی پناہ گاہ سمجھ رکھا تھا اور بعض اوقات اپنی ہر ایک حاجت کے لئے سی ایک بت کا سہارا لیتے تھے اور متعدد خداؤں (بارش کا خدا، نور کا خدا، ظلمت کا خدا، جنگ و صلح کا خدا رزق و روزی کا خدا) کے قائل تھے اور یہ وہی ارباب انواع کا عقیدہ ہے کہ جو قدیم یونان میں بھی وجود رکھتا تھا۔

قرآن اس قسم کے غلط نظریے کو ختم کرنے کے لئے پیغمبر اس طرح حکم دیتا ہے: انھیں کہہ دو کہ کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی و سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے لوں حالانکہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور تمام موجودات کو رزق دینے والا ہے بغیر اس کے کہ خود اسے روزی کی ضرورت ہو ﴿فَلْأَعْبِرَ اللَّهُ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُهُ وَلَا يَطْعَمُ﴾۔

اس بنا پر جب تمام چیزوں پیدا کرنے والا وہی ہے اور کسی دوسرے کی قدرت کا سہارا لئے بغیر اس نے سارے جہان کو پیدا کیا ہے اور سب کی روزی اسی کے ہاتھ میں ہے تو پھر کون سی دلیل ہے کہ انسان اس کے غیر کو اپنا ولی، سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے،۔ اصولی طور پر باقی سب مخلوق ہیں اور اپنے وجود کے تمام لمحات میں اس کے محتاج ہیں، لہذا وہ کس طرح دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اوپر والی آیت میں جب آسمان و زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو خدا کا ”فاطر“ کے عنوان سے تعارف کراتا ہے ”فاطر“ ”فطور“ کے مادہ سے ہے کہ جس کے معنی شگافتہ کرنے (پھاڑنے) کے ہیں، ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے ”فاطر السموات والارض“ کے معنی اس وقت سمجھ میں آئے جب دو عربوں کو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے ہوئے دیکھا، ان میں سے ایک اپنی ملکیت کے ثبوت میں یہ کہتا تھا کہ ”انا فطر تھا“ میں نے اس کنویں کو شگافتہ کیا اور بنایا ہے۔

لیکن ہم فاطر کے معنی آج موجودہ علوم کی مدد سے ابن عباس کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یہ آج کے دقیق ترین علمی نظریات کے مطابق انتہائی پسندیدہ تعبیر ہے جو پیدائش جہان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے کیوں کہ سائنس والوں اور محققین کی تحقیقات کے مطابق عالم بزرگ (مجموعہ جہان) اور عالم کوچک (نظام شمسی) سب کے سب ابتداء میں ایک ہی تودہ تھے جو پے در پے تھپیڑوں کے اثر سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اس کے کہکشاں اور

نظام ہائے شمسی اور مختلف گرے وجود میں آگئے۔ سورہ انبیاء کی آیت ۳۰ میں یہ مطلب زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، جہاں پر فرمایا گیا ہے:

”أَوَلَمْ يَرِیَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا“

کیا کافر یہ نہیں جانتے کہ آسمان و زمین آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔

ایک اور نکتہ کی طرف سے بھی غفلت نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ صفت خدا میں سے یہاں صرف بندوں کو روزی دینے کا ذکر کیا گیا ہے، یہ تعبیر شاید اس بنا پر ہے کہ انسان کی مادی زندگی میں زیادہ تر وابستگیاں انہیں مادی ضروریات کے زیر اثر ہیں، یہی بات جسے اصطلاح میں روٹی کا ایک لقمہ کھانا کہتے ہیں انسان کو طاقتوروں اور ارباب دولت کے سامنے جھکنے پر آمادہ کر دیتی ہے، بعض اوقات تو لوگ پرستش کی حد تک ان کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں، قرآن اس عبارت میں کہتا ہے: تمہاری روزی اس کے ہاتھ میں ہے، نہ تو وہ ایسے افراد کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہی بتوں کے ہاتھ میں صاحبان مال و اقتدار خود نیاز مند ہیں اور انہیں کھانے کی احتیاج ہوتی ہے ب، یہ صرف خدا ہے کہ جو صرف کھلاتا تو ہے مگر خود اسے کھانے کی احتیاج نہیں ہے۔

قرآن حکیم کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی ملکیت و رزاقیت کے مسئلہ اور بارش برسانے اور سبزہ زاروں کی پرورش کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ مخلوقات سے وابستگی کا خیال لوگوں کے دماغ سے بالکل نکال دے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی پیش کش کا جواب دینے کے لئے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ دعوت دیتے تھے کہ وہ مشرک کے ساتھ رشتہ جوڑ لیں، کہتا ہے: علاوہ اس کے کہ عقل مجھے یہ حکم دیتی ہے کہ صرف اس ذات پر بھروسہ کروں کہ جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وحی الہی بھی مجھے حکم دیتی ہے کہ پہلا مسلمان میں بنوں اور کسی طرح بھی مشرکین کی صف میں نہ جاؤں ﴿قُلْ إِنِّیْ أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (۲)

اس شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام سے پہلے دوسرے پیغمبر اور ان کی امتیں بھی مسلمان تھی اور خداوند تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی تھیں، اس بنا پر جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کا سب سے پہلا مسلمان۔

اور یہ حقیقت میں ایک اہم تربیتی مطلب کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ہر رہبر کو اپنے مکتب اور مشن کے احکام کی انجام دہی میں تمام افراد سے زیادہ پیش قدمی کرنا چاہیے، اسے اپنے دین کا سب سے پہلا مومن اور اس پر عمل کرنے والا ہونا چاہئے اور سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور اپنے مکتب کے لئے سب سے زیادہ فداکاری کرنے والا ہونا چاہیے۔

بعد والی آیت میں اس خدائی حکم پر جو وحی کے ذریعہ پیغمبر پر نازل ہوا ہے تاکید مزید کے لئے کہتا ہے: میں بھی خود اپنے لئے جوابدہی کا احساس کرتا ہوں اور قوانین الہی سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوں، میں بھی اگر خداوند تعالیٰ کے حکم سے منحرف ہو جاؤں اور مشرکین کی ہاں میں ہاں ملانے لگ جاؤں اور اس کی نافرمانی اور عصیان کروں تو اس عظیم دن۔ روز قیامت۔ کی سزا سے خائف و ترساں ہوں ﴿قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾^(۳)

اس آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں میں جوابدہی کا احساس دوسروں میں جوابدہی کے احساس سے زیادہ ہوتا ہے۔

آخری آیت میں اس لئے کہ ثابت ہو جائے کہ پیغمبر بھی لطف و رحمت خداوندی پر بھروسہ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اور تمام اختیارات اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پروردگار کی رحمت بے پایاں پر ہی چشم امید لگائیں ہوئے ہیں اور اپنی نجات و کامیابی اسی سے طلب کرتے ہیں۔ فرمایا گیا: کہ رسول کہتے ہیں کہ جو شخص اس عظیم دن پروردگار کی سزا سے نجات پا جائے تا رحمت خدا اس کے شامل حال ہو گئی ہے اور یہ ایک توفیق الہی اور کھلی کامیابی ہے۔ ﴿مَنْ يُصْرِفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ﴾۔

یہ آیات توحید کا آخری درجہ بیان کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کو کہ جو پیغمبروں کو بھی خدا کے ساتھ مستقل پناہ گاہ مانتے تھے، جیسے عیسائی جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نجات دہندہ سمجھتے تھے، صراحت کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کہ پیغمبر تک بھی اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔

۱۔ تفسیر ابوالفتح رازی و تفسیر مجمع البیان زیر نظر آیات کے ذیل میں ۲۔ افی امرت ----- غیر مستقیم خطاب ہے اور جملہ ولا تکون۔۔۔ خطاب مستقیم ہے شاید یہ تفاوت اس سبب سے ہے کہ شرک سے دوری اور نفرت پہلا مسلمان ہونے کی نسبت کئی درجہ زیادہ اہم ہے، اسی لئے شرک سے دوری کا مسئلہ خطاب مستقیم کی صورت میں ”نون تاکید ثقیلہ“ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

۳۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جملہ بندی کی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ ”اخاف“ جملہ ”ان عصیت ربی“ کے بعد ذکر ہو۔ کیونکہ وہ شرط کی جزا کے طور پر استعمال ہوا ہے لیکن پیغمبر کا خوف اور جوابدہی کا احساس اس بات کا سبب بنا کہ پروردگار کے حکم کے سامنے ”اخاف“ (میں ڈرتا ہوں) کا لفظ تاکید کے لئے مقدم رکھا جائے۔

آیات ۱۷، ۱۸

۱۷ ﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ هُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾۔

۱۸ ﴿وَهُوَ الْغَاثِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ﴾۔

ترجمہ:

- ۱۷۔ اگر تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی اسے برطرف نہیں کر سکتا اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے (اور ہر نیکی اسی کی قدرت سے بنی ہے)
- ۱۸۔ وہی ہے جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے اور وہ حکیم و خیر ہے۔

پروردگار کی قدرت قاہرہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا سب سے پہلا ہدف شرک و بت پرستی کی بیخ کنی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں آیات میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تم لوگ غیر خدا کی طرف کیوں توجہ کرتے ہو؟ مصائب سے نجات، رفع ضرر اور حصول منفعت کے لئے خود ساختہ خداؤں سے کیوں پناہ لیتے ہو؟ حالانکہ اگر تجھے معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر نقصان بھی ہو جائے تو سوائے خدا کے اسے برطرف کرنے والا اور کوئی نہ ہوگا اور اگر کوئی خیر و برکت اور کامیابی و سعادت تجھے نصیب ہو تو وہ بھی اسی کی قدرت کا پر تو ہے۔ کیونکہ وہی ہے کہ جو تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے ﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾^(۱)

حقیقت میں غیر خدا کی طرف توجہ لوگ اس لئے کرتے ہیں کہ یا تو انھیں سرچشمہ خیرات جانتے ہیں یا وہ انھیں مصائب و مشکلات کا برطرف کرنے والا سمجھتے ہیں جیسا کہ طاقت اور اقتدار رکھنے والوں کے سامنے پرستش کی حد تک خضوع و خشوع بھی ان ہی دو اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے کہ ارادہ خداوندی تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے، اگر وہ کسی نعمت کو کسی سے سلب کر لے یا کوئی نعمت کسی کو عطا کر دے تو دنیا میں کوئی منبع قدرت ایسا نہیں ہے جو اسے پلٹا سکے تو وہ غیر خدا کے سامنے سر تعظیم کیوں جھکاتے ہیں۔

”خیر“ و ”شر“ کے بارے میں ”یمسک“ کی تعبیر کے باوجود ”مس“ سے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی خیر و شر تک بھی اس کے ارادہ و قدرت کے غیر ممکن نہیں ہے۔

یہ ذکر بھی لازمی ہے کہ اوپر والی آیت ثنویین یعنی دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کے عقیدہ کی، کہ جو خیر و شر کے دو علیحدہ علیحدہ مبدء کے قائل تھے، صراحت کے ساتھ تردید کرتی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہے، لیکن ہم اپنے مقام پر یہ عرض کر آئے ہیں کہ ”مطلق شر“ کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، تو اس بنا پر جب شر کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو اس سے ایسے امور مراد ہوتے ہیں کہ جو ظاہر میں سلب نعمت ہوتے ہیں لیکن فی الواقع اپنے مقام پر وہ خیر ہیں اور یا وہ بیدار کرنے کے لئے یا تعلیم و تربیت کے لئے اور یا تکبر، سرکشی اور خود پسندی کو برطرف کرنے کے لئے اور یا دوسری مصلحتوں کے لئے ہوتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لئے فرمایا گیا ہے: وہی ہے جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے (وہو)

القاہر فوق عبادہ ﴿﴾۔

”قہر“ اور ”غلبہ“ کا اگرچہ ایک ہی معنی ہے، لیکن لغوی بنیاد کی نظر سے ان دونوں کے معنی میں تفاوت ہے قہر وقاہریت اس قسم کے غلبہ کا میابی کو کہا جاتا ہے کہ جس میں مد مقابل کسی بھی قسم کا غلبہ اپنی طرف سے ظاہر نہیں کر سکتا لیکن لفظ غلبہ میں یہ مفہوم موجود نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ غلبہ پانے کے بعد مد مقابل اس پر کامیابی حاصل کر لے، دوسرے لفظوں میں قاہر اسے کہتے ہیں جو مد مقابل پر اس طرح تسلط اور برتری رکھتا ہو کہ اس میں مقابلے کی مجال ہی نہ ہو بالکل اس پانی کے برتن کی طرح جسے آگ کے ایک چھوٹے سے شعلہ پر ڈالا جائے تو وہ اسے فوراً خاموش کر دے

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ قاہریت عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے کہ جب طرف مقابل کوئی عاقل موجود ہو، لیکن غلبہ عام ہے اور غیر عاقل موجودات پر کامیابیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے (۲)

اس بنا پر پہلی آیت میں، خود ساختہ خداؤں اور صاحبان اقتدار کے مقابلہ میں اگر خدا کی قدرت کی عمو میست کی طرف اشارہ ہوا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ مجبور ہے کہ وہ ایک مدت تک دوسری قدرتوں کے ساتھ دست و گربان ہو یہاں تک کہ وہ انھیں چت کر دے، بلکہ اس کی قدرت، قدرت قاہرہ ہے اور ”فوق عبادہ“ کی تعبیر بھی اسی معنی کی تکمیل کے لئے ہے۔

اس حالت میں کس طرح ممکن ہے کہ ایک باخبر انسان اسے چھوڑ دے اور ایسے موجودات و اشخاص کے پیچھے جائے کہ جو اپنی طرف سے کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتے، یہاں تک کہ ان میں جو معمولی اور حقیر سی قدرت موجود ہے وہ بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

لیکن اس مقصد کے پیش نظر کہ کہیں یہ وہم نہ ہو جائے کہ ممکن ہے خدا بھی بعض صاحبان قدرت کی طرح اپنی نامحدود قدرت سے تھوڑا بہت غلط فائدہ اٹھا لیتا ہو، آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ اس کے باوجود وہ حکیم اور اس کے تمام کام حساب کے مطابق ہیں اور وہ خیر و آگاہ ہے اور معمولی سے معمولی اشتباہ اور خطا بھی اپنی قدرت کو عمل میں لانے میں نہیں کرتا ﴿ہو الحکیم الخبیر﴾۔

فرعون کے حالات میں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کی اولاد کے قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

”﴿وانافوقهم قاهرون﴾“^(۲) یعنی میں ان لوگوں کے اوپر کامل طور پر مسلط ہوں۔ یعنی وہ اپنی اس قدرت قاہرہ کو۔ کہ جو وقع میں ایک حقیر قدرت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق کے پرواہ نہ کرنے کی دلیل قرار دیتا تھا، لیکن خداوند حکیم و خیر اس قدرت قاہرہ کے باوجود اس سے بہت منزہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا ظلم اور غلطی سے معمولی سے معمولی بندے کے حق میں روار رکھے۔

یہ بات بھی کہے بغیر واضح ہے کہ (فوق عبادہ) کے لفظ سے مراد مرتبہ و مقام کی برتری ہے، کیوں کہ یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔

تجب کی بات یہ ہے کہ بعض بد دماغوں نے اوپر والی آیت کی تعبیر کو خدا کے جسم ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ فوق (اوپر) کی تعبیر خدا کی اپنے بندوں پر قدرت کے لحاظ سے معنوی برتری کے بیان کے لئے ہے، یہاں تک کہ فرعون کے بارے میں بھی حالانکہ وہ ایک انسان تھا اور جسم رکھتا تھا یہی لفظ مقام کی برتری کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ مکانی برتری کے لئے (غور کیجئے گا)۔

۱۔ ”ضر“ ایسے نقصانات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو انسان کو پیش آتے ہیں، خواہ وہ جسمانی پہلو رکھتے ہوں جیسے کسی عضو کا نقصان اور مختلف بیماریاں یا وہ روحانی پہلو رکھتے ہوں جیسے جہالت، حماقت، دیوانگی یا دوسرے پہلو جیسے مال، اولاد و یا عزت کا چلا جانا۔

۲۔ المیزان، جلد ۷، صفحہ ۳۴۔

۳۔ اعراف، ۱۲۷۔

آیات ۱۹، ۲۰

- ۱۹ ﴿قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلْ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَى قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ وَإِنِّي بِرِءٍ مِمَّا تُشْرِكُونَ﴾۔
- ۲۰ ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

ترجمہ:

- ۱۹۔ کہہ دو کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے، کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ تمہارے درمیان گواہ ہے، (اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ) اس نے یہ قرآن میرے اوپر وحی کیا ہے تاکہ تمہیں اور ان تمام افراد کو ڈراؤں کہ جن تک یہ قرآن پہنچے (اور حکم خدا کی مخالفت کا خوف دلاؤں) کیا سچ مچ تم یہ گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں، کہہ دو میں ہرگز اس قسم کی گواہی نہیں دیتا، کہہ دو کہ خدایگانہ ویکتا ہے اور میں اس سے جو اس کا شریک قرار دے بری و بے زار ہوں۔
- ۲۰۔ وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے، اس (پیغمبر کو) اچھی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، صرف وہ اشخاص ہیں کہ جو اپنا سرمایہ وجود کھو بیٹھتے ہیں ایمان نہیں لاتے۔

سب سے بڑا گواہ

- جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ پیغمبر اکرم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تو کیسا پیغمبر ہے کہ تیرا کوئی بھی موافق اور حامی نہیں، یہاں تک کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے بھی تیرے بارے میں تحقیق کی ہے، وہ بھی توریت و انجیل کی بنیاد پر تیری حقانیت کی گواہی نہیں دیتے کم از کم کوئی تم ہمیں کہ جو تمہاری رسالت کی گواہی دے۔ مندرجہ بالا آیت اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔
- پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ ان سب ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلے میں کہ جنہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور آپ کی حقانیت کی ان کی سب نشانیوں کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی گواہ اور شاہد کا مطالبہ کرتے ہیں، کہہ دیجئے، تمہارے عقیدہ اور نظریہ کے مطابق سب سے بڑا گواہ کون ہے
- ﴿قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً﴾۔

کیا اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ سب سے بڑی شہادت پروردگار کی شہادت ہے؟ تو کہہ دو کہ خدائے بزرگ و برتر میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے ﴿قُلِ اللّٰهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ﴾۔

اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اس نے اس قرآن کو مجھ پر وحی کیا ہے ﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ﴾ وہ قرآن جو ممکن نہیں ہے کہ فکر انسانی کا گھڑا ہوا ہو، وہ بھی اس زمانے اور اس ماحول میں اور مقام میں، وہ قرآن کہ جو کئے قسم کے شواہد اعجاز پر مشتمل ہے، اس کے الفاظ اعجاز آمیز ہیں اور اس کے معانی اس سے بھی زیادہ اعجاز آمیز ہیں، کیا یہی ایک عظیم شاہد خداوند عالم کی طرف سے میری دعوت کی حقانیت کی گواہی کی دلیل نہیں ہے؟۔
 ضمنی طور پر اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے اور پیغمبر اکرم کے دعوے کی صداقت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

اس کے بعد نزول قرآن کا ہدف و مقصد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ قرآن اس مقصد کے لئے مجھ پر نازل ہوا ہے کہ میں تمہیں اور ان تمام لوگوں کو جن کے کانوں تک پوری تاریخ بشر میں اور وسعت زمانے میں اور تمام نقاط جہان میں، میری باتیں پہنچیں انھیں خدا کے حکم کی مخالفت سے ڈراؤں اور اس کی مخالفت کے دردناک عواقب و انجام کی طرف متوجہ کروں ﴿لَا نَذِرْكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں گفتگو صرف ”انذار“ اور ڈرانے کے بارے میں ہے حالانکہ عام طور پر ہر جگہ بشارت بھی ساتھ ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گفتگو ایسے ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلہ میں تھی جو مخالفت پر اصرار کرتے رہے ہیں۔
 ضمنی طور پر ”ومن بلغ“ (وہ تمام لوگ کہ جن تک یہ بات پہنچ جائے) کے الفاظ کا ذکر قرآن کی رسالت جہانی اور دعوت عمومی اور پیام عالمی کا پتہ دیتا ہے

حقیقت میں اس سے زیادہ مختصر اور اس سے زیادہ جامع تعبیر اس مقصد کے ادا کرنے کے لئے اور متصور ہو یہ نہیں سکتی، اس کی وسعت میں غور کرنے سے قرآن کی دعوت کے نسل عرب یا خاص زمانے یا علاقے سے مخصوص نہ ہونے کے بارے میں ہر قسم کا ابہام اور شک و شبہ دور ہو جاتا ہے علماء کے ایک گروہ نے ایسی تعبیرات سے مسئلہ ختم نبوت کے لئے بھی استفادہ کیا ہے، کیوں کہ اوپر والی تعبیر کے مطابق پیغمبر ان تمام لوگوں پر مبعوث تھے کہ جن تک آپ کی باتیں پہنچتی ہیں اور یہ ان تمام افراد کے لئے ہے کہ جو اس جہاں کے آخر تک اس دنیا میں قدم رکھیں گے۔

اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے منقول احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلاغ و تبلیغ قرآن سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ان کا متعین دوسری اقوام تک پہنچے حتیٰ کہ اس کے ترجموں اور مفاہیم کا دوسری زبانوں میں پہنچانا بھی آیت کے معنی میں داخل ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ (علیہ السلام) سے اوپر والی آیت کے بارے میں سوال ہوا تو حضرت (علیہ السلام) نے فرمایا: ”بکل لسان“^(۱) یعنی ہر زبان میں ہو۔

ضمنی طور پر مسئلہ اصول فقہ کے قوانین میں سے ایک قاعدہ ”قبح عقاب بلا بیان“ ہے وہ بھی اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اصول فقہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب تک کوئی حکم کسی شخص تک نہ پہنچے وہ شخص اس حکم کے لئے جواب دہ نہیں ہو سکتا (مگر یہ کہ حکم حاصل کرنے میں اس نے خود کوتاہی کی ہو) مندرجہ بالا آیت بھی یہی کہتی ہے کہ وہ لوگ کہ جن تک میری بات پہنچ جائے وہ اس کے لئے جوابدہ ہے اور اس طرح سے وہ لوگ کہ جنہیں احکام کے اصول میں کوتاہی نہ کرنے کے باوجود اصل حکم نہ پہنچا ہو کوئی مسولیت نہیں رکھتے۔

تفسیر ”المنار“ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے:

قیدیوں کا ایک گروہ آپ کے پاس لایا گیا، حضرت نے ان سے پوچھا کہ کیا انھوں نے تمہیں اسلام کی دعوت دی تھی؟ انھوں نے کہا کہ نہیں! آپ نے حکم دیا کہ انھیں رہا کر دو، اس کے بعد آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ انھیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی جگہ پر واپس چلے جائیں انھیں حقیقت اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی اور اس کی طرف انھیں دعوت نہیں دی گئی^(۲)

نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ”شی“ کا اطلاق کے جو فارسی کے لفظ ”چیز“ کا ہم معنی ہے، خدا پر کرنا جائز ہے لیکن وہ ایسی چیز ہے کہ دوسری چیزوں کے مانند نہیں ہے کہ جو مخلوق محدود ہیں بلکہ وہ خالق و نامحدود ہے۔

پھر اس کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ ان سے پوچھو ”کیا واقعات تم کو ابھی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور خدا بھی ہیں؟“ اِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهَةً اُخْرٰی ﴿﴾ اس کے بعد کہتا ہے کہ انھیں صراحت کے ساتھ کہہ دو کہ میں کبھی ایسی گواہی

نہیں دیتا، کہہ دو کہ وہ خدا ایکتا ویگانہ ہے اور جنہیں تم اس کا شریک بناتے ہو میں ان سے بری و بیزار ہوں ﴿قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ﴾
 إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ وَإِنِّى بَرِىءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۱۰﴾ -

در حقیقت آیت کے آخر میں ان چند جملوں کا ذکر ایک نفسیاتی نکتے کے لئے کیا گیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ مشرکین اس قسم کا تصور کر لیں کہ شاید ان کی گفتگو نے روح پیغمبر میں کچھ تزلزل پیدا کر دیا ہو اور وہ یہ امید لئے ہوئے مجلس سے جدا ہوں اور اپنے دوستوں کو بشارت دیں کہ شاید محمد اس کے بعد اپنی دعوت میں نظر ثانی کر لیں یہ جملے کہ جو صراحت اور قاطعیت سے سرشار ہیں اس امید کو کلی طور پر ناامیدی میں بدل رہے ہیں اور انہیں نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بات ان کے خیال و گمان سے بالکل باہر ہے اور معمولی سے معمولی تزلزل بھی آپ کی دعوت میں پیدا نہیں ہوگا اور تجربہ سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کسی بحث کے آخر میں اس قسم کے قطعی الفاظ کا ذکر آخری نتیجے تک پہنچنے کے لئے گہرا اثر رکھتا ہے۔

اور اس آیت کے بعد والی آیت میں ان لوگوں کو کہ جو اس بات کے مدعی تھے کہ اہل کتاب کسی قسم کی گواہی پیغمبر اسلام کے بارے میں نہیں دیتے صراحت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: وہ لوگ کہ جن پر ہم نے کتاب نازل کی ہے وہ پیغمبر کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح سے کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ -

یعنی وہ نہ صرف پیغمبر کے اصل ظہور اور اس کی دعوت سے آگاہ ہیں بلکہ وہ تو اس کی جزئیات و خصوصیات اور دقیق نشانیوں کو بھی جانتے ہیں، اس بنا پر کچھ اہل مکہ کہتے تھے کہ ہم نے اہل کتاب کی طرف رجوع کیا ہے لیکن انہیں بھی پیغمبر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، تو یا تو واقعا وہ جھوٹ بولتے تھے اور انہوں نے (اہل کتاب سے) تحقیق ہی نہیں کی تھی، اور یا پھر اہل کتاب نے حقائق کو چھپا لیا اور ان کے سامنے بیان نہ کیا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات ان کے حق کو پوشیدہ رکھنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس بات کی بیشتر وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں گزر چکی ہے (دیکھئے اردو ترجمہ صفحہ ۳۶۰)۔

آیت کے آخر میں ایک آخری نتیجہ کے طور پر بتاتا ہے، صرف وہی لوگ اس پیغمبر پر (ان واضح نشانیوں کے باوجود) ایمان نہیں لاتے کہ جو زندگی کے بازار تجارت میں اپنا سب کچھ گوا بیٹھے ہیں اور اپنے وجود کی تمام پونجی ہرا بیٹھے ہیں ﴿الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

۱۔ تفسیر بہان، نور الثقلین جلد ۱، صفحہ ۷۰۷ آیہ ”ہذا“ کے ذیل میں۔

۲۔ المنار، جلد ۷، صفحہ ۳۴۱۔

آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴

۲۱ ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾۔

۲۲ ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا آيِنَ شُرَكَائُكُمْ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾۔

۲۳ ﴿ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾۔

۲۴ ﴿انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

ترجمہ:

- ۲۱۔ اس شخص سے زیادہ وہ اور کون ظالم ہوگا کہ جس نے خدا پر جھوٹ باندھا (اور اس کے لئے شریک قائل ہوا) یا اس کی آیات کو جھٹلایا، یقیناً ظالم نجات کا منہ نہ دیکھ پائیں گے۔
- ۲۲۔ وہ دن کہ جس میں ہم ان سب کو محشور کریں گے تو مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ معبود کہاں ہیں کہ جنہیں تم خدا کا شریک خیال کیا کرتے تھے (وہ تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے)۔
- ۲۳۔ پھر ان کا جواب اور عذر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔
- ۲۴۔ دیکھو وہ کس طرح خود اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں اور جسے جھوٹ موٹ خدا کا شریک سمجھتے تھے اسے چھوڑ بیٹھیں گے۔

سب سے بڑا ظلم

شرک و بت پرستی کی ہر طرح سے بیخ کنی کا پروگرام دینے کے بعد اوپر والی آیت میں سے پہلی آیت میں صراحت کے ساتھ استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے: ان مشرکین سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے کہ جنہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور اس کا شرک قرار دیا اس کی آیات کی تلذیب کی ہے

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ﴾

در حقیقت پہلا جملہ انکار توحید کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جملہ انکار نبوت کی طرف اشارہ ہے اور واقعا اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ انسان بے قدر جمادات کو یا ناتواں انسان کو ایک لامحدود وجود کے مساوی قرار دے جو سارے عالم پر حکومت کرتا ہے، یہ کام تین جہت سے ظلم شمار ہوتا ہے۔

ایک ظلم اس کی ذات پاک کے ساتھ کہ اس کے لئے شریک کا قائل ہوا۔
دوسرا اپنے اور ظلم کہ اپنی حیثیت کو یہاں تک گرا دیا کہ اسے پتھر کے ایک ٹکڑے اور لکڑی کی پرستش تک نیچے لے لیا

تیسرے ایک معاشرے اور سوسائٹی پر ظلم کہ شرک کے زیر اثر تفرقہ و پراکندگی اور روح وحدت و یکہنگی سے دوری میں گرفتار ہوا۔

مسلمہ طور پر کوئی بھی ظلم خاص طور پر ایسے ظلم کہ جن کا ظلم ہر پہلو سے نمایاں ہے، سعادت و رستگاری اور نجات و فلاح کا منہ نہیں دیکھے گے ﴿إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾۔

البتہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ لفظ شرک ذکر نہیں ہوا لیکن قبل و بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو سب کی سب شرک کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے واضح ہوتا ہے کہ لفظ ”افتری“ سے اس آیت میں مراد وہی ذات الہی کے لئے شرک کی تہمت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ۱۵ مواقع پر کچھ لوگوں کا ظالم ترین اور ستمگار ترین کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اور وہ سب کے سب جملہ استقہامیہ ”وَمَنْ اَظْلَمُ“ یا ”فَمَنْ اَظْلَمُ“ (کون زیادہ ظالم ہے) کے ساتھ شروع ہوئے ہیں اگرچہ ان آیات میں سے اکثر شرک و بت پرستی اور آیات الہی کے انکار کے بارے میں ہی گفتگو کرتی ہیں یعنی ان میں اصل توجید ہی پیش نظر ہے لیکن ان میں سے بعض دوسرے مسائل کے بارے میں بھی ہے مثلاً:

”﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ اَنْ يُذَكَّرَ فِيْهَا اسْمُهُ﴾“

ان سے زیادہ اور کون شخص ظالم ہے جو مساجد میں ذکر خدا سے روکتے ہیں؟ (سورہ بقرہ، ۱۱۴)۔

ایک اور مقام پر ہے: ”﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةَ عِنْدَهُ مِنْ اللّٰهِ﴾“

ان سے بڑھ کر اور کون ظالم ہیں جو شہادت کو چھپاتے ہیں (بقرہ، ۱۴۰)۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ گروہوں میں سے ہر گروہ ہی سب سے بڑھ کر ظالم ہوں جب کہ ”ظالم ترین“ کا لفظ تو ان میں سے صرف ایک گروہ پر ہی صادق آتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ان سب امور کی حقیقت میں ایک ہی جڑ ہے اور وہ ہے شرک، کفر اور عناد۔ کیوں کہ لوگوں کو مساجد میں ذکر خدا سے منع کرنا اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرنا کفر و شرک کی نشانی ہے، اسی

طرح شہادت کو چھپانا ہے کہ ظاہری طور پر اس سے مراد حقائق پر شہادت کو چھپانا ہے جو وادی کفر میں لوگوں کے بھٹکنے کا سبب بنتا ہے لہذا یہ بات بھی شرک و کفر اور خدائے یگانہ کے انکار کی مختلف قسموں میں ہے۔

بعد والی آیت میں مشرکین کے انجام کے سلسلے میں بحث ہوگے، تاکہ واضح ہو جائے کہ انھوں نے بتوں جیسی کمزور مخلوق پر بھروسہ کر کے نہ اس دنیا میں اطمینان و راحت حاصل کیا ہے اور نہ ہی دوسرے جہاں میں، ارشاد الہی ہے:

اس روز جب ہم ان سب کو ایک ہی جگہ مبع (علیہ السلام) واث کمریں، اور مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ بناوٹی معبود جنھیں تم خدا کا شریک خیال کرتے تھے کہاں ہیں؟ اور وہ تمہاری مدد کے لئے کیوں نہیں آتے؟ اور کسی قسم کا اثر ان کی قدرت نمائی کا اس وحشتناک عرصہ قیامت میں کیوں نظر نہیں آتا ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾ -

کیا اصل بنیاد یہی نہ تھی کہ وہ مشکلات میں تمہاری مدد کریں گے؟ اور کیا تم نے بھی اسی امید پر ان کی پناہ حاصل نہیں کی تھی؟ تو پھر ان کا یہاں پر کوئی معمولی سے معمولی اثر بھی کیوں دکھائی نہیں دیتا؟۔

وہ ہکا بکارہ جانیں گے اور عجیب و غریب وحشت و حیرت میں ڈوب جائیں گے اور اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ قسم کھا کر کہنے لگے کہ: ”خدا کی قسم ہم کبھی مشرک نہیں تھے“ ان کا گمان یہ ہوگا جیسے وہاں بھی حقائق کا انکار کیا جاسکتا ہے ﴿ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾ اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں لفظ ”فتنہ“ کس معنی میں ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض اسے فروتنی اور معذرت کے معنی میں لیتے ہیں، بعض جواب کے معنی میں لے لے رہے ہیں اور بعض نے شرک کے معنی میں لیا ہے (۱)۔

آیت کی تفسیر میں یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ ”فتنہ وافتنان“ سے مراد ان کا وہی دلی میلان ہو، یعنی ان کے شرک و بت پرستی سے ان کے لگاؤ کا نتیجہ کہ جس نے ان کی عقل و فہم پر پردہ ڈال رکھا ہوگا کہ قیامت کے دن جب پردے ہٹ جائیں گے تو اس وقت وہ اپنی بڑی خطا کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے اعمال سے بیزاری اختیار کریں گے اور ان سے کلی طور پر انکار کر دیں گے۔

لغت میں ”فتنہ“ کا اصل معنی جیسا کہ ”راغب“ مفردات میں کہتا ہے کہ سونے کو آگ میں ڈال دیں اور اسے تیز آنچ دیں تاکہ اس کا باطن ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ کھرا ہے کہ کھوٹا، اس معنی کو اوپر والی آیت میں تفسیر کے

طور پر قبول کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ لوگ جب قیامت کے دن سخت پریشانی اور اس دن کی وحشتوں میں غرق ہوں گے تو پھر انھیں ہوش آئے گا اور وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہوں گے اور اپنی نجات کے لئے اپنے گزشتہ اعمال کا انکار کریں گے۔ بعد والی آیت میں اس مقصد سے کہ لوگ ان کے رسوا کن انجام سے عبرت حاصل کریں کہا گیا کہ: اچھی طرح غور کرو اور دیکھو کہ ان کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انھوں نے اپنی روش اور مسلک سے کاملاً بیزاری اختیار کر لی ہے اور اس کا انکار کرتے ہیں یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے جھوٹ بولتے ہیں ﴿انظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ﴾۔ اور تمام سہارے جو انھوں نے اپنے لئے اختیار کئے ہوئے تھے اور انھیں خدا کا شریک سمجھتے تھے ہاتھ سے دیں بیٹھے گے اور ان کی کہیں بھ رسائی نہیں ہوگی ﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ”انظر“ سے مراد مسلمہ طور پر عقل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنا، کیوں کہ قیامت کا میدان اس دنیا میں ظاہری نہیں دیکھا جاسکتا۔

۲۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر جھوٹ باندھا تو اس کا معنی کہ انھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو فریب دیا اور راہ حق سے نکل گئے، یا یہ کہ دوسرے جہاں میں جو قسم کھا رہیں ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے تو یہ حقیقت میں وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں کیوں کہ مسلمہ طور پر وہ مشرک تھے۔

۳۔ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا کہ مشرکین اپنے سابقہ شرک کا قیامت کا دن انکار کر دیں گے جب کہ روز قیامت کی کیفیت اور حقائق کا حسی طور پر مشاہدہ اس طرح سے ہوگا کہ کسی شخص کو یہ مجال نہ ہوگی کہ حق کے خلاف کوئی بات کرے، بالکل اس طرح سے جیسے کوئی جھوٹے سے جھوٹا آدمی بھی ہمیں ایسا دیکھائی نہیں دیتا جو روز روشن میں سورج کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہے کہ فضا تاریک ہے، اس کے علاوہ بعض دوسری آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روز قیامت صراحت کے ساتھ اپنے شرک کا اقرار کر لیں گے اور کسی حقیقت کو نہیں چھپائیں گے مثلاً: ﴿وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا﴾ (نساء ۴۲)۔

اس سوال کے دو جواب دئے جاسکتے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ قیامت کے کئے مراحل ہوں گے، ابتدائی مراحل میں مشرکین خیال کریں گے کہ جھوٹ بول کر بھی خدا کے دردناک عذاب اور سزا سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے لیکن وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق جھوٹ بولیں

گے لیکن بعد کے مراحل میں جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ اس طریقہ سے بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر اپنے اعمال کا اعتراف کر لیں گے حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے رفتہ رفتہ پردے ہٹیں گے، ابتدا میں جب کہ مشرکوں نے اپنے نامہ اعمال کا غور سے مطالعہ نہیں کیا ہوگا تو جھوٹ کا سہارا لیں گے لیکن بعد کے مراحل میں جب پردے پوری طرح اٹھ جائیں گے اور تمام چیزیں نظروں کے سامنے ہوں گی تو پھر انھیں اعتراف کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا۔

ٹھیک مجرموں کی طرح جو ابتدائی تفتیش میں تمام باتوں سے، یہاں تک کہ اپنے دوستوں سے شناسائی کا بھی انکار کر دیتے ہیں لیکن جب ان کی جرم کی اسناد اور منہ بولتی دستاویزات دیکھائی جاتی ہیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ معاملہ اتنا واضح ہے کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں لہذا پھر وہ اعتراف بھی کر لیتے ہیں اور سب کچھ اگل دیتے ہیں۔

یہ جواب امیر المومنین (علیہ السلام) سے ایک حدیث میں نقل ہوا ہے^(۲)۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اوپر والی آیت ان افراد کے بارے میں ہے جو حقیقت میں اپنے آپ کو مشرک نہیں سمجھتے تھے، مثلاً عیسائی، جو تین خداؤں کے قائل ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو موحد خیال کرتے ہیں، یا یہ آیت ایسے اشخاص کے بارے میں ہے جو توحید کے نعرے لگاتے تھے، لیکن ان کے عمل سے شرک کی بو آتی تھی کیوں کہ وہ انبیاء کرام کے احکام پائیوں کے نیچے روندتے تھے، غیر خدا پر بھروسہ رکھتے اور خدا کے اولیاء کا انکار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود خود کو موحد سمجھتے تھے، یہ لوگ قیامت کے دن قسم کھائیں گے کہ ہم تو موحد تھے لیکن بہت جلد ہی انھیں سمجھا دیا جائے گا کہ وہ باطن میں مشرکین میں داخل تھے، یہ جواب بھی کئی ایک روایات میں حضرت علی علیہ السلام اور حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے^(۳)۔

اور دونوں جواب قابل قبول ہیں۔

۱۔ جب یہ لفظ معذرت اور جواب کے معنی میں لیا جائے گا تو اس صورت میں آیت کسی لفظ کے مقدر ہونے کی محتاج نہیں ہوگی، لیکن اگر شرک کے معنی میں ہو تو ضروری ہے کہ لفظ ”نتیجہ“ کو مقدر مانا جائے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قسم کھائیں گے کہ وہ مشرک نہیں تھے۔

۲۔ نور الثقلین، جلد اول، صفحہ ۷۰۸۔

۳۔ نور الثقلین، جلد اول، صفحہ ۷۰۸۔

آیات ۲۵، ۲۶

۲۵ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ يَرَوْا كَلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّى إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ -
 ۲۶ ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ -
 ترجمہ:

۲۵- ان میں سے کچھ لوگ تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں تاکہ وہ انہیں نہ سمجھے، اور ہم نے کانوں کو بوجھل کر دیا ہے اور وہ (اس قدر ہٹ دھرم ہیں) کہ اگر حق کی تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑنے لگتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو پرانے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۲۶- وہ دوسروں کو اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دوری اختیار کرتے ہیں، اپنے سوا وہ کسی کو ہلاک نہیں کرتے لیکن سمجھتے نہیں۔

حق قبول نہ کرنے والوں کا طرز عمل

اس آیت میں بعض مشرکین کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حقائق سننے کے لئے خود سے ذرہ بھر توجہ بھی نہیں دیتے، یہ تو ایک معمولی سی بات ہے، وہ تو اس سے دشمنی پر بھی اتر آتے ہیں اور تہمتوں کے ذریعہ خود کو اور دوسروں کو بھی اس سے دور رکھتے ہیں، ان کے بارے میں یوں کہا گیا ہے: ان میں سے بعض تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دئے ہیں، تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں، اور ان کے کانوں میں ہم نے بوجھل پن پیدا کر دیا ہے تاکہ وہ اسے نہ سنے ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا﴾^(۱)

حقیقت میں زمانہ جاہلیت کے اندھے تعصبات اور مادی منافع میں غرق ہوتے چلے جانا اور ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ان کے عقل و ہوش ہر اس طرح غالب آگیا ہے کہ گویا وہ پردے کے نیچے آگئے ہیں (جس کی وجہ) ناتواہ کسی حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی مسائل کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔

ہم یہ بات کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس قسم کے مسائل کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ حقیقت میں قانون ”علیت“ اور خاصیت عمل کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کج روی میں تسلسل اور ہٹ دھرمی اور بے دینی پر اصرار کا اثر یہ ہے کہ انسان کی روح بھی اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور یہ اعمال انسان کو ٹیڑھے آئینے کی طرح بنا دیتے ہیں کہ (اس ٹیڑھے آئینے میں) ہر چیز کج اور ٹیڑھی ہی نظر آتی، تجربے نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بدکار اور گناہگار افراد ابتدا میں اپنے برے کام سے پریشان اور بے آرام ہوتے ہیں لیکن پھر تدریجاً اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور شاید ایسا دن بھی آجائے کہ وہ اپنے برے اعمال کو واجب اور ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ ان کی حق سے مخالفت اور کرنے اور گناہ پر ہٹ دھرمی اور اصرار کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے کہ جو ہٹ دھرم گناہگاروں کے دامن سے چمٹ جاتی ہے۔

اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ: اگر وہ تمام آیات خدا اور اس کی نشانیوں کو بھی دیکھ لیں تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا﴾۔

اور اس بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے دل کے کانوں کو تیری باتوں کی طرف متوجہ کریں اور کم اسے کم ایک حق کے متلاشی کی طرح کوئی نہ کوئی حقیقت معلوم ہو جانے کے احتمال میں بھی اس کے بارے میں کچھ غور کریں، وہ منفی روح اور منفی فکر کے ساتھ تیرے سامنے آتے ہیں اور لڑنے، جھگڑنے اور اعتراض کرنے کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ﴾۔

وہ تیری باتوں کو سن کر جو چشم وحی سے وحی سے نکلی ہے اور تیری حق گو زبان پر جاری ہوئی ہے تجھ پر تہمت لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بات گزشتہ انسانوں کے گھڑے ہوئے قصوں اور افسانوں کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی ﴿يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾۔

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف اتنی بات پر ہی قناعت نہیں کرتے اور باوجود اس کے کہ وہ خود گمراہ ہیں ہمیشہ اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ حق کے متلاشی لوگوں کو اپنی طرح طرح کی زہر افشانیوں کے ذریعے اس راستے پر چلنے سے روک لیں لہذا وہ انھیں پیغمبر کے قریب جانے سے منع کرتے ہیں ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ﴾۔

اور خود بھی اس سے دور دور ہی رہتے ہیں ﴿وَيَنْتَهِونَ عَنْهُ﴾ (۲)۔

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جو شخص حق کے سامنے الجھے اور اس سے بیر رکھے اس نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اور انجام کار قانون آفرینش کے مسلمہ اصول کے مطابق حق کا چہرہ باطل کے بادلوں اوٹ سے نمایا ہو جاتا ہے اور ”حق“ میں جو قوت جاذبہ پائی جاتی ہے اس سے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور باطل اس بے قدر و قیمت چھاگ کی طرح جو پانی کے اوپر آجاتا ہے نابود ہو کر رہے گا، اس بنا پر ان کی کوشش اور فعالیت ان کی اپنی ہی شکست پر انجام پذیر ہوگی اور وہ خود اپنے سوا اور کسی کو بھی ہلاک نہیں کریں گے لیکن ان میں اس حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں ہے ﴿وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾۔

۱۔ اکثہ ”جمع“ ”کنان“ ”بروزن“ ”کتاب“ پردہ کے معنی میں ہے، یا ہر وہ چیز جو چھپا دے اور ”قر“ کان کے بوجھل ہونے کے معنی میں ہے۔

۲۔ ینئون ”نائی“ کے مادہ سے ہے جو بروزن ”سعی“ ہے دوری اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔

مومن قریش حضرت ابوطالب (علیہ السلام) پر ایک بہت بڑی تہمت

اوپر والی آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت ان بحثوں سے متعلق ہے جو ہٹ دھرم مشرکین اور پیغمبر کے سخت ترین دشمنوں میں ہے ”ہم“ کی ضمیر عربی ادب کے قواعد کے مطابق ان لوگوں کی طرف لوٹی ہے جن کے بارے میں اس آیت میں بحث کی گئی ہے یعنی وہ متعصب کافر جو پیغمبر کی دعوت کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے اور آزار پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے تھے۔

لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اہل سنت کے بعض مفسرین میں عربی ادب کے تمام قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسری آیت کو پہلی آیت سے علیحدہ کر کے اسے حضرت ابوطالب (علیہ السلام) یعنی امیر المومنین علی (علیہ السلام) کے والد کے لئے قرار دے دیا کرتے ہیں، وہ آیت کا اس طرح معنی کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر اسلام کا دفاع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس سے دور رہتے ہیں ﴿وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ﴾۔

اور وہ قرآن کی کچھ اور آیات کہ جن کے بارے میں ان کے اپنے مقام پر اشارہ ہوگا مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۴ اور سورہ قصص کی آیت ۵۶ کو بھی اپنے مدعا پر گواہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن تمام علماء شیعہ اور اہل سنت کے بعض بزرگ علما مثلاً ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ نے اور قسطلانی نے ارشاد الساری میں اور زینی دحلان نے سیرۃ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالب کو مومنین اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے، اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے مہری اور اتہام کا محل کیوں قرار پائے ہیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام کا دفاع کیا کرتا تھا اور بارہا خود اپنے آپ کو اور اپنے فرزند کو اسلام کے وجود مقدس کو بچانے کے لئے خطرات کے موقع پر ڈھال بنا دیا کرتا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے

یہی سبب ہے کہ دقت نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالب کے مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ ہے جو شجرہ خیشہ بنی امیہ کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیوں کہ یہ صرف حضرت ابوطالب کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ ایسے حملہ کی زد میں آئی ہو بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نزدیکی رکھتا ہے ایسے ناجوانردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا، حقیقت میں حضرت ابوطالب کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام جیسے عظیم پیشوا اسلام کے باپ تھے۔

ہم یہاں پر ان بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمان ابوطالب کی گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں، تفصیلات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوطالب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کا بھتیجہ مقام نبوت تک پہنچے گا کیوں کہ مورخین نے لکھا ہے کہ جس سفر میں حضرت ابوطالب قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سال کے بھتیجے محمد کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس سفر میں انھوں نے آپ سے بہت سی کرامات مشاہدہ کیں، ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جو نہی قافلہ بحیرانامی راہب کے قریب سے گزرا جو قدیم عرصے سے ایک گرجے میں مشغول عبادت تھا اور کتب عہدین کا عالم تھا اور تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لئے جاتے تھے تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد پر جم کر رہ گئیں، جن کی عمر اس وقت بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بحیرانے تھوڑی دیر کے لئے حیران و ششدر رہنے اور گہری اور پر معنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا: یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب کی طرف اشارہ کیا، انھوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجہ ہے۔

”بحیرا“ نے کہا: اس بچے کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کی آسمانی کتابوں میں خبر دی ہے اور میں نے اس کی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہے (۱)۔

ابوطالب اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہل سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل و نحل) اور دوسرے علماء کی نقل کے مطابق ایک سال آسمان مکہ نے اپنی برکت اہل مکہ سے روک لی اور سخت قسم کے قحط سالی نے لوگوں کا رخ کیا تو ابوطالب نے حکم دیا کہ ان کے بھتیجے محمد کو جو ابھی شیر خوار ہی تھے لایا جائے، جب بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی پوٹڑے میں لپٹا ہوا تھا انھیں دیا گیا تو وہ اسے لینے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تضرع و زاری کے ساتھ اس طفل شیر خوار کو تین مرتبہ اوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے: پروردگارا، اس بچہ کے حق کا واسطہ ہم پر برکت والی بارش نازل فرما، کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق کے کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا کہ یہ خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے، اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے کہ یہی واقعہ جو ابوطالب کے اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت و رسالت سے آگاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے ان کے پیغمبر پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابوطالب نے اشعار ذیل اسی واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے۔

و ابیض یستقی الغمام بوجھ شمال الیتامی عصمة للارامل۔

”وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برستے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور یتیموں کے محافظ ہیں“۔ یلوذ بہ الهلاک من آل ہاشم فہم عندہ فی نعمۃ وفواضل۔

”بنی ہاشم میں سے جو چل بسے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں اور احسانات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں“۔

ومیزان عدل لا یخیس شعیرۃ ووزان صدق وزن غیر ہائل۔

”وہ ایک ایسی میزان عدالت ہے کہ جو ایک جو برابر بھی ادھر ادھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے کہ جس کے وزن کرنے میں کسی شک و شبہ کا خوف نہیں ہے“۔

قحط سالی کے وقت قریش کا ابوطالب کی طرف متوجہ ہونا اور ابوطالب کا خدا کو آنحضرت کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مورخین نے بھی نقل کیا ہے، علامہ ابنی نے اسے اپنی کتاب ”الغیر“ میں ”شرح بخاری“ ”المواہب اللدنیہ“ ”الخصائص الکبریٰ“ ”شرح بہجۃ المحافل“ ”سیرہ حلبی“ ”سیرہ نبوی“ اور ”طلبۃ الطالب“ سے نقل کیا ہے (۲)۔

۲۔ اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابوطالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں، ان میں سے کچھ اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:- واللہ لن یصلوا الیک بجمعہم حتی اوسد فی التراب دفینا۔
 ”اے میرے بھتیجے خدا کی قسم جب تک ابوطالب مٹی میں نہ سو جائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنا لے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

فاصدع بامرک ما علیک غضا ضة وابشر بذاک وقر منک عیونا۔
 ”لہذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کر، بشارت دے اور آنکھوں کو ٹھنڈا لے۔“
 ودعوتنی وعلمت انک ناصحی ولقد دعوت وکنت ثم اینا
 ”تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف و مقصد صرف پند و نصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہی۔“

ولقد علمت ان دین محمد (ص) من خیر ادیان البریة دینا^(۳)۔
 ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمد کا دین و مکتب تمام دینوں اور مکتبوں میں سب سے بہتر ہے۔“
 اور یہ اشعار بھی انھوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں: الم تعلموا ان وجدنا محمدا رسولا کموسی خط فی اول الکتب
 ”اے قریش کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ محمد موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشن گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پایا ہے۔“
 وان علیہ فی العباد محبة ولا حیف فی من خصه اللہ فی الحب^(۴)

”خدا کے بندے اس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے مخصوص کر لیا ہو اس شخص سے لگاؤ بے موقع نہیں ہے۔“

ابن ابی الحدید نے جناب ابوطالب کے کافی اشعار نقل کرنے کرنے کے بعد (کہ جن کا مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے ”تشاہد القرآن“ میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے:

ان تمام اشعار کے تمام مطالعہ سے ہمارے لئے کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ابوطالب اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے۔

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نیت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت کی ان کے فداکار چچا ابوطالب کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں، منجملہ ان کے کتاب ”ابوطالب مومن قریش“ کے مولف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابوطالب (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی تو پیغمبر اکرم نے ان کی تشیع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے زمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپ کر رہے تھے آپ یہ بھی کہتے تھے:

”وابتاه! واباطالباه! واحزنناہ علیک، کیف اسلو علیک یا من ربیتنی صغیر-واجبتنی کبیرا، وکنت عندک بمنزلۃ العین من الحدقہ والروح من الجسد“ (۵)

ہائے میرے بابا! ہائے ابوطالب! میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں، کس طرح آپ کی مصیبت کو میں بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش اور تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانہ چشم میں اور روح بدن میں۔

نیز آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے: ”ما نالت منی قریشا شیئا اکرهہ حتی مات ابو طالب“ (۶)

”اہل قریش اس وقت تک کبھی میرے خلاف نہ پسندیدہ اقدام نہ کر سکے جب تک ابوطالب کی وفات نہ ہوگی“

۴۔ ایک طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم کو ابوطالب کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابوطالب کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہر محبت کا اختیار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابوطالب سے عشق کی حد تک مہر و محبت رکھیں۔

۵۔ ان احادیث میں بھی کہ جو اہل بیت پیغمبر کے طرق سے ہم تک پہنچی ہیں حضرت ابوطالب کے ایمان و اخلاص کے بڑے کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، کہ جن کا یہاں نقل کرنا طول کا باعث ہوگا، یہ احادیث منطقی اور عقلی استدلال کی حامی ہیں، ان میں سے ایک حدیث جو چھوٹے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابوطالب مومن تھے؟ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا:

ان ہنا قوما یزعمون انہ کافر اس کے بعد فرمایا:-

واعجباً كل العجب ايطعنون على ابى طالب او على رسول الله (صلى الله عليه وآله وسلم) وقد نجاه الله ان تقر مومنة مع كافر غير آية من القرآن ولا يشك احد ان فاطمة بنت اسد (رضى الله تعالى عنها) من المومنات السابقات فانها لم تزل تحت ابى طالب حتى مات ابو طالب رضى الله عنه“

”یعنی تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابو طالب کافر تھے، کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ کس عقیدہ کے ساتھ پیغمبر اور ابو طالب پر طعن کرتے ہیں، کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلم ہے کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور وہ ابو طالب کی زوجیت میں ابو طالب کی وفات تک رہیں“ (۷)

۶۔ ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے اگر ہر چیز میں ہی شک کریں تو کم از کم اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ابو طالب اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجہ اول کے حامی و مددگار تھے، ان کی اسلام اور پیغمبر کی حمایت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصبات سے نتھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا زندہ نمونہ شعب ابو طالب (علیہ السلام) کی داستان ہے، تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرم اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کر لیا اور اپنے ہر قسم کے روابط ان سے منقطع کر لیے تو آنحضرت کے واحد حامی اور مدافع ابو طالب (علیہ السلام) اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا اور برابرتین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا اور بنی ہاشم کو ایک درے کی طرف لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور شعب ابو طالب (علیہ السلام) کے نام سے مشہور تھا اور وہاں پر سکونت اختیار کر لی، ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کہ قریش کے حملوں سے بچانے کے لئے کئی ایک مخصوص قسم کے برج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرم کو ان کے بستر سے اٹھاتے اور دوسری جگہ ان کے آرام کے لئے مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علی (علیہ السلام) کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علی (علیہ السلام) کہتے، بابا جان! میں تو اس حالت میں قتل ہو جاؤں گا تو ابو طالب (علیہ السلام) جواب میں کہتے: میرے پیارے بچے بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ موت کی طرف رواں دواں ہے، میں نے تجھے فرزند عبد اللہ (علیہ السلام) کا فدیہ قرار دے دیا ہے، یہ بات اور بھی طالب توجہ ہے کہ حضرت علی (علیہ السلام) باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان! میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں راہ محمد میں قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا

پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کا اطاعت گزار اور احمد مجتبیٰ کی نصرت کے و مدد کے لئے آمادہ و تیار ہوں۔^(۸)

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب (علیہ السلام) کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے

گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہم صدا ہو کر کہے گا:

ولولا ابوطالب وابناہ لما مثل الدین شخصا وقاما

فذاک بمکة آوی وحامی وهذا بیثرب جس الحماما^(۹)

”اگر ابوطالب اور ان کا بیٹا نہ ہوتے تو ہرگز دین و مکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا قد سیدھا نہ کرتا۔

ابوطالب تو مکہ میں پیغمبر کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور علی (علیہ السلام) یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ گردان موت میں ڈوب گئے۔“

۱۔ تلخیص از سیرہ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۱۹۱، اور سیرہ حلبی، جلد اول، صفحہ ۱۳۱، اور دیگر کتب۔

۲۔ الغدیر جلد ہفتم، صفحہ ۳۴۶۔

۳۔ و ۴۔ خزائن الادب، تاریخ ابن کثیر، شرح ابن ابی الحدید، فتح باری، بلوغ الادب، تاریخ ابوالفدا، سیرہ نبوی و---- (یہ حوالہ جات الغدیر جلد ۸ کے مطابق درج کئے گئے ہیں)۔

۵۔ ”شیخ الاباطح“ بنقل از ابوطالب مومن قریش۔

۶۔ طبری: مطابق نقل ابوطالب مومن قریش۔

۷۔ کتاب الحج، درجات الرفیعہ بنقل از الغدیر، جلد ۸۔ ۸۔ الغدیر، جلد ۸۔

۹۔ الغدیر، جلد ۸۔

آیات ۲۸، ۲۷

۲۷ ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَالَيْتَنَّا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾۔

۲۸۔ ﴿بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾۔

ترجمہ:

۲۷۔ اگر تم (ان کی حالت) دیکھو جس وقت وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش ہم (دوبارہ دنیا کی طرف) پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی باتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔

۲۸۔ (وہ واقع میں پشیمان نہیں ہیں) بلکہ ان کے وہ اعمال و نیات جنہیں وہ پہلے چھپائے ہوئے تھے ان کے سامنے آشکار ہوں گے (اور وہ وحشت میں پڑ گئے ہیں) اور اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہیں اعمال کی طرف پلٹ جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے، اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

وقتی اور بے اثر بیداری

گذشتہ دو آیات میں مشرکین کی ہٹ دھرمی کے کچھ اعمال کی طرف اشارہ ہوا تھا اور وہ ان دو آیات میں ان کے اعمال کے نتائج کا منظر مجسم ہوا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ انہیں کیسا برا انجام درپیش ہے اور وہ بیدار ہو جائیں یا کم از کم ان کی کیفیت دوسروں کے لئے باعث عبرت۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان کی حالت جب وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے، دیکھو، تو تم تصدیق کرو گے کہ وہ کس دردناک انجام و عاقبت میں گرفتار ہوئے ہیں ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ﴾^(۱)۔

وہ اس حالت سے اس طرح منقلب ہوں گے کہ داد و فریاد کریں گے کاش اس سرنوشت شوم سے نجات اور مرے کاموں کی تلافی کے لئے دوبارہ دنیا میں پلٹ جاتے، اور وہاں آیات خدا کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین کی صف میں قرار

پاتے ﴿فَقَالُوا يَالَيْتَنَّا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾^(۲)

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ جھوٹی آرزو ہے بلکہ یہ اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں جو عقائد، نیتیں اور اعمال انہوں نے چھپا رکھے تھے وہ سب ان کے سامنے آشکار ہو گئے ہیں اور وہ وقتی طور پر بیدار ہوئے ہیں (بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ)۔

لیکن یہ پائیدار اور محکم اور بیداری نہیں ہے، اور مخصوص حالات میں پیدا ہوئی ہے لہذا اگر بغرض محال وہ دوبارہ اس جہاں می پلٹ بھی جائیں تو انھیں کاموں کے پیچھے لپکے گے جن سے انھیں روکا گیا ہے ﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾۔
 اس بنا پر وہ اپنی آرزو اور مدعا میں سچے نہیں ہیں اور وہ جھوٹ بولتے ہیں ﴿وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾۔

۱۔ اس بنا پر ”لو“ بمعنی شرط ہے اور اس کی جزا و وضاحت کی وجہ سے محذوف ہے۔

۲۔ اہم نکتہ کہ جس کی طرف توجہ کرنا چاہئے کہ ”مشہور قرائت کے مطابق جو دسترس میں ہے“ ”نزد“ رفع کے ساتھ اور ”الانکذب“ اور ”نکون“ نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے، حالانکہ ظاہر ایک دوسرے پر معطوف ہیں لہذا تمام کو ایک جیسا ہونا چاہیے، اس کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ ”نزد“ جزاء تمنی ہے اور ”الانکذب“ حقیقت میں اس کا جواب ہے اور ”واو“ یہاں منزلہ ”فاء“ کے ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمنی کا جواب جب ”فاء“ کے بعد ہو تو منصب ہوتا ہے، فخر الدین رازی، مرحوم طبرسی، اور ابوالفتح رازی جیسے مفسرین نے اس کی اور وجہ بھی ذکر کی ہیں، لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ واضح ہے اس بنا پر آیت سورہ ”زمر“ کی آیہ ۵۸ کے مثابہ ہے جو اس طرح ہے: لو ان لی کرۃ فاکون من المحسنین“۔

چند اہم نکات

۱۔ ”بدالہم“ (ان کے لئے آشکار ہوا) سے ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے ایک سلسلہ کو نہ صرف لوگوں سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی مخفی رکھتے تھے جو قیامت کے دن ان پر آشکار ہو جائیں گے اور یہ مقام تعجب نہیں ہے کہ انسان کسی حقیقت کو خود اپنے آپ تک سے بھی مخفی رکھے اور اپنے وجدان اور فطرت پر پردہ ڈال دے تاکہ وہ جھوٹا اطمینان حاصل کرے۔

وجدان کو فریب دینے کا مسئلہ اور حقائق کو اپنے آپ سے چھپانا اہم مسائل میں سے ہے کہ جس پر وجدان کی فعالیت سے مربوط بحثوں میں خصوصی غور و فکر کیا گیا ہے، مثلاً ہم بہت سے ہوس پرست افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہوس آلود اعمال کے شدید نقصان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس سبب سے کہ راحت کے خیال سے اپنے اعمال کو جاری رکھیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس آگاہی کو اپنے اندر ہی چھپائیں رکھیں۔

لیکن بہت سے مفسرین نے لفظ ”لہم“ کی تعبیر کی طرف کے بغیر آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ ایسے اعمال پر منطبق ہو کہ جنہیں وہ لوگوں سے مخفی رکھتے تھے (غور کیجیے)۔

۲۔ ممکن ہے کہا جائے کہ آرزو کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں جھوٹ یا سچ ہو اور وہ اصطلاح میں ”انشاء“ کی ایک قسم اور ”انشاء“ میں جھوٹ یا سچ کا وجود ہی نہیں ہوتا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ بہت سے ”انشاء“ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ کسی خبر کا مفہوم بھی موجود ہوتا ہے، جن میں صدق یا کذب کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً بعض اوقات پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میری تمنا یہ ہے کہ خدا مجھے بہت سا مال دے تو میں تمہاری مدد کروں، یہ ایک آرزو ہے، لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا مجھے ایسا مال دیدے تو مجھے میں تمہاری مدد کروں گا اور یہ ایک خبری مفہوم ہے، جو ہو سکتا ہے جھوٹا ہو، لہذا مد مقابل جو اس کی بخل اور تنگ نظری سے آگاہ ہے کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اگر خدا تجھے دے بھی دے تو پھر بھی تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا (ایسی صورت بہت سے انشائی جملوں میں نظر آتی ہے)۔

۳۔ یہ جو ہم آیت میں پڑھتے ہیں کہ اگر وہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو دوبارہ وہی کام کرنے لگے گے، یہ اس بنا پر ہے کہ بہت سے لوگ جس وقت اپنی آنکھ سے اپنے اعمال کے نتائج دیکھتے ہیں، یعنی مرحلہ شہود کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ وقتی طور پر پریشان اور پشیمان ہو کر یہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اعمال کی تلافی کر سکیں، لیکن یہ ندامت اور پشیمانیوں جو اسی حال شہود اور اعمال کا نتیجہ دیکھنے سے مربوط ہے، ناپائیدار ہوتی ہے جو تما لوگوں میں عینی سزاؤں کا

سامنا کرتے وقت پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن جب مشاہدات عینی برطرف ہو جاتے ہیں تو یہ خاصیت بھی زائل ہو جاتی ہے اور سابقہ کیفیت پلٹ آتی ہے۔

انہیں بت پرستوں کی طرح کہ جو سمندر کے سخت طوفانوں میں گرفتار ہونے پر اور خود کو موت اور فنا کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ کر خدا کے سوا تمام چیزیں بھوکل جاتے ہیں لیکن جو نہی طوفان رکتا ہے اور وہ امن و امان کے مسائل تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمام چیزیں اپنی جگہ پلٹ آتی ہیں^(۱)۔

۴۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہئے کہ مذکورہ بالا حالات بت پرستوں کی ایک خاص جماعت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ سب بت پرست ایسے تھے، لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر مامور تھے کہ باقی تمام کو پسند و نصیحت کریں، انہیں بیدار کریں اور ہدایت کریں۔

آیات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲

۲۹ ﴿وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ -

۳۰ ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَحْمَةٍ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ -

۳۱ ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ

أُوزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ أَلَسَاءَ مَا يَرْزُونَ﴾ -

۳۲ ﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ -

ترجمہ:

۲۹- انھوں نے کہا: اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ کمر کے اٹھائے نہیں جائیں گے۔

۳۰- اگر تم انہیں اس وقت دیکھو جب وہ اپنے پروردگار (کی عدالت) کے سامنے کھڑے ہوں گے تو انہیں کہا جائے گا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے: جی ہاں، ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے)، تو وہ کہے گا: جس بات کا تم انکار کیا کرتے تھے اس کی سزائیں اب عذاب کا مزہ چکھو۔

۳۱- جنھوں نے لقاے پروردگار کا انکار کیا مسلمہ طور پر انہوں نے نقصان اٹھایا (اور یہ انکار ہمیشہ رہے گا) یہاں تک کہ قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس کہ ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کی، وہ اپنے گناہوں کا (بھاری بوجھ) اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے اور کیسا برا بوجھ ہے جو انھوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہوگا۔

۳۲- اور دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں، کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

تجھ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی گئی ہے مگر

پہلی آیت کی تفسیر میں دو احتمال ہیں، ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے مشرکین کی گفتگو کے بعد ہونے والی حالت کی نشاندہی ہے جو قیامت کا منظر دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور تلافی کریں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ پلٹ بھی جائیں تو نہ صرف یہ کہ تلافی کی فکر نہیں کریں گے اور اپنے کاموں کو

جاری رکھیں گے بلکہ اصلاً دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانے اور قیامت ہی کا انکار کر دیں گے اور بڑے تعجب کے ساتھ کہیں گے تو زندگی تو صرف یہ دنیاوی زندگی ہی ہے اور اب ہم کبھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے نہیں جائیں گے ﴿وَقَالُوا إِنَّمَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ (۱)

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک ایسے گروہ کے بارے میں جو معاد کا بالکل ہی انکار کرتے تھے اور یہ ایک جدا بحث بیان کر رہی ہے کیوں کہ مشرکین عرب میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو معاد کا عقیدہ نہیں رکھتی تھی جب کہ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح معاد پر ایمان رکھتے تھے۔

بعد کی آیت میں قیامت کے دن ان کے انجام کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے قرآن یوں کہتا ہے: اگر تم اس وقت انہیں دیکھو کہ جب وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کیا یہ حق نہیں ہے ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يُقَالُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ﴾ تو وہ جواب میں کہیں گے: جی ہاں! ہمارے پروردگار کی قسم یہ حق ہے ﴿قَالُوا بَلَىٰ وَرَبَّنَا﴾۔

دوبارہ ان سے کہا جائے گا: پس تم عذاب اور سزا کا مزہ چکھو، کیوں کہ تم اس کا انکار کیا کرتے تھے اور کفر کرتے تھے ﴿قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾۔

مسئلہ طور پر (پروردگار کے سامنے کھڑے ہونا) یہ نہیں ہے کہ خدا کوئی مکان رکھتا ہو بلکہ یہ اس کی سزا کے سامنے کھڑے ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے یا یہ عدالت الہی میں حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ نماز کے وقت انسان یہ کہتا ہے کہ میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں۔

بعد والی آیت میں معاد و قیامت کا انکار کرنے والوں کے نقصان اور گھاٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جنہوں نے پروردگار کی ملاقات کا انکار کیا ہے مسئلہ طور پر نقصان میں گرفتار ہے ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ﴾۔

جیسا کہ پہلے اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے پروردگار کی ملاقات سے مراد یا تو ملاقات معنوی اور ایمان شہودی (شہود باطنی) یا میدان قیامت اور اس کی جزا و سزا کے مناظر سے ملاقات ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ انکار ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رہے گا اور یہ صرف اس وقت تک ہوگا جب اچانک قیامت پر ہوا جائے اور وہ وحشتناک مناظر کا سامنا کریں اور اپنے اعمال کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اس موقع

پر ان کی فریاد بلند ہوگی: ہائے افسوس! ہم نے ایسے دن کے لئے کس قدر کوتاہی کی تھی ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَطْنَا فِيهَا﴾ ”ساعۃ“ سے مراد ہے قیامت کا دن، اور ”بغتۃ“ کا معنی ہے بطور ناگہانی اور اچانک کہ جس کے وقت کو خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، واقع ہو جائی گی اور قیامت کے دن کے لئے اس نام ”ساعۃ“ کے انتخاب کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس گھڑی لوگوں کا حساب بڑی تیزی کے ساتھ انجام پائے گا اور یا یہ اس کے ناگہانی طور پر وقوع پذیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لوگ عالم برزخ سے عالم قیامت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

”حسرت“ کا معنی ”کسی چیز پر افسوس کرنا“ ہے لیکن عرب جب زیادہ متاثر ہو تو خود حسرت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ”یا حسرتنا“ گویا حسرت کی شدت و سختی اس قدر ہے جیسے وہ ایک موجود چیز کی شکل ہے میں اس کے سامنے مجسم گھڑی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ گناہوں کا بوجھ اپنے دوش پر لئے ہیں ﴿وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ﴾۔ ”اوزار“ جمع ہے ”وزر“ کی جس کا معنی ہے سنگین بوجھ، اور یہاں اس سے مراد گناہ ہے اور یہ آیت تجسم اعمال کی ایک دلیل بن سکتی ہے کیوں کہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کے بار کی سنگینی مراد ہو، کیوں کہ ذمہ داریوں کو ہمیشہ بھاری بوجھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا ہے کیسا برا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے ﴿الْأَسَاءَ مَا يَزُرُونَ﴾۔ مندرجہ بالا آیت میں منکرین معاد کے خسارہ اور نقصان کی کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں اس بات کی دلیل واضح ہے کہ ان کے معاد پر ایمان رکھنا علاوہ اس کے کہ انسان کو ہمیشہ کی سعادت بخش زندگی کے لئے آمادہ کرتا ہے اور اسے کمالات علمی و عملی کی تحصیل کی دعوت دیتا ہے، آلودگیوں اور گناہوں کے مقابلے میں انسان کو کنٹرول کرنے میں بھی گہرا اثر رکھتا ہے، ہم معاد سے مربوط مباحثہ میں انشاء اللہ انفرادی و اجتماعی نظر سے اس کی اصلاحی اثر کا وضاحت سے بیان کریں گے۔

اس کے بعد آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حیثیت بیان کرنے کے لئے یوں ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ﴾۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے صرف دنیا سے دل باندھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کے نہ وہ خواہش مند ہی اور نہ ہی طلبگار ہیں درحقیقت یہ ایسے ہوس باز بچے ہیں کہ جنہوں نے عمر کا ایک حصہ کھیل کود میں گزار دیا ہے اور ہر چیز سے بے خبر رہے ہیں۔

دنیاوی زندگی کو لہو و لعب سے تشبیہ اس وجہ سے دی گئی ہے کیوں کہ عام طور پر کھیل کود کے کام اندر سے خالی اور بے بنیاد ہوتے ہیں، جو حقیقی زندگی کے تن سے دور ہیں، نہ تو وہ شکست کھاتے ہیں، جنہوں نے فی الحقیقت شکست کھائی ہے اور نہ ہی وہ چکست یافتہ ہوتے ہیں جنہوں نے بازی کو جیت لیا ہے کیوں کہ کھیل کے ختم ہونے پر ہر چیز اپنی جگہ لوٹ جاتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے ایک دوسرے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور کھیل شروع کر دیتے ہیں ایک کو ”امیر“ اور دوسرے کو ”وزیر“ ایک کو ”چور“ اور ایک کو ”قافلہ“ بناتے ہیں، لیکن تھوڑی سی دیر نہیں گزرتی کہ نہ کوئی امیر رہتا ہے نہ وزیر، نہ چور رہتا اور نہ قافلہ۔

یا نمائش جو کھیل کود کے طور پر انجام پاتی ہے ان میں جنگ، عشق یا دشمنی کے مناظر مجسم ہوتے ہیں لیکن گھڑی بھر کے بعد کسی چیز کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

دنیا ایک ڈرامے کی طرح ہی ہے کہ جس کے کردار، اس دنیا کے لوگ ہیں اور کبھی یہ بچکانہ کھیل ہمارے عقلمندوں اور فہمیدہ لوگوں تک کو بھی اپنے میں مشغول رکھتا ہے لیکن بہت جلدی کھیل اور ڈرامہ ختم ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے۔ ”لعب“ (بروزن لزوج) اصل میں مادہ لعب (غبار) لعب دہن اور رالوں کے معنی میں ہے جو لبوں سے گرتی ہیں اور یہ جو کھیل کو لعب کہتے ہیں اس بنا پر کہ وہ بھی منہ سے رال کے گرنے کی طرح ہے، جو بغیر کسی مقصد انجام پاتا ہے۔ اس کے بعد آخرت کی زندگی کا اس سے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: آخرت کا گھر متقی لوگوں کے لئے بہتر ہے، کیا تم فکر نہیں کرتے اور عقل سے کام نہیں لیتے ہو ﴿وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾۔

کیوں کہ وہ فنا نہ ہونے والی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، جس کا جہاں بہت وسیع ہے، اور جس کی سطح بہت ہی اونچی ہے، وہ ایک ایسے عالم میں ہے جس کا تعلق حقیقت کے ساتھ ہے نہ کہ مجاز کے ساتھ، وہ ایک واقعیت ہے خیال نہیں ہے، وہ ایک ایسا جہان ہے جس کی نعمتیں درد و رنج کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہے اور سراسر خالی نعمتیں ہی نعمتیں ہے جن میں دکھ تکلیف نہیں ہے۔

چونکہ ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا، دنیا کے فریب دینے والے مظاہر کو پیش نظر رکھتے ہوئے، غور و فکر کرنے والے لوگوں کے سوا دوسروں کے لئے ممکن نہیں ہے لہذا آیت کے آخر میں روئے سخن ایسے ہی افراد کی طرف ہے۔
ایک حدیث میں جو ہشام بن حکم کے واسطے سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے آپ نے یوں فرمایا ہے:

اے ہشام! خدا نے عقلمند لوگوں کو نصیحت کی ہے اور آخرت کے لئے تعلق رکھنے والا بنایا ہے، اور کہا ہے کہ دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور دار آخرت متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لئے بہتر ہے، کیا تم اپنی عقل اور فکر کو کام میں نہیں لاتے ہو۔

شاید یہ بات ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ ان آیات کا ہدف اور اصل مقصد مادی دنیا کے مظاہر کے ساتھ دل لگانے اور وابستگی اختیار کرنے اور اس کے آخری مقصد کو بھلا دینے کے خلاف جہاد ہے، ورنہ وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو حصول سعادت کا وسیلہ قرار دیا ہے وہ حقیقت میں آخرت کے متلاشی ہیں نہ کہ دنیا کے۔

۱۔ اس احتمال کے مطابق ”وقالوا“ عطف ہے ”عادوا“ اور اس احتمال کو تفسیر ”المنار“ کے مولف نے اختیار کیا ہے۔

آیات ۳۳، ۳۴

۳۳۔ ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾۔

۳۴۔ ﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَى مَا كُذِّبُوا وَأَوَدُّوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ

جَاءَكَ مِنْ نَبَاٍ الْمُرْسَلِينَ﴾۔

ترجمہ:

۳۳۔ ہم جانتے ہیں کہ تجھے ان لوگوں کی گفتگو غمگین کر دیتی ہے (مگر تم غم نہ کھاؤ اور جان لو) کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ ظالم تو آیات خدا کا انکار کرتے ہیں۔

۳۴۔ تجھ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی گئی ہے مگر انھوں نے ان تکذیبوں کے مقابلہ میں صبر کیا ہے اور استقامت سے کام لیا ہے اور (اس راہ میں) انھوں نے رنج و تکلیف اٹھائی، یہاں تک کہ ہماری مدد ان تک آن پہنچی (تم بھی اسی طرح رہو اور یہ اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے) اور کوئی چیز اللہ کی سنتوں بدل نہیں سکتی اور تمہیں گذشتہ پیغمبروں کی خبریں تو پہنچ ہی گئی ہیں۔

مصلحین کے راستے میں ہمیشہ مشکلات رہی ہیں

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر اپنی منطقی گفتگو اور فکری مبارزات میں جو وہ ہٹ دھرم اور سخت مشرکین کے ساتھ رہتے تھے بعض اوقات ان کی ہٹ دھرمی سے اور اپنی باتوں سے ان کی روح میں اثر نہ ہونے سے اور بعض اوقات ان کی ان غیر مناسب نسبتوں سے وہ جو حضرت کی طرف دیتے تھے غمگین اور اندوہناک ہو جاتے تھے، خداوند تعالیٰ بارہا قرآن مجید میں اپنے پیغمبر کو ایسے موقع پر تسلی اور دلاسا دیا کرتا تھا تاکہ آنحضرت زیادہ گرمجوشی اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے پروگرام میں مشغول رہیں، انھیں میں سے مندرجہ بالا آیات بھی ہیں، پہلی آیت میں فرماتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تجھے محزون و مغموم کر دیتی ہیں ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ﴾۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے وہ تو درحقیقت ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، لہذا ان کے اصل مخالف تو حقیقت میں ہم ہیں نہ کہ تم ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾۔

اور اس بات کی نظر ہمارے درمیان گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جب کہ بعض اوقات بزرگ تر شخصیت اپنے نمائندہ کے ناراحت ہونے کے وقت اس سے کہتی ہے کہ تم کوئی غم نہ کرو یہ اصل میں تو انھوں نے میری مخالفت کی ہے،

لہذا اگر کوئی مشکل پیدا ہوگی تو وہ میرے لئے ہوگی نہ کہ تمہارے لئے اور اس طرح سے وہ شخصیت اس کی تسلی و تشفی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔

زیر نظر آیت میں مفسرین نے کچھ احتمالات بھی پیش کئے ہیں، لیکن ظاہر مفہوم وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ احتمال بھی ایک جہت سے قابل ملاحظہ ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ: تیرے مخالفین حقیقت میں تو تیرے صدق و درستی کے معتقد ہیں اور تیری دعوت کے حق ہونے میں شک نہیں رکھتے اگرچہ ان کے منافع خطرے میں پڑ جانے کا خوف ان کے لئے حق کو تسلیم کرنے میں مانع ہو جاتا ہے یا تعصب اور ہٹ دھرمی اسے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تاریخ اسلامی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سخت ترین دشمن تک باطنا آپ کی صداقت اور راست بازی سے معتقد تھے، ان میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ ایک دن ابو جہل نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے مصافحہ کیا، تو کسی نے اس پر اعتراض کیا: تم اس شخص سے مصافحہ کیوں کر رہے ہو، اس نے کہا: خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ پیغمبر ہیں لیکن کیا ہم کسی زمانے میں ”عبد مناف“ کے تابع اور پیرو رہے ہیں! یعنی اس کی دعوت کو قبول کرنا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ ہم ان کے قبیلہ کے تابع ہو جائیں (اور یہ بھی تاریخوں میں لکھا ہے کہ) ایک رات ابو جہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق، جو مشرکین مکہ کے سردار اور رئیس تھے، میں سے باہر ایک ایسے مخفی طریقے سے کہ کوئی شخص ان کی طرف متوجہ نہ ہو، یہاں تک یہ تینوں افراد بھی ایک دوسرے کی حالت سے باخبر نہیں تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سننے کے لئے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ گئے اور صبح تک آیت قرآن کی تلاوت سنتے رہے، جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو وہاں سے چلتے بنے لیکن لوٹتے وقت راستہ میں ایک دوسرے کا آمناسا منا ہو گیا تو ہر ایک اپنا عذر دوسرے سے بیان کرنے لگا، پھر انھوں نے عہد کیا کہ اب دوبارہ یہ کام نہیں کریں گے کیوں کہ اگر قریش کے جوانوں کو اس بات کی خبر ہو گئی تو یہ بات ان کے محمد کی طرف جھکاؤ کا سبب بن جائے گی۔

دوسری رات اس گمان سے کہ اس کے ساتھی اس رات نہیں آئے گے ہر ایک آیت قرآن سننے کی غرض سے پیغمبر کے گھر کے قریب یا مسلمانوں کے مجمع کے قریب آگیا لیکن صبح ہوتے ہیں پھر ان کا راز ایک دوسرے پر فاش ہو گیا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ یہ کام تیسری رات پھر دہرایا گیا، جب صبح ہوئی تو اخنس بن شریق اپنا عصا لئے ہوئے ابوسفیان کی

تلاش میں نکلا اور اس سے کہنے لگا: مجھے صاف، صاف بتا کہ تمہارا ان باتوں کے بارے میں جو تم نے محمد سے سنی ہیں کیا عقیدہ ہے، تو وہ کہنے لگا: خدا کی قسم کچھ چیزیں تو میں نے ایسی سنی ہیں جنہیں میں نے اچھی طرح جان لیا ہے اور ان کا مقصود و مضمون اچھی طرح سمجھ لیا ہے لیکن کچھ ایسی آیات بھی سنی ہیں جن کا معنی و مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا، اخنس نے کہا خدا کی قسم میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں اس کے بعد وہ اٹھا اور ابو جہل کی تلاش میں گیا اور یہی سوال اس سے کیا کہ ان باتوں کے بارے میں جو تم نے محمد سے سنی ہیں تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا تو کیا سننا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اور اولاد عبد مناف سرداری کے حصول میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں انھوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی اس غرض سے کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں کھانا کھلایا، انھوں نے سواریاں بخشی تو ہم نے بھی سواریاں بخشی، انھوں نے اور دوسری عنایات کیں تو ہم نے بھی اور دوسری عنایات کیں تو اس طرح سے ہم ایک دوسرے کے دوش بدوش تھے، اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں پیغمبر ہے کہ جس پر آسمانی وحی نازل ہوتی ہے لیکن اب ہم اس امر میں ان کی رقابت کس طرح کر سکتے ہیں ﴿واللہ لا نومن بہ ابدًا ولا نصدقہ﴾ خدا کی قسم ہم کبھی بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کے تصدیق کریں گے، اخنس کھڑا ہو گیا اور اس کی مجلس سے نکل گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن ”اخنس بن شریق“ کا ابو جہل سے آمنہ سامنا ہو گیا جب کہ وہاں پر اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا، تو اخنس نے اس سے کہا: سچ بتا محمد سچا ہے یا جھوٹا، قریش میں سے کوئی شخص سوا میرے و تیرے یہاں موجود نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سنے۔

ابو جہل نے کہا: والے ہو تجھ پر خدا کی قسم! وہ میرے عقیدے میں سچ کہتا ہے اور اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اگر یہ اس بات کی بنا ہو جائے کہ محمد کا خاندان سب چیزوں کو اپنے قبضہ میں کر لے، حج کا پرچم، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی پردہ داری اور مقام نبوت تو باقی قریش کے لئے کیا رہ جائے گا^(۱)۔

ان روایات اور انھیں جیسی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے سخت ترین دشمن باطنا آپ کی سچائی کے معترف تھے لیکن قبائلی رقابتیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں انھیں اجازت نہیں دیتی تھیں یا وہ اس بات کی جرات نہیں رکھتے تھے کہ باقاعدہ ایمان لے آئیں۔

البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا باطنی اعتقاد جب تک روح تسلیم کے ساتھ نہ ملا ہو کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا اور انسان کو سچے مومنین کے زمرہ میں قرار نہیں دیتا۔

بعد والی آیات میں، اس تسلی کی تکمیل کے لئے گزشتہ انبیاء کے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ امر صرف تیری ذات کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے بلکہ تجھ سے پہلے جتنے رسول گذرے ہیں ان کی بھی اسی طرح سے تکذیب کی جاتی تھی ﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ﴾ -

لیکن ان انبیاء نے ان تکذیبوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت دکھائی یہاں تک کہ ہماری مدد و نصرت ان کو پہنچی اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے

﴿فَصَبِّرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأَوْدُوا حَتَّىٰ آتَاهُمْ نَصْرُنَا﴾ -

اور یہ ایک سنت الہی ہے کہ جسے کوئی چیز دیگرگوں نہیں کر سکتی ﴿وَلَا مُبَدَّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ﴾ -

اس بنا پر تم بھی ان تکذیبوں اور آزاروں اور سخت اور ہٹ دھرم و دشمنوں کے حملوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لو اور یہ جان لو کہ اسی سنت کے مطابق خداوند تعالیٰ کی امداد اور پروردگار عالم کے بے انتہا الطاف تمہیں حاصل ہوں گے اور آخر کار تم بھی ان سب پر کامیابی حاصل کرو گے اور وہ خبریں جو گزشتہ پیغمبروں کے حالات کی تجھ تک پہنچی ہیں کہ انھوں نے مخالفتوں اور شدائد کے مقابلے میں کس طرح صبر و تحمل کیا اور کامیاب ہوئے، وہ تمہارے لئے ایک واضح و روشن گواہ ہیں ﴿وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبِیِّ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ -

در حقیقت اوپر والی آیت ایک بنیادی کلیہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ کلیہ یہ ہے کہ ہمیشہ معاشرے کے صالح رہنما جو پست افکار اور معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسموں اور خرافات کے مقابلے میں اصلاحی پروگرام پیش کرنے اور صحیح راہ دکھانے کے لئے قیام کرتے ہیں، انھیں ایسے منافع خور اور دروغ گو لوگوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ جن کے منافع اس جدیدین و مذہب کی ترقی سے خطرے میں پڑ جاتے تھے -

وہ اپنے برے مقاصد کی پیش رفت کے لئے کسی بھی بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور تمام حربے مثلاً تکذیب کا حربہ، تہمت کا حربہ، محاصرہ اجتماعی کا حربہ، تکلیفیں اور دکھ پہنچانے کا حربہ، قتل کرنے اور لوٹا کر کرنے کا حربہ غرضیکہ وہ ہر وسیلے کو کام میں لاتے تھے لیکن حقیقت اپنی اس جذب و کش اور گہرائی کے ذریعہ جو اس کے اندر ہوتی ہے - سنت الہی کے مطابق - آخر کار اپنا کام کرے گی اور راستے کے یہ تمام کانٹے ایک ایک کمر کے سب ختم ہو جائیں گے، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اس کامیابی کی بنیادی شرط بردباری، مقاومت، پامردی اور استقامت ہے -

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مدرجہ بالا آیت میں سنن کو ”کلمات اللہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے، کیوں کہ ”کلم و کلام“ دراصل ایک ایسی تاثیر کے معنی میں ہے جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو سکے ”کلم“ تاثیرات عینی کے معنی میں ہے اور ”کلام“ ان تاثیرات کو کہتے ہیں جو کانوں سے محسوس کئے جاتے ہیں، اس کے بعد اس میں وسعت پیدا ہو گئی اور اب ”الفاظ“ کے علاوہ معانی پر بھی ”کلمہ“ بولا جانے لگا ہے، یہاں تک کہ ”عقیدہ“، ”مکتب“ اور ”روش و سنت“ پر بھی بولا جاتا ہے۔

۱۔ مندرجہ بالا روایات تفسیر المنار اور مجمع البیان سے اس آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر سے لی گئی ہیں۔

آیات ۳۵، ۳۶

۳۵ ﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾۔

۳۶ ﴿إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾۔

ترجمہ:

۳۵۔ اور اگر تم پر ان کا اعراض (روگردانی) کرنا گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو نقب لگا لو یا آسمان میں سیر ہی لگا لو) اور زمین و آسمان کی گہرائیوں میں جستجو کرو) تاکہ کوئی آیت (یا دوسری کوئی اور نشانی) ان کے لئے لاسکو (لیکن یہ جان لو کہ یہ ہٹ دھرم پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے) لیکن اگر خدا چاہے تو انھیں (جبراً) ہدایت پر جمع کر سکتا ہے (لیکن جبری ہدایت کا کیا فائدہ ہے) پس تم ہرگز جاہلوں میں سے نہ ہونا۔

۳۶۔ صرف وہ لوگ (تیری دعوت) قبول کرتے ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں، لیکن مردے (اور وہ لوگ جو روح انسانی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں ایمان نہیں لائیں گے اور) خدا انھیں (قیامت کے دن) مبعوث کرے گا وہ اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔

زندہ نما مردے

یہ دونوں آیات ان آیات کا بقیہ ہیں جو پیغمبر کو تسلی کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں، چونکہ فکر و روح پیغمبر مشرکین کی گمراہی اور ہٹ دھرمی سے زیادہ دکھی اور پریشان تھی اور آپ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو سکے انھیں مومنین کی صف میں کھینچ لائیں، خدا فرماتا ہے: اگر ان کا اعراض گردانی تیرے لئے زیادہ سخت اور گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین کو پھاڑ ڈالو اور اس میں نقب لگا لو اور جستجو کرو، یا آسمان پر کوئی سیر ہی لگا لو اور اطراف آسمان کی بھی جستجو کرو اور ان کے لئے کوئی اور آیت یا کوئی دوسری نشانی تلاش کر کے لاسکو تو لے آؤ لیکن یہ جان لو کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے ﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي

السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ﴾^(۱)

”نق“ اصل میں نقب اور زمین کے نیچے کے راستوں کے معنی میں اور اگر منافق کو منافق کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی مناسبت کی وجہ ہے کہ وہ ظاہری راہ و روشن کے علاوہ اپنے لئے ایک مخفی راہ و روش بھی رکھتا ہے اور ”سلم“ سیڑھی کے معنی میں ہے۔

خداوند عالم اس جملہ کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو سمجھا رہا ہے کہ تمہاری تعلیمات، دعوت اور سعی و کوشش میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے بلکہ نقص و عیب ان کی طرف سے ہے انھوں نے یہ پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ حق کو قبول نہیں کریں گے، لہذا کسی قسم کی کوئی کوشش ان پر اثر نہیں کرتی تو تن پریشان نہ ہو جاؤ۔

لیکن اس بنا پر کہ کسی کو یہ تو ہم نہ ہو جائے خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ان سے اپنی بات کو تسلیم کرا سکے بلا فاصلہ فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو وہ ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا ہے، یعنی وہ تیری دعوت کے سامنے ان کا سر تسلیم کرا کے انھیں حق اور ایمان کا اعتراف کرانے پر آمادہ کر سکتا ہے

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى﴾ -

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کا جبری ایمان بے فائدہ ہے، انسان کی فطرت میں حصول کمال کے لئے اختیار اور آزادی ارادہ، ہی بنیاد ہوتے ہیں، یہ آزادی ارادہ ہی ہے کہ جس کی وجہ سے مومن کی کافر سے، نیک کی بد سے، امانتدار کی خائن سے، سچ کی جھوٹ سے قیمت پہچانی جاتی ہے، ورنہ جبری ایمان و تقویٰ سے اچھے اور برے کے درمیان کسی قسم کا فرق باقی نہیں رہے گا اور یہ مفاہیم جبر کی صورت میں اپنی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔

اس کے بعد ہے: یہ بات ہم نے تجھ سے اس لئے کہی ہے کہ کہیں تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے، یعنی بیتاب نہ ہو، صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ دے اور ان کے کفر و شرک پر اتنا دکھی نہ ہو، اور یہ جان لو کہ راستہ تو وہی ہے کہ جس پر تم چل رہے ہو ﴿فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ -

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر ان حقائق کو خوب اچھی طرح جانتے تھے لیکن خداوند تعالیٰ یاد دہانی اور تسلی کے طور پر اپنے پیغمبر کے لئے ان الفاظ کو دہرا رہا ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہم کسی ایسے شخص کو جس کا بیٹا مر گیا ہو یوں کہتے ہیں کہ: غم نہ کھاؤ، دنیا فنا کی جگہ ہے، سبھی اسی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اس کے علاوہ تم تو ابھی جوان ہو، تمہاری اور بھی اولاد ہو جائے گی، لہذا زیادہ بیتاب نہ ہو۔

مسلمہ طور پر دار دنیا کا فانی ہونا، یا اس کا جوان ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اس پر پوشیدہ ہو، یہ تمام باتیں اس سے صرف یاد دہانی کے طور پر کہی جاتی ہے۔

باوجود اس کے کہ اوپر والی آیت جبر کی نفی کرنے والی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے، بعض مفسرین جیسے فخر الدین رازی نے اسے مسلک جبر کی دلیلوں میں سے ایک دلیل سمجھا ہے اور وہ لفظ ﴿وَلَوْ شَاءَ﴾ کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا ہے کہ کفار ایمان لائیں۔

(حالانکہ وہ اس سے) غافل ہیں کہ مشیت و ارادہ اوپر والی آیت میں مشیت و ارادہ اجباری ہے یعنی خدا یہ نہیں چاہتا کہ لوگ جبر سے اور زبردستی ایمان لائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی رضا و رغبت اور اپنے ارادہ سے باخوشی ایمان لائیں، اس بنا پر یہ آیت جبریوں کے عقیدہ کی نفی پر واضح گواہ ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع کی تکمیل اور پیغمبر کی مزید لچوٹی اور تسلی کے لئے کہتا ہے کہ جو لوگ سننے والے کان رکھتے ہیں وہ تیری دعوت کو قبل کرتے ہیں او اس پر لبیک کہتے ہیں ﴿إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ﴾

لیکن وہ لوگ جو عملاً مردوں کی صف میں شامل ہیں وہ ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ وہ خدا انھیں قیامت کے دن اٹھائے اور وہ اس کی بارگاہ میں لوٹیں

﴿وَالْمَوْتَى يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾ (۲)

وہ ایسا دن ہے کہ قیامت کے مناظر دیکھ کر وہ ایمان لے آئیں گے لیکن ان کا اس وقت ایمان لانا انھیں کو یہ فائدہ نہ دے گا کیوں کہ یہ عظیم منظر دیکھ کر جو لوگ ایماں لائیں گے ان کا یہ ایمان ایک قسم کا اضطرابی ایمان ہوگا۔

شاید اس بات کی وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہو ”موتی“ (مردے) سے مراد اوپر والی آیت میں جسمانی طور پر مردے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد باطنی و معنوی مردے ہیں کیوں کہ ہم دو قسم کی موت و حیات رکھتے ہیں، ایک حیات و موت مادی اور دوسری موت و حیات معنوی، اسی طرح شنوائی اور بینائی بھی دو قسم کی ہیں ایک مادی اور دوسری معنوی، اسی دلیل سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایسے اشخاص کے بارے میں کہ جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں، کان بھی رکھتے ہیں یا زندہ و سالم تو ہیں لیکن وہ حقائق کو نہیں سمجھتے، کہتے ہیں کہ وہ اندھے بہرے ہیں یا بالکل مردہ ہیں، کیوں کہ جو رد عمل ایک بینا و شنوایا ایک زندہ انسان سے ہونا چاہئے وہ حقائق کے سامنے نہیں دکھاتے، قرآن مجید میں ایسی تعبیرات کثرت سے نظر آتی ہے اور ان میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے بلکہ قرآن حیات مادی اور ظاہری زندگی کو، جس کی نشانی صرف

کھانا، سونا اور سانس لینا ہے، کچھ اہمیت نہیں وہ ہمیشہ حیات معنوی و انسانی پر جو ذمہ داری و جوابدہی اور احساس و درد اور بیداری و آگاہی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، انحصار کرتا ہے۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بینائی و شنوائی اور معنوی موت خود ان کی اپنی وجہ سے ہے، وہ خود ہی وہ لوگ ہیں کہ جو بار بار گناہ کرنے اور اس پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرنے کے سبب سے اس مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں کیوں کہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسا کہ اگر کوئی انسان ایک مدت تک اپنی آنکھ کو بند کئے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی بینائی اور نظر کو گوا بیٹھے گا اور شاید ایک روز بالکل اندھا ہو جائے، جو اشخاص اپنے دل کی آنکھوں کو حقائق کی طرف سے بند کر لے تو وہ تدریجاً اپنی معنوی بصارت کی قوت کو زائل کر دے گا۔

۱۔ حقیقت میں ”ان استطعت“ کا جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا مخذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے ”ان استطعت --- فافعل وَلَکِنَّہُمْ لَا یُؤْمِنُونَ“۔

۲۔ ترکیب کی نظر سے ”الموتی“ بتدا ہے اور ”یُعْثَمُ اللہ“ اس کی خبر ہے اور یہ جو کہتا ہے کہ وہ مردوں کو مبعوث کرے گا اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قسم کی تبدیلی ان کے حالات میں پیدا نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ وہ قیامت میں مبعوث ہوں گے اور حقائق کو دیکھیں گے۔

آیت ۳۷

۳۷ ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

ترجمہ:

۳۷۔ اور انھوں نے کہا کہ کوئی نشانی (اور معجزہ) اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوتا، تم کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی نازل کرے لیکن ان میں سے اکثر کو اس کا علم نہیں ہے۔

بہانہ جوئی

اس آیت میں مشرکین کی بہانہ جوئی میں سے ایک بہانہ جوئی بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب سرداران قریش میں سے کچھ قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تو پیغمبر سے کہنے لگے کہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر تم سچ کہتے ہو تو عصائے موسیٰ (علیہ السلام) اور ناقہ صالح (علیہ السلام) جیسے معجزات ہمارے لئے لے آؤ، قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ انھوں نے کہا کہ کوئی نشانی اور معجزہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوا ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ﴾۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ یہ تجویز حقیقت کی تلاش کے لئے پیش نہیں کرتے تھے کیوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لئے کافی مقدار میں معجزات لاپکے تھے اور اگر قرآن کے علاوہ جو مضامین عالیہ پر مشتمل ہیں، آپ کے پاس کوئی معجزہ نہ بھی ہوتا تو وہی قرآن جو انھیں کئی آیات میں باقاعدہ مقابلے کی دعوت دے چکا تھا اور اصطلاح کے مطابق انھیں چیلنج کر چکا تھا، وہی آپ کی نبوت کے اثبات کے لئے کافی تھا لیکن یہ ابوالہوس بہانہ جو ایک طرف سے یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی تحقیر کریں اور دوسری طرف سے پیغمبر کی دعوت قبول کرنے سے روگردانہ کمرے، لہذا پے درپے نئے سے نئے معجزہ کی درخواست کرتے تھے اور مسلمہ طور پر اگر پیغمبر ان کی درخواست کو تسلیم بھی کر لیتے تو ”ہذا سحر مبین“ کہہ کر سب ان کا انکار کر دیتے، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

لہذا قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی ایسی نشانی اور معجزہ (کہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو) اپنے پیغمبر پر نازل کرے ﴿قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنْزِلَ آيَةً﴾ لیکن اس میں ایک ایسا اشکال ہے جس سے تم بے خبر ہو اور وہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کے تقاضوں پر جو تم ہٹ دھرمی کی بنا پر کرتے ہو تمھاری بات مان لی جائے اور تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ تو تم سب کے سب خداوند تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہو جاؤ گے، کیوں کہ

پروردگار عالم کی بارگاہ اقدس میں اور اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی آیات و معجزات کی انتہائی بے حرمستی ہے لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

جیسا کہ تفسیر مجمع البیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے بعض مخالفین اسلام نے اس آیت کو دستاویز قرار دیتے ہوئے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ پیغمبر اسلام کے پاس کائی معجزہ نہیں تھا کیوں کہ جس وقت کفار ان سے معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا کرتے تھے تو ان سے اتنا کہنے پر ہی قناعت کیا کرتے تھے کہ خدا ہی ایسی چیزوں پر قدرت رکھتا ہے لیکن تمہاری اکثریت نہیں جانتی، اتفاق کی بات یہ ہے کہ متاخرین میں سے بعض لکھنے والوں نے بھی یہی پرانا افسانہ دہرایا ہے اور اپنی تحریروں میں اسی پرانے اعتراض کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ:

پہلی بات تو یہ کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قبل و بعد کی آیات کا ٹھیک طور پر مطالعہ نہیں کیا ہے، اور یہ غور نہیں کیا کہ یہاں پر ان ہٹ دھرم لوگوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو کسی طرح بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اب اگر پیغمبر نے ان کے تقاضا کو پورا نہیں کیا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی، ورنہ قرآن میں یہ کہاں ہے کہ حق کی جستجو اور حق کو طلب کرنے والے افراد نے پیغمبر سے معجزہ کا تقاضا کیا ہو اور آپ نے ان کی خواہش کو رد کر دیا ہو، اسی سورہ انعام کی آیہ ۱۱۱ میں اسی قسم کی ”ہٹ دھرم“ افراد کے سلسلے میں ہے:

”﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ يَجْهَلُونَ﴾“ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ مطالبہ سرداران قریش کی ایک جماعت کی طرف سے تھا اور انھوں نے قرآن کریم کی تحقیر اور اس سے بے پرواہی برتتے ہوئے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا اور یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے تقاضوں کے سامنے جن کا سرچشمہ ایسے اسباب ہوں سر نہیں جھکا سکتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں انھوں نے گویا قرآن کریم کی باقی تمام آیات کو اپنی نگاہ سے دور رکھا ہے کہ کس طرح قرآن نے خود ایک جادو دانہ معجزہ کے طور پر اپنا تعارف کروایا ہے اور بارہا مخالفین کو مقابلے کی دعوت دیتا رہا ہے اور ان کے ضعف و ناتوانی کو آشکار کر چکا ہے۔

مقرضین نے سورہ اسراء کی پہلی آیت کو بھی بھلا دیا ہے جو صریحا کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک ہی رات میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ بات باور نہیں کی جاسکتی کہ قرآن انبیاء و مرسلین کے معجزات خارق عادات سے پر ہو اور پیغمبر اسلام کہیں کہ میں تمام انبیاء کا خاتم ہوں، سب سے افضل و برتر ہوں اور میرا دین بالآخر دین ہے لیکن حق کے متلاشیوں کے لئے کمترین معجزہ بھی اپنی طرف سے نہ دکھا سکے، کیا اس صورت میں غیر جانبدار حقیقت طلب افراد کے لئے اس کی دعوت میں نقطہ ابہام پیدا نہیں ہوگا۔

اگر ان کے پاس کوئی معجزہ نہ ہوتا تو ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ دوسرے انبیاء کے معجزات کا بالکل ہی نام تک نہ لیتے تاکہ وہ اپنے پروگرام کی توجیہ کر سکیں اور اپنے اوپر کئے جانے والے اعتراضات کے راستوں کو بند کر دیں، اور یہ باے کہ وہ برملا کھلے دل کے ساتھ پے در پے دوسروں کے معجزات بیان کر رہے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) بن عمران (علیہ السلام)، عیسیٰ (علیہ السلام) بن مریم (علیہ السلام)، ابراہیم (علیہ السلام)، صالح (علیہ السلام) او نوح (علیہ السلام) کے خارق عادت کام اور معجزات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے چلے جا رہے ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے معجزات کی طرف سے کامل مطمئن تھے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام، معتبر روایات اور نہج البلاغہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف قسم کے معجزات نقل ہوئے ہیں کہ جن کا مجموعہ حد تو اتر کو پہنچا ہوا ہے۔

۱۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی نازل کرتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور تمام چیزوں کو گروہ در گروہ ان کے پاس لا کھڑا کرتے تو یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ مترجم۔

آیت ۳۸

۳۸ ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ﴾ -

ترجمہ:

۳۸- کوئی زمین میں چلنے والا جانور اور کوئی دوپروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح کی امت ہے، ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں فرو گذاشت نہیں کیا ہے پھر وہ سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے

کیوں کہ یہ آیت وسیع مباحث اپنے پیچھے رکھتی ہے

کیوں کہ یہ آیت وسیع مباحث اپنے پیچھے رکھتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے آیت کے الفاظ معنی اور پھر اس کے اجمالی تفسیر ذکر کر کے، پھر باقی مباحث کو بیان کرے۔

”دابة“ ”دیبب“ کے مادہ سے آہستہ چلنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے معنی میں ہے عام طور پر زمین پر چلنے والے سب جانوروں کو ”دابة“ کہا جاتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سخن چین اور چغل خور کو ”دیبوب“ کہا جاتا ہے اور حدیث وارد ہوا ہے۔ ”لا يدخل الجنة ديبوب“۔

کبھی چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دو افراد کے درمیان آمد و رفت کرتا ہے تاکہ انھیں ایک دوسرے سے بد بین اور بد ظن کر دے۔

”طائر“ ہر قسم کے پرندے کو کہا جاتا ہے، البتہ چونکہ بعض موقع پر ایسے امور معنوی و روحانی پر بھی جو پیشرفت اور پرواز رکھتے ہیں، یہ لفظ بولا جاتا ہے، لہذا زیر بحث اس آیت میں اس لحاظ سے کہ نگاہ صرف پرندوں پر مرکوز رہے (یطیر بجناحہ) یعنی اپنے دوپروں کے ساتھ اڑتا ہے، کے جملہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

”امم“ جمع ہے ”امت“ کی اور امت کا معنی ہے ”وہ جماعت جو ایک قدر مشترک رکھتی ہو“ مثلاً ان کا دین ایک ہو یا زبان ایک ہو یا صفات اور افعال ایک جیسے ہوں۔

”بخشرون“ ”حشر“ کے مادہ سے جمع کرنے کے معنی میں ہے لیکن قرآن میں عام طور پر روز قیامت کے اجتماع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ ”الی ربهم“ کا ضمیمہ ہو۔

گذشتہ آیات مشرکین کے بارے میں بحث کر رہی تھی اور انھیں اس انجام کی طرف جو انھیں قیامت میں پیش آئے گا متوجہ کر رہی تھی، اب یہ آیت تمام زندہ موجودات اور تمام قسم کے حیوانات کے عام حشر و نشر اور قیامت میں اٹھنے کا بیان کر رہی ہے، پہلے فرمایا گیا ہے: کوئی زمین پر چلنے والا جانور نہیں اور کوئی دوپروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں مگر یہ کہ وہ بھی تمھاری طرح کی امت ہے ﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ﴾۔

اور اس طرح سے تمام قسم کے جانور اور ہر قسم کے پرندے انسانوں کی طرح اپنے لئے ایک امت ہے لیکن یہ کہ یہ ایک جیسا ہونا اور یہ شباهت کس جہت سے ہے، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض ان کی انسانوں نے شباهت خلقت کے تعجب خیز اسرار کی جہت سے سمجھتے ہیں کیوں کہ دونوں ہی خالق آفریدگار کی عظمت کی نشانیاں اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں۔ بعض سمجھتے ہیں کہ یہ شباهت زندگی کی مختلف ضروریات کہ جہت سے ہے یا ان وسائل کے لحاظ سے کہ جن کے ذریعے وہ اپنی طرح طرح کی حاجتوں کو پورا کرتے ہیں۔

جب کہ کچھ دوسرے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی انسان کے ساتھ شباهت سے مراد ادراک اور فہم و شعور میں شباهت ہے، یعنی وہ بھی اپنے عالم میں علم، شعور اور ادراک رکھتے ہیں وہ خدا کی معرفت رکھتے ہیں اور اپنی توانائی کے مطابق اس کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اگرچہ ان کی فکر، انسانی فکر و فہم سے بہت نچلی سطح پر ہے اور جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، آیت کا ذیل آخری نظریہ کو تقویت دیتا ہے۔

پھر بعد کے جملے میں ہے: ہم نے کتاب میں کسی چیز کو فرو گذاشت نہیں کیا ہے ﴿مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾۔ ممکن ہے کہ ”کتاب“ سے مراد قرآن مجید ہو کہ تم تمام چیزیں (یعنی وہ تمام امور کہ جو انسان کی تربیت و ہدایت اور تکامل و ارتقاء سے مربوط ہیں) اس میں موجود ہیں، البتہ بعض اوقات کلی صورت میں بیان ہوئے ہیں جیسے ہر قسم کے علم و دانش کی طرف دعوت اور بعض اوقات جزئیات کو بھی بیان کیا گیا ہے، جیسے بہت سے احکام اسلامی اور مسائل اخلاقی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”کتاب“ سے مراد ”عالم ہستی“ ہو کیوں کہ عالم آفرینش ایک عظیم کتاب کی مانند ہے کہ جس میں تمام چیزیں آگئی ہیں اور کوئی چیز اس میں فرو گزار نہیں ہوئی۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ آیت میں دونوں تفاسیر ہی مراد ہوں کیوں کہ نہ تو قرآن میں مسائل تریبیتی فروگذار ہوئے ہیں اور نہ ہی عالم آفرینش و خلقت میں کوئی نقص، کمی اور کسر رہ گئی ہے۔

اور اس آیت کے آخر میں ہے: وہ تَامِ خِدا کی طرف قیامت میں جمع ہوں گے ﴿ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ﴾۔

ظاہر یہ ہے کہ ”ہم“ کی ضمیر اس جملے میں تمام چلنے والے جانوروں اور پرندوں کی تمام اصناف اور انواع و اقسام کی طرف لوٹتی ہے اور اس طرح سے قرآن ان کے لئے بھی قیامت میں محشور ہونے کا قائل ہوا ہے اور زیادہ تر مفسرین نے اسی مطلب کو قبول کیا ہے کہ تمام قسم کے جاندار اور حشر و نشر اور جزا و سزا رکھتے ہیں، صرف بعض اس کے منکر ہوئے ہیں اور انھوں نے اس آیت کی اور دوسری آیت کی ایک اور طرح توجیہ کی ہے، مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ ”حشر الی اللہ“ سے مراد زندگی کا ختم ہونا اور ماوت ہے^(۱)۔

لیکن جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید میں اس تعبیر کا ظاہر وہی قیامت میں حشر و نشر کا ہونا اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانا ہے، اس بنا پر آیت مشرکین کو آگاہ کر رہی ہے کہ وہ خدا کے جس نے تمام قسم کے جانوروں کو پیدا کیا ہے، ان کی ضروریات کو مہیا کیا اور ان کے تمام افعال کا نگران ہے اور ان سب کے لئے اس نے حشر و نشر قرار دیا ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے لئے حشر و نشر قرار نہ دے اور بعض مشرکین کے قول کے مطابق دنیاوی زندگی اور اس کی حیات و موت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو۔

۱۔ یہ احتمال المنار کے مولف نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

چند قابل غور باتیں

۱۔ کیا جانوروں کے لئے بھی حشر و نشر ہے: اس میں شک نہیں کہ حساب کتاب اور جزا و سزا کی پہلی شرط مسئلہ عقل و شعور ہے اور اس کے بعد فرائض کا وجوب اور جوابدہی کی ذمہ داری ہے، اس عقیدے کے طرفدار کہتے ہیں کہ ایسے ثبوت موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جانور بھی اپنی مقدار و اندازہ کے مطابق فہم و ادراک رکھتے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ بہت سے جانوروں کی زندگی ایسے تعجب انگیز اور پرکشش نظام کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو ان کے فہم و شعور کی سطح عالی کو واضح کرتی ہے، کون ایسا شخص ہے کہ جس نے چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں اور ان کے عجیب و غریب تمدن او انکے چھتے اور بلوں کے تعجب انگیز نظام کی باتیں نہ سنی ہوں اور ان کے تحسین آمیز ادراک و شعور پر آفرین نہ کہی ہو، اگرچہ بعض حضرات اس بات کی طرف مائل ہیں کہ ان تمام باتوں کو ایک فطری اور طبعی الہام جانیں، حالانکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ ان کے اعمال لامعلیٰ کی صورت میں (فطری طور پر بغیر عقل کے) انجام پا جاتے ہیں۔

اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ ان کے یہ تمام اعمال جیسا کہ ان کا ظاہر نشاندہی کرتا ہے، عقل و ادراک کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جانور بغیر گزشتہ تجربہ کے اور پیش بینی نہ ہونے کے حوادث کے مقابلہ میں نئی راہ تلاش کر لیتے ہیں، مثلاً وہ بھڑ جس نے عمر میں کسی بھڑے کو نہیں دیکھا جب پہلی بار اس کو دیکھتی ہے تو اچھی طرح اس دشمن کے خطرناک ہونے کی تشخیص کر لیتی ہے اور جس ذریعہ سے ہو سکے اپنے دفاع اور خطرے سے نجات کے لئے کوشش کرتی ہے۔

بہت سے جانور جا اپنے مالکوں کے ساتھ تدریجی طور پر لگاؤ اور محبت پیدا کر لیتے ہیں اس موضوع کا دوسرا گواہ ہے، بہت سے درندے اور خطرناک کتے اپنے مالکوں کے ساتھ حتیٰ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی ایک مہربان خدمتگار کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔

جانوروں کی وفاداری کے بہت سے واقعات اور یہ کہ وہ کس طرح سے انسانی خدمت کا بدلہ اتارتے ہیں کتابوں میں اور لوگوں کے درمیان مشہور ہیں کہ ان تمام کو محض افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔

مسلم ہے کہ ان تمام باتوں کو آسانی کے ساتھ فطرت کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ فطرت عام طور پر ایک ہی قسم کے دائمی کاموں کا سرچشمہ ہوتی ہے لیکن وہ اعمال جو ایسی خاص شرائط میں پیش بینی کے قابل نہ تھے عکس العمل کے عنوان سے انجام پاتے ہیں فطرت کی نسبت فہم و شعور سے زیادہ شبہا بہت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں بہت سے جانوروں کو اہم مقاصد کے لئے تربیت دی جاتی ہے، مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس کے کتے خطوں کو پہچاننے کے لئے کبوتر، دکانوں سے سودا سلف خریدنے کے لئے بعض جانور، شکار کرنے کے شکاری جانور سدھائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اہم اور مشکل فرائض، عجیب و غریب عمدگی سے انجام دیتے ہیں (آج کل تو بعض جانوروں کے لئے باقاعدہ تربیتی ادارے معرض وجود میں آچکے ہیں)۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر قرآن کی متعدد آیات میں ایسے مطالب دکھائی دیتے ہیں جو بعض جانوروں کے فہم و شعور کے بارے میں قابل ملاحظہ دلیل شمار ہوتے ہیں، حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لشکر کو دیکھ کر چیونٹی کے فرار کرنے کا واقعہ اور ہدکا سبا اور یمن کے علاقے میں آنا اور وہاں سے ہیجان انگیز خبروں کو سلیمان کے پاس لانے، اس مدعا پر شاہد ہے۔

روایات اسلامی میں بھی متعدد احادیث جانوروں کے قیامت میں اٹھنے کے سلسلے میں نظر آتی ہے منجملہ ان کے حضرت ابوذر سے نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ہم پیغمبر کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے دو بکریوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے، پیغمبر نے فرمایا کہ جانتے ہو کہ انھوں نے اسی دوسرے کو سینگ کیوں مارے ہیں، حاضرین نے عرض کیا کہ نہیں، پیغمبر نے فرمایا لیکن خدا جانتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور عنقریب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا^(۲)

اور ایک روایت میں پیغمبر سے بطریق اہل سنت نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

”ان الله يحشر هذه الامم يوم القيامة ويقتص من بعضها لبعض حتى يقص للجماء من القرناء“

خداوند تعالیٰ ان تمام جانوروں کو قیامت کے دن محشور کرے گا اور بعض کا بعض سے قصاص لے گا، یہاں تک کہ اس جانور کو قصاص کے جس کے سینگ نہیں ہے اور کسی دوسرے نے بلا وجہ اسے سینگ مارا ہے اس سے لے گا^(۳)۔

سورہ تکویر کی آیہ پانچ میں ہے: ﴿وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ﴾

اور اس وقت جب کہ جانور محشور کئے جائیں گے۔

اگر اس آیت کا معنی قیامت کے دن کا حشر لیں (نہ کے دنیا کے ختم ہونے کے وقت محشور و جمع ہونا) تو اوپر والی بحث کی منقول دلیلوں میں سے یہ ایک اور دلیل ہوگی۔

۲۔ حشر و نشر ہے تو پھر فرائض بھی ہیں: ایک اہم سوال جو یہاں پیش آتا ہے، اور جب تک وہ حل نہ ہو اوپر والی آیت کی تفسیر واضح نہیں ہوتی اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ قبول کر سکتے ہیں کہ حوانات بھی فرائض و واجبات رکھتے ہیں جب کہ شرعی تکلیف کی مسلم شرائط میں ایک عقل ہے اور اسی بنا پر بچہ اور دیوانہ شخص شرعی تکلیف کے دائرے سے خارج ہے تو کیا جانور ایسی عقل رکھتے ہیں کہ ان پر تکلیف عائد ہو، کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانور ایک نابالغ بچے اور حتیٰ کے دیوانوں سے زیادہ سمجھ رکھتا ہے؟ اور اگر ہم یہ قبول کر لیں کہ وہ اس قسم کی عقل و ادراک نہیں رکھتے تو پھر یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ فرائض و واجبات ان پر لاگو ہوں۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکلیف یعنی فرائض و واجبات کے کئی مراحل ہوتے ہیں اور ہر مرحلہ کے لئے اپنی مناسبت سے ادراک و عقل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بہت سی تکالیف اور واجبات و فرائض جو قوانین اسلامی میں ایک انسان کے لئے بنائے گئے ہیں ایسے ہیں کہ جو عقل و ادراک کی ایک سطح عالی کے بغیر انجام دئے ہی نہیں جاسکتے اور ہم ہرگز ایسی تکالیف جانوروں کے لئے قبول نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کو بجا لاءے کی شرط ان جانوروں کو حاصل ہی نہیں ہے۔

لیکن تکالیف کا ایک آسان اور نجلی سطح کا مرحلہ بھی تصور ہوتا ہے کہ جس کے لئے مختصر فہم و شعور بھی کافی ہے، ہم اس قسم کے فہم و شعور اور اس قسم کی تکالیف کا جانوروں سے قطعی انکار نہیں کر سکتے۔

یہاں تک کہ ان بچوں اور جانوروں کے بارے میں بھی جو کچھ مسائل کو سمجھتے ہیں تمام تکالیف کا انکار کرنا مشکل ہے، مثلاً اگر ہم چودہ سال نوخیز بچوں کو جو حد بلوغ کو تو نہیں پہنچے لیکن مکمل طور سے تمام مطالب انھوں نے پڑھے اور سمجھے ہیں، نظر میں رکھیں اب اگر وہ عمداً قتل نفس کے مرتکب ہوں جب کہ وہ اس عمل کے تمام نقصانات و مضارت کو جانتے ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا دنیاوی تعزیری قوانین میں غیر بالغ افراد کو بعض گناہوں می سزا دیتے ہیں، اگرچہ ان کی سزائیں مسلمہ طور پر بہت خفیف ہوتی ہیں۔

اس بنا پر بلوغ و عقل کامل مرحلہ عالی و کامل میں شرط تکلیف ہے، لیکن نچلے مراحل میں یعنی چند ایسے گناہوں کے بارے میں کہ جن کی قباحت اور برائی نچلی سطح کے انسانوں کے لئے بھی مکمل طور سے قابل فہم ہے ان کے لئے بلوغ اور عقل کامل کو شرط نہیں جانا جاسکتا۔

مراتب تکلیف کے فرق اور مراتب عقل کے فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے مذکورہ اعتراض جانوروں کے بارے میں بھی حل ہوئے گا۔

۳۔ کیا یہ آیت تناسخ کی دلیل ہے: تعجب کی بات یہ ہے کہ تناسخ کے بے ہودہ عقیدہ کے بعض طرفداروں نے اس آیت سے اپنے مسلک کے لئے استدلال کیا ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت یہ کہتی ہے کہ جانور بھی تمھاری طرح امتیں ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر ہماری طرح نہیں ہیں تو اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد جانوروں کے بدن میں چلی جاتی ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے بعض برے اعمال کی سزا پاتے۔ لیکن اس بات کے علاوہ کہ عقیدہ تناسخ قانون ارتقا اور عقل و منطق کے خلاف ہے اور اس سے قیامت و معاد کا انکار لازم آتا ہے (جیسا کہ اپنے مقام پر ہم نے اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے) اوپر والی آیت کسی طرح بھی اس مسلک پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے مجتہات حیوانی کئی جہات سے انسانی مجتہات کی طرح ہے اور شباهت صرف بالقوة نہیں بلکہ بالفعل ہے (یعنی عملی طور پر ایسا ہے) کیوں کہ وہ بھی ادراک و شعور کا کچھ حصہ اور اور مسولیت کا کچھ حصہ اور حشر و نشر اور قیامت میں اٹھائے جانے کا کچھ حصہ رکھتے ہیں لہذا ان جہات سے انسان کے ساتھ شباهت رکھتے ہیں۔

لیکن اس بات سے کوئی اشتباہ اور غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے مختلف جانوروں کے لئے ایک خاص مرحلہ میں مسولیت و تکلیف رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے لئے بھی کوئی رہبر و پیشوا (نبی و امام) ہوتا ہے اور وہ بھی کوئی نہ کوئی مذہب اور شریعت رکھتے ہیں، جیسا کہ بعض صوفیوں سے نقل ہوا ہے بلکہ اس قسم کے موقع پر ان کا رہبر وارہنما صرف ان کا ادراک و شعور باطنی ہوتا ہے یعنی وہ معین مسائل کا فہم رکھتے ہیں اور اپنے شعور کی مقدار اور اندازے کے مطابق اس کے مقابلہ میں مسول و جوابدہ ہے۔

۱۔ یہ احتمال المنار کے مولف نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ ۲۔ تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ تفسیر المنار، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

آیت ۳۹

۳۹ ﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمُّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ مَن يَشَأُ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَن يَشَأُ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾۔

ترجمہ:

۳۹۔ اور وہ لوگ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں تاریکیوں میں بہرے اور گونگے قرار پاتے ہیں، جیسا خدا چاہتا ہے (اور وہ اسی کا مستحق ہوتا ہے) اسے وہ گمراہ کرتا ہے اور جسے وہ چاہتا ہے (اور اس کو اس بات کے لائق پاتا ہے) اسے سیدھے راتے پر قرار دیتا ہے۔

بہرے اور گونگے

قرآن ہٹ دھرم منکرین کی بحث کو دوبارہ شروع کر رہا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا بہرے اور گونگے ہیں اور ظلمت اور تاریکی میں قرار پاتے ہیں (وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمُّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ) نہ تو وہ ایسے سننے والے قرآن رکھتے ہیں کہ جو حقائق کو سنیں اور نہ ہی ایسی حق گو زبان رکھتے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی حقیقت کو سمجھ لیا ہو تو دوسروں سے بیان کر دیں اور چونکہ خود خواہی، خود پرستی، ہٹ دھرمی اور جہالت کی تاریکی نے انہی ہر طرف سے گھیر رکھا ہے لہذا وہ حقائق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تو اس طرح سے وہ ان تین عظیم نعمتوں (یعنی سننا، دیکھنا اور بولنا) سے جو انہیں خارجی دنیا سے مربوط کرتی ہیں محروم ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ بہروں سے مراد وہ مقلد ہیں جو جو بغیر چون و چرا کے اپنے گمراہ رہبروں کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور خدائی رہبروں کی بات نہیں سنتے اور گونگے افادے مراد وہی گمراہ رہبر ہیں جو حقائق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن اپنی حیثیت اور اپنے مادی منافع کی حفاظت کے لئے انہوں نے اپنے اصول مہر سکوت لگائی ہوئی ہے اور دونوں گروہ جہالت اور خود پرستی کی تاریکی میں گرفتار ہیں^(۱)

اور اس کے بعد فرماتا ہے کہ ”خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے جادہ مستقیم پر برقرار رکھتا ہے۔“

﴿مَن يَشَأُ اللَّهُ يُضْلِلْهُ وَمَن يَشَأُ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾۔

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مشیت و ارادہ خدا کی طرف ہدایت و ضلالت کی نسبت دینا ایک ایسی بات ہے کہ جس کی قرآن کی دوسری آیات سے اچھی طرح تفسیر ہو جاتی ہے، ایک جگہ ہم پڑھتے ہیں:

”﴿يُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ﴾“۔۔ خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے: ”﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾“۔ صرف فاسقین کو گمراہ کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے: ”﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا﴾“۔ جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم انہیں سیدھی راہوں کی ہدایت کریں گے۔

ان آیات اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہدایتیں اور وہ ضلالتیں کہ جن کی ان موقع پر خدا کے ارادہ کی طرف نسبت دی گئی ہے حقیقت میں وہ جزائیں اور وہ سزائیں ہیں جو وہ اپنے بندوں کو اچھے یا برے اعمال کے بدلے دیتا ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات انسان سے ایسے برے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں کہ جن کے زیر اثر ایک ایسی وحشتناک تاریکی اس کی روح کو گھیر لیتی ہے کہ جس سے حقیقت میں آنکھیں چھین لی جاتی ہیں اور اس کے کان حق کی آواز کو نہیں سنتے، اور اس کی زبان حق بات کہنے سے رک جاتی ہے۔

اس کے برعکس کبھی انسان سے ایسے بہت سے نیک کام صادر ہوتے ہیں کہ ایک عالم نور و روشنی اس کی روح پر نچھاور ہوتا ہے، اس کی نظر و ادراک زیادہ وسیع اور اس کی فکر فزوں تر اور اس کی زبان حق بات کہنے گویا تر ہو جاتی ہے، یہ ہے معنی ہدایت و ضلالت کا جس کی خدا کے ارادے کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔

آیات ۳۰، ۳۱

۴۰۔ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾۔

۴۱۔ ﴿بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ﴾۔

ترجمہ:

۴۰۔ کہہ دو کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اگر خدا کا عذاب تم پر نازل ہو جائے یا قیامت آجائے تو کیا ق تم (اپنی مشکلات کے حل کے لئے) خدا کے سوا کسی اور کو بلاؤ گے اگر تم سچے ہو۔

۴۱۔ نہیں بلکہ تم صرف اسی کو بلاؤ گے اور اگر وہ چاہے گا تو اس مشکل کو جس کے لئے تم نے اسے بلایا ہے برطرف کر دے گا اور جسے (آج) تم (خدا کا) شریک قرار دیتے ہو (اسے اس دن) بھول جاؤ گے۔

فطری توحید

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے ایک دوسرے طریقہ سے توحید و یگانہ پرستی کے لئے ان کے سامنے استدلال کرتا ہے، وہ اس طریقہ سے کہ انھیں ان کی زندگی کے بہت ہی سخت اور دردناک لمحات یاد دلاتا ہے اور ان کے وجدان سے مدد چاہتا ہے کہ اس قسم کے لمحات میں جب کہ ہر چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس وقت خدا کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ انھیں اپنے لئے سمجھا دیتا ہے، اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر خدا کا دردناک عذاب تمہارے پیچھے آہنچے یا قیامت اپنی اس ہولناک، ہیجان اور وحشتناک حادثات کے ساتھ برپا ہو جائے، تو سچ بتاؤ کہ کیا تم خدا کے سوا کسی اور کو اپنے شائد کو برطرف کرنے کے لئے پکارو گے ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ

صَادِقِينَ﴾ (۱)

یہ آیت نہ صرف مشرکین کے لئے ہے بلکہ معنی کے اعتبار سے باطنی طور پر تمام افراد کے لئے شائد اور سخت حوادث کے ظہور کے وقت قابل فہم ہے، ممکن ہے کہ عام حالات میں اور چھوٹے چھوٹے حادثات میں انسان غیر خدا کے ساتھ متوسل ہو جائے لیکن جب حادثہ بہت زیادہ سخت ہو تو انسان تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے، البتہ یہی حالت ہوتی وہ جب کہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں نجات کے لئے ایک قسم کی امید محسوس کرتا ہے کہ جو ایک پوشیدہ اور نامعلوم قدرت سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے، یہی وہ توجہ ہوتی ہے جو خدا کی طرف ہوتی ہے اور یہی حقیقت توحید ہے۔

یہاں تک کہ مشرکین اور بت پرست بھی اس قسم کے لمحات میں بتوں کی بات کو درمیان میں نہیں لاتے اور وہ سب کو بھلا دیتے ہیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: بلکہ تم صرف اسی کو پکارتے ہو اگر وہ چاہے تو تمہاری مشکل کو حل کر دے اور شریک جو تم نے خدا کے لئے تیار کر رکھے تھے ان سب کو بھلا دیتے ہو ﴿بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ﴾

چند اہم نکات

۱۔ جو استدلال اوپر کی دو آیات میں نظر آتا ہے وہی توحید فطری والا استدلال ہے کہ جس سے دو مباحث میں استفادہ کیا جاسکتا ہے، ایک خدا کے اصل وجود کے اثبات میں اور دوسرا اس کی یگانگت اور توحید ثابت کرنے میں، اسی لئے اسلامی روایات میں اور اسی طرح علماء کے کلام میں منکرین خدا کے مقابلے میں بھی اور مشرکین کے، مقابلے میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔

۲۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والے استدلال میں قیامت کے برپا ہونے کی بات درمیان میں آئی ہے، حالانکہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ تو اس قسم کے دن کو بالکل قبول ہی نہیں کرتے تھے، اس بنا پر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کے سامنے اس قسم کا استدلال پیش کیا جائے۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ کرنا چاہئے کہ پہلے تو وہ سب قیامت کے منکر نہیں تھے بلکہ ان میں سے ایک گروہ ایک طرح سے قیامت کا اعتقاد رکھتا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ”ساعۃ“ سے مراد ہی موت کی گھڑی یا وحشتناک حوادث کی گھڑی ہو جو انسان کو موت کی چھو کھٹ تک لے جاتی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ہولناک حوادث کی طرف اشارہ ہو کیوں کہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کی ابتدا بہت ہی ہولناک حوادث کے سلسلہ کے ساتھ شروع ہوگی اور زلزلے، طوفان، بجلیاں اور ایسی ہی دوسری ناگہانی آفتیں اس وقت وقوع پذیر ہوں گی۔

۳۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ قیامت کا دن اور اس سے قبل کے حوادث حتمی اور یقینی مسائل میں سے ہیں اور کسی طرح بھی قابل تغیر نہیں ہیں تو پھر اوپر والی آیت میں یہ کیوں کہا گیا ہے: اگر خدا چاہے تو اسے برطرف کر دے گا، کیا اس سے صرف پروردگار عالم کی قدرت کا بیان کرنا مقصود ہے یا کوئی اور معنی مراد ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خدا ان کی دعا سے اصل قیامِ ساعۃ اور روزِ قیامت کو ہی ختم کر دے گا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین بلکہ غیر مشرکین بھی جب قیامت کے روبرو ہوں گے تو اس کے حوادث و مشکلات اور اس کے سخت ترین عذاب سے جو انھیں درپیش ہوگا، وحشت اور پریشانی میں ہوں گے اور خدا سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کیفیت اور حالت کو ان کے لئے آسان کر دے اور انھیں خطرات سے رہائی بخشے، تو حقیقت میں یہ دعا دردناک حوادث سے اپنے آپ کی نجات کے لئے ہے نہ کہ قیامت کے ختم ہو جانے کی دعا۔

۱۔ جیسا کہ عربی ادب کے علماء نے تصریح کی ہے کہ ”ک“ اریک میں اور ”کم“ ارایتکم میں نہ اسم ہے نہ ضمیر بلکہ صرف خطاب ہے، جو حقیقت میں تاکید کے لئے آتا ہے، ایسے موقع پر عام طور پر فعل مفرد کی شکل میں آتا ہے اور اس کا مفرد، تنہیہ اور جمع ہونا اسی حرف خطاب کی تغیرات سے ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے ”ارایتکم“ میں باوجود یہ کہ مخاطب جمع ہے فعل ”ریت“ مفرد لایا گیا ہے اور اس کا جمع ہونا ”کم“ سے جو کہ حرف خطاب ہے سمجھا گیا ہے، ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ معنی کے لحاظ سے مساوی ہے ”اخبرنی“ یا ”اخبرونی“ کے لیکن حق یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے استفہامی معنی کی مکمل حفاظت کرتا ہے اور ”اخبرونی“ اس کے معنی کا لازمہ ہے نہ کہ خود اس کے معنی ہے (غور کیجئے گا)

آیات ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵

۴۲ ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ﴾۔

۴۳ ﴿فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

۴۴ ﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا دُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِم أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ

مُتَبِلِسُونَ﴾۔

۴۵ ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

ترجمہ:

۴۲۔ ہم نے ان امتوں پر جو تم سے پہلے تھیں (پیغمبر بھیجے اور جب وہ ان کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے) تو ہم نے انہیں شدت و تکلیف اور رنج و بے آرامی میں مبتلا کر دیا کہ شاید (وہ بیدار ہو جائیں اور حق کے سامنے) سر تسلیم خم کر دیں۔

۴۳۔ جب ہمارا عذاب ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا؟) اور سر تسلیم کیوں خم نہ کیا؟، لیکن ان کے دل سخت ہوں گے اور شیطان نے ہر اس کام کو جو وہ کرتے تھے ان کی نظروں میں پسندیدہ کر کے دکھائے۔
۴۴۔ جب (نصیحتوں نے کوئی فائدہ نہ دیا اور) جو کچھ یا دہانی کرائی گئی تھی وہ اسے بھول گئے تو ہم نے (نعمتوں میں سے) تمام چیزوں کے دروازے ان کے لئے کھول دئے یہاں تک کہ وہ (مکمل طور پر) خوشحال ہو گئے (اور انہوں نے ان کے ساتھ دل لگا لیا) تو ہم نے یکایک انہیں دھر پکڑا (اور سخت سزا دی) تو اس وقت وہ سب کے سب مایوس ہو گئے (اور امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے)۔

۴۵۔ اور (اس طرح سے) جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا (اور ان کی نسل منقطع ہو گئی) اور حمد مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

نصیحت قبول نہ کرنے والوں کا انجام

ان آیات میں بھی گمراہوں اور مشرکین کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور قرآن ایک دوسرے راستے سے ان کو بیدار کرنے کے لئے اس موضوع کا پیچھا کرتا ہے، یعنی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گزشتہ زمانوں اور صدیوں کی طرف لے جاتا ہے اور گمراہ، ستمگر اور مشرک امتوں کی کیفیت ان سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح سے تربیت و بیداری کے عوامل ان

کے لئے بروئے کار لائے گئے لیکن ان میں سے ایک گروہ نے پھر بھی کسی کی طرف توجہ نہ کی اور آخر کار ایسی بد بختی ان کو دامگیر ہوئی کہ وہ آنے والوں کے لئے عبرت بن گئے۔

پہلے کہتا ہے کہ ہم نے گزشتہ امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے اور چونکہ انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی لہذا ہم نے انھیں بیداری اور تربیت کی خاطر مشکلات اور سخت حوادث مثلاً، فقر فاقہ، خشک سالی و بیماری درو رنج اور ”بأساء“ و ”ضرأ“^(۱)

سے دوچار کر دیا، کہ شاید وہ متوجہ ہو جائیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ انھوں نے ان دردناک اور بیدار کرنے والے عوامل سے نصیحت کیوں لی اور بیدار کیوں نہ ہوئے اور خدا کی طرف کیوں نہ لوٹے ﴿فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا﴾۔

اصل میں ان کے بیدار نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں، ان میں سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گناہ کی زیادتی اور شرک میں ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دل تاریک اور سخت ہو گئے اور ان کی روح کوئی اثر قبول نہیں کرتی تھی (وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ)۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شیطان نے (ان کی بت پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) ان کے اعمال کو ان کی نگاہ میں زینت دے رکھا تھا اور جس برے عمل کو وہ انجام دیتے تھے اسے خوبصورت و زیبا اور ہر غلط کام کو درست و صحیح خیال کرتے تھے ﴿وَرَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے کہ جب سخت گیریاں اور گوشمالیاں ان کے لئے موثر ثابت نہ ہوئیں تو ہم نے ان کے ساتھ محبت اور مہربانی کا راستہ اختیار کیا اور جب انھوں نے پہلے سبق کو بھلا دیا تو ہم نے ان کے لئے دوسرے سبق شروع کر دیا اور طرح طرح کی نعمتوں کے دروازے ان کے لئے کھول دئے کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے پیدا کرنے والے اور ان نعمتوں کو بخشنے والے کی طرف توجہ کر لیں اور راہ راست کو پالیں

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾۔

لیکن یہ سب نعمتیں دوہری خصوصیت رکھتی تھیں، یہ ان کی بیداری کے لئے اظہار محبت تھیں اور اگر بیدار نہ ہوں تو دردناک عذاب کا مقدمہ بھی تھیں کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ جب انسان ناز و نعمت میں ڈوبا ہوا ہو اور اچانک وہ سب

نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کے لئے انتہائی دردناک ہوتا ہے، اس کے برخلاف اگر اس سے تدریجاً واپس لی جائیں تو اس صورت میں اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

اسی لئے کہتا ہے کہ ہم نے انھیں اس قدر نعمتیں دی کہ جس سے وہ مکمل طور پر خوشحال ہو گئے، لیکن وہ بیدار نہ ہوئے، لہذا ہم نے ان سے وہ اچانک چھین لی اور ہم نے انھیں عذاب دیا اور امید کے سبب دروازے ان پر بند ہو گئے ﴿حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ﴾^(۲)

اور اس طرح ستمگروں کی نسل منقطع ہو گئی اور ان کی دوسری نسل آگے نہ چل سکی ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾

”دابر“ اصل میں کسی چیز کے پچھلے اور آخری حصہ کو کہتے ہیں اور چونکہ خداوند تعالیٰ نے ان کی تربیت کے لئے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لہذا آیت کے آخر میں کہتا ہے: حمد مخصوص اس خدا کے لئے ہے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے
(وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ)۔

۱۔ ”بأساً“ اصل میں شدت ورنج کے معنی میں ہے اور جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح قحط و خشک سالی اور فقر وغیرہ کے لئے بھی لیکن ”ضراء“ روحانی تکلیف مثلاً غم و اندوہ، جہالت، نادانی یا وہ پریشانیاں ہوں بیماری یا مقام و منصب اور مال ثروت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پیدا ہوتی ہے کہ معنی میں ہے، شاید ان دونوں میں فرق اس سبب سے ہے کہ ”بأساً“ عام طور سے خارجی پہلو رکھتا ہے اور ”ضراء“ روحانی اور معنوی پہلو رکھتا ہے، یعنی روحانی تکالیف کو ”ضراء“ کہتے ہیں، تو اس بنا پر ”بأساً“ ”ضراء“ کے عوامل کی ایجاد میں سے ایک عامل ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ ”مبلسون“ اصل میں مادہ ”ابلاس“ سے اس غم و اندوہ کے معنی میں ہے جو انسان کو ناگوار حوادث کی شدت سے عارض ہوا اور ابلیس کا نام بھی یہی سے لیا گیا ہے اور اوپر والی تعبیر شدت غم و اندوہ کی نشاندہی کرتی ہے جو گنہگاروں کو گھیر لیتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان آیات اور گزشتہ آیات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کیوں کہ گزشتہ آیات میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی تھی کہ مشرکین ہجوم مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور خدا کے سوا ہر کسی کو بھلا دیتے ہیں لیکن ان آیات میں ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت بھی وہ بیدار نہیں ہوتے

ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ شدائد کے ظہور کے وقت جلدی گزر جانے والی اور وقتی بیداریاں بیداری شمار نہیں ہوتیں کیوں کہ وہ جلد ہی اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

گزشتہ آیات میں چونکہ توحید فطری کا بیان کرنا مقصود تھا، اس کے ثبوت کے لئے وہی بیداریاں اور وقتی توجہات اور غیر خدا کو فراموش کرنا ہی کافی تھا خواہ ایسا حادثہ کے موقع پر ہی ہوا ہو لیکن ان آیات میں موضوع سخن ہدایت یابی اور بے راہ روی سے راہی راست کی طرف پلٹنے سے مطلق ہے اور مسلمہ طور پر جلد گزر جانے والی اور وقتی بیداری اس میں کوئی اثر نہیں کرتی۔

بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیات پیغمبر کے ہمعصر مشرکین کے ساتھ مربوط ہے لیکن زیر بحث آیات گزشتہ اقوام سے متعلق ہیں لہذا ان دونوں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے^(۱)۔

لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ پیغمبر کے ہمعصر ہٹ دھرم مشرک گزشتہ زمانہ کے گمراہوں سے بہتر ہوں، اس بنا پر صحیح حل وہی ہے ج اوپر بیان ہو چکا۔

۲۔ زیر نظر آیات میں ہے کہ جب شدائد کے ظہور سے تربیتی اثر نہ ہو تو خداوند عالم ایسے گناہگاروں پر نعمتوں کے درازے کھودیتا ہے، تو کیا یہ کام تنبیہ کے بعد تشویق کے لئے ہے یا عذاب کے دردناک ہونے کا ایک مقدمہ ہے؟ یعنی اصطلاح کے مطابق اس قسم کی نعمتیں نعمت استدراجی ہیں، جو سرکش بندوں کو بتدریج آہستہ آہستہ ناز و نعمت، خوشحالی و سرور اور ایک قسم کی غفلت میں ڈبو دیتی ہے اور پھر ایک دم ان سے تمام نعمتوں کو چھین لیا جاتا ہے۔

آیت میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جن سے دوسرے احتمال کی تقویت ملتی ہے لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ دونوں ہی احتمال مراد ہوں، یعنی پہلے بیداری کے لئے تشویق ہو اور اگر وہ موثر نہ ہو تو وہ نعمت کے چھیننے اور دردناک عذاب کرنے کے لئے ایک مقدمہ ہو، ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے:

إذا رأى الله يعطى العبد من الدنيا على معاصيه ما يحب فانما هو استدراج ثم تلا رسول الله فلما نسو---

”جب تم یہ دیکھو کہ خدا گناہوں کے مقابلے میں نعمت بخشتا ہے تو تم سمجھ لو کہ یہ سزا کا مقدمہ اور تمہید ہے، پھر آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت کی“ (مجمع البیان ونور الثقلین ذیل آیہ)

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

”یا ابن آدم اذا رأيت ربك سبحانه يتابع عليك نعمه وانت تعصيه فاحذره“

(نہج البلاغہ، کلمہ ۲۵)

”اے آدم کے بیٹے! تو یہ دیکھ کہ خدا تجھے پے در پے نعمتیں بخش رہا ہے جب کہ تو گناہ کرتا جا رہا ہے، تو تو اس کی سزا اور عذاب سے ڈر کیوں کہ یہ عذاب کا مقدمہ ہے“

کتاب تلخیص الاقوال میں امام حسن عسکری علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے:

امیر المومنین کے غلام قبر کو حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو حجاج نے اس سے پوچھا کہ تو علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) کے لئے کیا کام کیا کرتا تھا، قبر نے کہا کہ میں آپ (علیہ السلام) کے لئے وضو کے اسباب فراہم کرتا تھا، حجاج نے پوچھا کہ علی (علیہ السلام) جب وضو سے فارغ ہوتے تھے تو کیا کہا کرتے تھے، قبر نے کہا کہ وہ یہ آیت پڑھا کرتے تھے:

”فلما ہوا ما ذکرُوا بہ فتحنا علیہم ابواب کل شی“ اور آخر آیت تک تلاوت کی، حجاج نے کہا کہ میرا گمان یہ ہے کہ

علی اس آیت کو ہم پر تطبیق کیا کرتے تھے، قبر نے پوری دلیری کے ساتھ جواب دیا، کہ جی ہاں! (نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ

۱۸)۔

۳۔ ان آیات میں ہے کہ بہت سے رنج اور حوادث سے مراد توجہ اور بیداری کی حالت کو ایجاد کرنا ہے اور یہ آفات

اور بلاؤں کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے، جس کے متعلق ہم توحید^(۷) کی بحث میں گفتگو کر چکے ہیں۔

لیکن توجہ کے لائق بات یہ ہے کہ اس امر کو پہلے لفظ ”لعل“ (شاید) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ مصائب اور بلائیں بیداری کے لئے تنہا کافی نہیں ہے بلکہ یہ تو آمادگی رکھنے والے دلوں کے لئے زمین ہموار کرتی ہے، ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ”لعل“ کلام خدا میں عام طور سے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں اور دوسری شرائط بھی درمیان میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ یہاں تضرع کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اصل میں دودھ کے پستان میں آجانے اور دوہنے والے کے سامنے اس کے مطیع ہونے کے معنی میں ہے، پھر اس کے بعد یہ لفظ تواضع اور خضوع کے ساتھ ملی ہوئی اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا یعنی ان دردناک حادثات کو ہم اس لئے ایجاد کرتے تھے تاکہ وہ غرور و سرکشی اور خودخواہی کی سواری سے نیچے اترے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔

۴۔ یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں خداوند تعالیٰ (الحمد رب العالمین) کہتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ظلم فساد کی جڑ کا کاٹنا اور ایسی نسل کا نابود ہو جانا جو اس کام کو جاری رکھ سکے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ شکر و سپاس کی جگہ ہے۔

اس حدیث میں جو فضیل بن عیاض نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:
 من احب بقاء الظالمین فقد احب ان یعصى الله، ان الله تبارک وتعالیٰ حمد بنفسه بھلاک الظلمة فقال: فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد لله رب العالمین۔

جو ستمگروں اور ظالموں کی بقا چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی نافرمانی ہوتی رہے اور یہ فرمایا کہ ستمگر قوم کی نسل منقطع کردی گئی اور حمد و سپاس مخصوص ہے اس خدا کے لئے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

۱۔ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے (جلد ۱۲، صفحہ ۲۲۴)۔

۲۔ کتاب ”آفریدگار جہاں“ اور کتاب ”جستجوئے خدا“ کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹

۴۶ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ﴾ -

۴۷ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنَا كُنتُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَعْتَهُ أَوْ جَهْرَةً هَلَ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ﴾ -

۴۸ ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ -

۴۹ ﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ -

ترجمہ:

۶۴- کہہ دو کہ کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر خدا تمہارے کان اور آنکھیں تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (کہ تم کوئی بات نہ سمجھ سکو) تو خدا کے سوا اور کون ہے کہ جو یہ چیزیں تمہیں دیدے، دیکھو ہم آیات کی کس طرح مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں اس کے بعد وہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔

۴۷- کہہ دو کہ کیا تم نے یہ بھی غور کیا کہ اگر خدا کا عذاب اچانک (اور پوشیدہ) یا آشکار تمہارے پاس آجائے تو کیا ظالموں کے گروہ کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا۔

۴۸- اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے سوائے اس کے کہ وہ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، پس جو لوگ ایمان لے آئے اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کے لئے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

۴۹- وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ان کی نافرمانیوں کے سبب خداوند تعالیٰ کا عذاب انہیں پہنچے گا۔
نعمتیں بخشے والے کو پہچانیے

روئے سخن بدستور مشرکین ہی کی طرف ہے

ان آیات میں ایک دوسرے بیان کے ذریعے ان کو بیدار کرنے کے لئے استدلال ہوا ہے اور دفع ضرر کے حوالے سے کہا گیا ہے: اگر خدا آنکھ جیسی اپنی گراں بہا نعمتیں تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے اس طرح سے کہ تم اچھے اور برے اور حق و باطل کے درمیان تمیز نہ کر سکو تو خدا کے سوا کون ہے جو نعمتیں تمہیں پلٹا سکے۔ ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ

إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ﴾ -

حقیقت میں مشرکین بھی قبول کرتے تھے کہ خالق و رازق خدا ہی ہے اور بتوں کی بارگاہ خدا میں شفاعت کے عنوان سے پرستش کرتے تھے، قرآن کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ان بے قدر و قیمت بتوں کی پرستش کرو کہ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، تم براہ راست خدا کے دروازے پر کیوں نہیں جاتے، وہ خدا جو تمام نیکیوں اور برکات کا سرچشمہ ہے۔ اس اعتقاد کے علاوہ جو تمام بت پرست خدا کے بارے میں رکھتے تھے، یہاں پر ان کی عقل کو بھی فیصلہ کی دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ بت جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں اور نہ ہی عقل ہوش رکھتے ہیں، دوسروں کو یہ چیزیں کیسے عطا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے: دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے آیات و دلائل کی تشریح کرتے ہیں لیکن وہ پھر بھی حق سے منہ پھر لیتے ہیں ﴿انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ﴾۔

”ختم“ کے معنی اور اس بات کی علت کے ”سمع“ قرآن کی آیت میں عام طور پر مفرد اور ابصار جمع کیوں آتا ہے؟ اس بارے میں ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد، ص ۱۰۱ (اردو ترجمہ) پر بحث کی ہے۔

”تصرف“ تصریف کے مادہ سے تغیر کے معنی میں ہے اور یہاں مختلف شکل کے استدلال کرنا مراد ہے۔

”یصدفون“ ”صدف“ (بروزن ہدف) کے مادہ سے ہے جو ”سمت“ اور ”طرف“ کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کے وقت دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے لہذا یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے البتہ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ مادہ اعراض کرنے اور شدید روگردانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعد والی آیت میں ان تینوں عظیم الہی نعمتوں (آنکھ، کان اور فہم) کے ذکر کے بعد کہ جو دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے، تمام نعمتوں کے کلی طور پر سلب ہونے کے امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انھیں کہہ دو کہ اگر خدا کا عذاب اچانک بلا کسی اطلاع کے یا آشکار ہانکے پکارے تمہارے پاس آجائے تو کیا ظالموں کے سوا کوئی اور نابود ہوگا ﴿قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الظَّالِمُونَ﴾ (۱)۔

”بغتہ“ کا معنی ناگہانی اور اچانک ہے اور ”جہرتہ“ آشکار اور علی الاعلان کے معنی میں ہے، قاعدہ کی رو سے تو آشکار کے مقابلہ میں پنہاں ہونا چاہئے نہ کہ ناگہانی، چونکہ ناگہانی امور کے مقدمات عام طور پر مخفی اور پنہاں ہوتے ہیں، کیوں کہ اگر وہ پنہاں نہ ہوں تو ناگہانی نہیں بنتے، اس بنا پر ”بغتہ“ کے لفظ میں پنہاں کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔

اس سے منظور یہ ہے کہ جو ذات طرح طرح کی سزائیں دینے اور نعمتوں کے چھین لینے پر قدرت رکھتی ہے وہ صرف اور صرف ذات خدا ہے اور بتوں کا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔
اس بنا پر کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے کہ ان کی پناہ لو لیکن چونکہ خدا حکیم اور رحیم ہے لہذا وہی ستمگاریوں کی کوہی سزا دیتا ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ”ظلم“ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو قسم قسم کے شرک اور گناہوں کو شامل ہے بلکہ قرآن کی آیات میں شرک کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ﴿لَا تَشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾

بیٹا! خدا کا کسی کو شریک نہ بنانا کیوں کہ شرک ظلم عظیم ہے، (لقمان، ۱۳)۔

بعد والی آیت میں خدائی پیغمبروں کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نہ صرف یہ کہ بے جان بتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ بزرگ انبیاء اور خدائی رہبر و رہنما بھی سوائے ابلغ رسالت، بشارت و نذارت اور تشویق اور تہدید کے اور کوئی کام نہیں کرتے اور جو بھی نعمت ہے وہ خدا کے حکم سے اور اسی کی طرف سے ہے اور وہ (انبیاء) بھی اپنی حاجات کو اسی سے طلب کرتے ہیں ﴿وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾۔

اس آیت کے گزشتہ آیات کے ساتھ تعلق کے بارے میں اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں کئی قسم کے تشویق و تہدید سے متعلق گفتگو ہے، اس آیت میں ہے کہ یہ وہی ہدف ہے کہ جس کے لئے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں، ان کا کام بھی بشارت و نذارت (خوشخبری دینا اور ڈرانا ہی) تھا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ راہ نجات دو چیزوں میں منحصر ہے ۱۔ وہ لوگ جو ایمان لے آئے، ۲۔ اور اپنی اصلاح کر لیں (اور عمل صالح انجام دیں) انھیں نہ خدائی سزا کا خوف ہے اور نہ ہی اپنے گزشتہ اعمال کا غم و اندوہ ہے ﴿فَمَنْ أَمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾۔

اور ان کے مقابلے میں جو لوگ آیات الہی کی تکذیب کرتے ہیں وہ اس فسق اور نافرمانی کے بدلے میں خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار ہوں گے ﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آیات خدا کی تکذیب کرنے والوں کی سزا کے بارے میں ”يَمْسُئُهُمُ الْعَذَابُ“ کی تعبیر ہوئی ہے (یعنی پروردگار کا عذاب انھیں لمس کرتا ہے)، گویا عذاب ہر جگہ ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس کے بعد وہ انھیں بدترین طریقہ سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ ”فسق“ ایک وسیع المعنی لفظ ہے اور ہر طرح کلی نافرمانی، خدا کی اطاعت سے باہر ہو جانا یہاں تک کہ کفر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اوپر والی آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے، اس بنا پر ان بحثوں کا جو فخر الدین رازی اور دیگر مفسرین نے فسق کے بارے میں اس مقام پر کی ہے اور اسے گناہوں کے معنی میں بھی شامل سمجھتے ہوئے دفاع کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں، کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

۱۔ ”ارئیکم“ کے معنی اور اس کے تجزیہ اور ترکیب کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اسے ”اخرونی“ کے معنی میں لیں بلکہ اس کا مفہوم ہے ”ہل علمتم“ کیا تمہیں معلوم ہے۔

آیت ۵۰

۵۰۔ ﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِيَ خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنَّا تَبِعُوا إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾۔

ترجمہ:

۵۰۔ کہہ دو کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں اور نہ میں غیب سے آگاہ ہوں (سوائے اس کے کہ جو خدا مجھے تعلیم دیتا ہے) اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر وحی ہوتی ہے، کہہ دو کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہیں تم اس پر غور کیوں نہیں کرتے؟

غیب سے آگاہی

اوپر والی آیت میں کفار و مشرکین کے مختلف اعتراضات پر دئے گئے جوابات کا آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان کے اعتراضات کے تین حصوں کا مختصر جملوں میں جواب دیا گیا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ وہ (کفار و مشرکین) پیغمبر سے عجیب و غریب معجزات کے مطالبے کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مطالبہ اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہوا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ دوسروں کی درخواست پر دکھائے جانے والے معجزات کے مشاہدے پر بھی قناعت نہیں کرتے تھے، وہ پیغمبر سے کبھی سونے کے مکانات کا، کبھی ملائک کے نزول کا، کبھی مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ زمین کے سرسبز و شاداب باغوں میں بدل جانے کا اور کبھی دوسری قسم کے مطالبات کا تقاضا کیا کرتے تھے، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۰ کے ذیل میں اس کی تفصیل آئے گی۔

گویا وہ ایسے عجیب و غریب تقاضے کر کے پیغمبر کے لئے ایک قسم کے مقام الوہیت اور زمین و آسمان کی ملکیت کی توقع رکھتے تھے، لہذا ان افراد کے جواب میں پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ میرا یہ ہر گز دعویٰ نہیں ہے کہ خدائی خزانے میرے ہاتھ میں ہیں ﴿قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِيَ خَزَائِنُ اللَّهِ﴾۔

”خزائن“ جمع ہے ”خزانہ“ کی اور خزانہ ہر چیز کے منبع و مرکز کو کہتے ہیں کہ جس کی حفاظت کے لئے اور دوسروں کے اس تک دسترس حاصل کرنے کے لئے اسے وہاں جمع کیا گیا ہو۔ ﴿وَأَنَّ مِنْ شَيْءٍ آتَيْنَا خَزَائِنَهُ وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (سورہ حجر آیہ ۲۱)۔

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم معلوم اندازے کے سوا اسے نازل نہیں کرتے۔

اس آیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”﴿خَزَائِنُ اللَّهِ﴾“ تمام چیزوں کے منبع اور مرکز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور حقیقت میں یہ منبع اسی ذات لائتاہی کے قبضہ قدرت میں ہے کہ جو تمام کمالات اور قدرتوں کا سرچشمہ ہے

اس کے بعد ان افراد کے مقابلے میں جو یہ توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر انہیں تمام گزشتہ اور آئندہ کے اسرار سے آگاہ کریں یہاں تک کہ انہیں یہ بھی بتلائیں کہ ان کی زندگی سے متعلق کون سے حادثات رونما ہونگے تاکہ وہ رفع ضرر اور جلب منفعت کے لئے آمادہ ہو جائیں کہتا ہے: کہئے! میں ہرگز دعویٰ نہیں کرتا کہ میں تمام پوشیدہ امور اور اسرار غیب سے آگاہ ہوں ﴿وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ﴾۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تمام چیزوں صرف وہی ذات باخبر ہو سکتی ہے جو ہر مکان اور ہر زمان میں حاضر و ناظر ہو اور وہ صرف خدا ہی کی ذات پاک ہے لیکن اس کے سوا ہر وہ شخص کہ جس کا وجود ایک معین زمان و مکان میں محدود ہو طبعاً ہر چیز سے باخبر نہیں ہو سکتا لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ خداوند عالم غیب کا کچھ حصہ کہ جس کی وہ مصلحت جانتا ہے اور جو خدائی رہبروں کی رہبری کی تکمیل کے لئے ضروری ہے ان کے اختیار میں دیدے، البتہ اس کو بالذات علم غیب نہیں کہتے بلکہ اس کو بالعرض علم غیب کہتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں یہ عالم الغیب سے یاد کیا ہو اور پڑھا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن کی متعدد آیات گواہی دیتی ہے کہ خدا نے اس قسم کا علم نہ صرف یہ کہ انبیاء اور خدائی رہنماؤں کو دیا ہے بلکہ بعض اوقات ان کے غیر کو بھی دیا ہے، منجملہ ان آیات کے سورہ جن آیہ ۲۶ و ۲۷ میں ہے:

خدا تمام پوشیدہ امور سے آگاہ ہے اور وہ کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر ان رسولوں کو جن سے وہ راضی ہو۔ اصولی طور پر مقام رہبری کی تکمیل کے لئے۔ علی الخصوص ایسی رہبری جو تمام لوگوں کے لئے ہو، بہت سے ایسے مسائل پر مطلع ہونے کی ضرورت ہے جو باقی دوسرے لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں اور اگر خدا یہ علم غیب اپنے بھیجے ہوئے افراد اور اپنے اولیاء کو نہ دے تو ان کا مقام رہبری تکمیل تک نہیں پہنچتا (غور کیجئے گا)۔

یہ بات تو اپنے مقام پر مسلم ہے کہ بعض اوقات ایک موجود زندہ بھی اپنی زندگی کو جاری رکھنے کے لئے غیب کے ایک گوشہ کو جاننے کا محتاج ہے اور خدا اس کے اختیار میں دیتا ہے، مثلاً ہم نے سنا ہے کہ بعض حشرات اور کیڑے مکوڑے گرمیوں میں سردیوں کے موسمی حالات کی پیش بینی کرتے ہیں، یعنی خداوند تعالیٰ نے یہ علم غیب

خصوصیت کے ساتھ انھیں دے رکھا ہے کیوں کہ ان کی زندگی اس کے بغیر بسا اوقات فنا کی گود میں چلی جاتی ہے، ہم اس امر کی مزید تفصیل انشاء اللہ سورہ اعراف کی آیہ ۱۸۸ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے سوال کے جواب میں کہ جو یہ توقع رکھتے تھے کہ خود پیغمبر کو فرشتہ ہونا چاہئے یا کسی فرشتہ کو ان کے ہمراہ ہونا چاہئے اور کسی قسم کے عوارض بشری (مثلاً کھانا، کوچہ و بازار میں چلنا پھرنا) ان میں نظر نہ آئےں ارشاد ہوتا ہے: میرا ہر گز دعویٰ نہیں ہے کہ میں فرشتہ ہوں ﴿وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ﴾۔

بلکہ میں تو صرف ان احکام و تعلیمات کی پیروی کرتا ہوں کہ جو پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی مجھ تک پہنچتے ہیں ﴿إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم کے پاس جو کچھ بھی تھا اور آپ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا سرچشمہ وحی الہی ہی تھی اور جیسا کہ بعض حضرات نے خیال کیا کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے، ایسا ہرگز نہیں ہے اور اسی طرح نہ وہ قیاس پر عمل کرتے تھے اور نہ ہی کسی اور بات پر بلکہ دینی امور میں آپ کا پروگرام صرف وحی کی پیروی میں ہوتا تھا (۱)۔

اور آیات کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کہہ دو کہ نابینا اور بینا افراد برابر ہیں اور کیا وہ لوگ کہ جنھوں نے اپنی آنکھوں اور فکر و عقل کو بند کر رکھا ہے ان اشخاص کے برابر ہے جو حقائق کو اچھی طرح سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کیا تم اس بات پر غور نہیں کرتے ﴿فَلْهَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾۔

گذشتہ تین جملوں کے بعد اس جملے کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ اس سے پہلے جملوں میں پیغمبر نے فرمایا: میں نہ خدائی خزانے رکھتا ہوں، نہ غیب کا عالم ہو اور نہ ہی میں فرشتہ ہوں میں تو صرف وحی کا پیروکار ہوں، لیکن یہ گفتگو اس معنی میں نہیں ہے کہ تم جیسے ہٹ دھرم بت پرستوں کی طرح ہوں بلکہ میں ایک بینا انسان ہوں جب کہ تم نابیناؤں کی طرح ہو اور یہ دونوں مساوی نہیں ہے۔

اس جملہ کا پہلے جملوں سے تعلق اور جوڑ کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ توحید اور پیغمبر کی حقانیت کی دلیلیں بالکل واضح و آشکار ہے لیکن انھیں دیکھنے کے لئے چشم بینا کی ضرورت ہے اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بات مبہم اور یا پیچیدہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بینا نہیں ہو، کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟۔

۱۔ پیغمبر کے تمام امور دینی تھے وہاں دنیاوی اور دینی امور کا کوئی الگ الگ تصور نہیں ہے (مترجم)

آیت ۵۱

۵۱ ﴿وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُخْشَرُوا إِلَىٰ رَحْمَتٍ لَّيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيُّ وَلَا شَفِيعٌ لَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾۔

ترجمہ:

۵۱۔ اس (قرآن) کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈراؤ جو حشر و نشر اور قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں (وہ دن کہ جس میں) یار و یاور، سرپرست اور شفاعت کرنے والا سوائے اس (خدا) کے نہ رکھتے ہوں گے، شاید وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں۔

قرآن کے ذریعہ ایسے لوگوں کو ڈراؤ

گذشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ نابینا اور بینا یکساں نہیں ہیں اور اس کے میں بعد اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے: قرآن کے ذریعہ ایسے لوگوں کو ڈراؤ اور بیدار کرو جو قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں، یعنی کم از کم ان کی آنکھیں اتنی ضرور کھلی ہوئی ہیں کہ وہ یہ احتمال رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب ہوگا اور اس احتمال کے زیر سایہ اور جوابدہی کے خوف سے قبول کرنے کے لئے آمادگی کریں ﴿وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُخْشَرُوا إِلَىٰ رَحْمَتٍ﴾۔

شاید ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ افراد کی ہدایت کے لئے صرف ایک لائق رہبر اور ایک جامع تربیتی پروگرام ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود افراد میں بھی ایک قسم کی آمادگی ضروری ہے، جیسا کہ آفتاب کی روشنی چاہ سے راہ کو تلاش کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ چشم بینا کی بھی ضرورت ہے اور مستعد و آمادہ بیج بھی بار آؤ نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمین آمادہ و تیار نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ ”بہ“ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے اگرچہ قبل کی آیات میں قرآن کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہو، لیکن یہ بات قرائن سے واضح ہے۔

اسی طرح ”یخافون“ (ڈرتے ہیں) سے مراد وہی نقصان و ضرر کا احتمال ہے کہ جو ہر عقلمند کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انبیاء اور رہبران خدا کی دعوت پر غور کرتا ہے کہ شاید ان کی دعوت حق ہو، اور اس کی مخالفت زیان اور خسارے کا سبب بنے لہذا کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان کی دعوت کا مطالعہ کریں اور ان کے دلائل پر غور کریں؟۔

یہ ہدایت کی اولین شرائط میں سے ایک ہے، اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے علماء عقائد لزوم ”دفع ضرر محتمل“ کے عنوان سے مدعی نبوت کی دعوت کے مطالعہ کے وجوب اور خدا کی شناسائی کے بارے میں مطالعہ کے لزوم کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیدار دل افراد اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب سوائے خدا کے اور کوئی پناہ گاہ اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا ﴿لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ﴾۔

ہاں ایسے افراد کو ڈراؤ اور انھیں خدا کی طرف دعوت دو کیوں کہ ان کے بارے میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی امید ہے ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾۔

البتہ اس آیت میں غیر خدا کی ولایت و شفاعت کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی، کیوں کہ جیسا کہ ہم پہلے ارشاد کر چکے ہیں کہ یہاں بالذات شفاعت و ولایت کی نفی مراد ہے، یعنی دو مقام ذاتی طور پر خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اب اگر اس کا غیر مقام ولایت و شفاعت رکھتا ہے تو وہ اس کے اذن و اجازت اور فرمان کے ساتھ ہے جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾

کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر شفاعت کرے (سورہ بقرہ، ۲۵۵)۔

اس کی مزید توضیح اور شفاعت کی مکمل بحث کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد اول، صفحہ ۱۹۸ (اردو ترجمہ) اور جلد دوم، صفحہ ۱۵۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

آیات ۵۲، ۵۳

۵۲ ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ -

۵۳ ﴿وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ﴾ - ترجمہ:

۵۲- ان لوگوں کو جو صبح شام خدا کو پکارتے ہیں اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی پر نگاہ نہیں رکھتے اپنے سے دور نہ کر۔ نہ ان کا حساب تجھ پر ہے اور نہ تیرا حساب ان پر ہے، اگر تو ان کو دھتکارے گا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔
۵۳- اور اس طرح ہم نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ساتھ آزمایا ہے (تو نگروں کو فقیروں کے ذریعے) تاکہ وہ یہ کہیں کہ کیا یہ ہے وہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان سے (چنا ہے اور) ان پر احسان کیا ہے (اور انہیں نعمت ایمان سے نوازا ہے) تو کیا خدا شکر کرنے والوں کو بہتر طور پر پہچانتا نہیں ہے؟۔

شان نزول

اوپر والی آیات کی شان نزول میں بہت سے روایات نقل ہوئی ہیں کہ جو سب کی سب ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں، منجملہ ان کے ایک وہ ہے جو تفسیر ”در المنثور“ میں اس طرح نقل ہوئی ہے کہ قریش کی ایک جماعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے گزری جب کہ صہیب، عمار، بلال اور خباب اور ان ہی جیسے دوسرے فقیر اور مزدور قسم کے مسلمان پیغمبر کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے یہ منظر دیکھ کر تعجب کیا (اور چونکہ وہ شخصیت کو مال و ثروت اور مقام و منصب میں منحصر سمجھتے تھے لہذا وہ ان مردان بزرگ کے مقام روحانی کی عظمت اور آئندہ کے عظیم اسلامی اور انسانی معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں ان کے کارناموں کے نقوش کو سمجھ نہ سکے) اور کہنے لگے کہ اے محمد! کیا آپ نے ساری جمعیت میں سے بس ان ہی افراد پر قناعت کر لی ہے؟ کیا یہی ہے وہ کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان میں سے منتخب کیا ہے؟ کیا ہم ان کے پیرو ہو جائیں؟ جتنا جلدی ہو سکے آپ انہیں اپنے سے دور کر دیجئے تو شاید ہم آپ کے قریب آجائیں اور آپ کی پیروی کر لیں، اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اس تقاضے اور مطالبے کو شدت کے ساتھ رد کر دیا گیا۔

بعض مفسرین اہل سنت نے اسی جیسی ایک حدیث نقل کی ہے، مثلاً ”المنار“ کے مولف نے اسی کے مانند روایت کرتے ہوئے مزید اضافہ کیا ہے کہ عمر بن خطاب وہاں حاضر تھے اور انھوں نے پیغمبر اکرم سے یہ تقاضا کیا کہ اس میں کیا صرح ہے کہ ہم ان کے مطالبہ کو مان لیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں تو ان پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئی اور ان کے اس تقاضے کو بھی رد کر دیا گیا۔

اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اس سورہ کی بعض آیات کی شان نزول کا ذکر کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ پوری صورت ایک سورہ ایک ہی جگہ نازل ہوئی ہو، کیوں کہ جیسا کہ ہم پہلے بھی ارشاد کر چکے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سورت کے نزول سے پہلے طرح طرح کے حوادث مختلف فاصلوں میں رونما ہو چکے ہوں اور یہ سورت ان سب حوادث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو۔

اس مقام پر اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری نظر آتا ہے کہ کچھ روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبر نے ان کی پیش کش قبول نہ کی تو انھوں نے یہ درخواست کی کہ اشراف قریش اور فقیر صحابہ کے درمیان باری مقرر کر لیں، یعنی ایک روز ان کے لئے اور ایک دن ان کے لئے مقرر کر دیں تاکہ وہ اکٹھے میں ایک ہی جلسہ میں نہ بیٹھیں تو پیغمبر اکرم نے (پہلے) ان کی یہ تجویز قبول کر لی تاکہ شاید یہ بات ان کے ایمان لانے کا ذریعہ بن جائے تو انھوں نے کہا کہ یہ مطلب ایک قرارداد کے عنوان سے تحریر میں لایا جائے پیغمبر نے حضرت علی (علیہ السلام) کو مذکورہ قرارداد لکھنے پر مامور ہی کیا تھا کہ اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس کام سے روک دیا گیا۔

لیکن یہ روایت علاوہ اس کے کہ تعلیمات اسلامی کی روح کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور آپ نے کبھی اس قسم کے امتیازی سلوک کی طرف جھکاؤ کا مظاہر نہیں کیا بلکہ ہر جگہ معاشرہ اسلامی کی وحدت کی بات کی ہے، قبل کی آیت ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں کہا گیا ہے ”﴿ان اتبع الا ما یوحی الی﴾“ (میں تو صرف وحی الہی کی پیروی کرتا ہوں)، یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر نے وحی کا انتظار کئے بغیر اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا ہو۔ علاوہ ازیں ”لا تطرد“ کا جملہ جو زیر بحث آیت کی ابتدا میں ہے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان کا مطالبہ اصحاب پیغمبر کے اس گروہ کو مطلقاً ہمیشہ کے لئے اپنے سے دور کرنے کے لئے تھا نہ کہ نبوت اور باری مقرر کرنے کا مطالبہ تھا، کیوں کہ ”تناوب“ اور ”طرد“ میں بہت فرق ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شان نزول وہی ہے جو ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں

طبقاتی تقسیم کے خلاف جنگ

اس آیت میں مشرکین کی ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھیں توقع تھی کہ پیغمبر فقیر طبقے کے مقابلے میں ثروت مندوں کے لئے امتیاز کے قائل ہو جائیں گے اور ان کا خیال تھا کہ ان اصحاب پیغمبر کے پاس بیٹھنا اور ان کے لئے عیب اور بہت بڑا نقص ہے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ اس قسم کے لغو اور بے بنیاد امتیازات کو ختم کر دے، اسی لئے وہ اس تجویز پر بہت مصر تھے، کہ پیغمبر اس گروہ کو اپنے قرب سے دور کریں لیکن قرآن صراحت کے ساتھ اور وزنی دلائل پیش کر کے ان کی تجویز کی نفی کرتا ہے، پہلے کہتا ہے: ان اشخاص کو کہ جو صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور سوائے اس کی ذات پاک کے ان کی نظر کسی پر نہیں ہے انھیں ہرگز اپنے سے دور نہ کرنا

﴿لَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (۱)۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہاں بجائے اس کے کہ ان اشخاص کا نام یا عنوان ذکر کیا جاتا صرف اس صفت کے ذکر کرنے پر قناعت ہوئی ہے کہ وہ صبح اور شام۔ اور دوسرے لفظوں میں ہمیشہ۔ خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں اور یہ عبادت پرستش اور پروردگار کی طرف توجہ نہ تو کسی اور غرض کے لئے ہے اور نہ ریاکاری سے بلکہ (ان کی یہ عبادت) صرف اس کی ذات پاک کے لئے ہے، وہ اسے صرف، خود اسی کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کے پاس ہیں اور کوئی امتیاز اس امتیاز کی برابری نہیں کر سکتا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ثروت مند اور خود پسند مشرکین کی طرف سے یہ پہلی اور آخری بار نہ تھا کہ انھوں نے پیغمبر کو ایسی تجویز پیش ہو بلکہ وہ بارہا ایسا اعتراض کر چکے تھے کہ پیغمبر نے کچھ بیکس وینوا افراد کو اپنے گرد کیوں جمع کر لیا ہے اور ان کا یہ اصرار تھا کہ آپ انھیں اپنے پاس سے چلتا کر دیں۔

حقیقت میں یہ لوگ ایک پرانی غلط روایت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ افراد میں امتیاز دولت و ثروت کے سبب سے ہوتا ہے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ معاشرے کے طبقات جو ثروت کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں اہ محفوظ رہنے چاہئیں اور ہر وہ دین اور ہر وہ دعوت جو طبقاتی زندگی کو ختم کرنا چاہے اور ان امتیازات کو نظر انداز کرے اور ان کی نظر میں مطرود اور ناقابل قبول ہے۔

ہم حضرت نوح علیہ السلام کے حالات میں بھی پڑھتے ہیں کہ ان کے زمانے کے ”بڑے آدمی“ ان سے یہ کہتے تھے:

﴿وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاظُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ﴾

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تمہاری پیروی کی ہو سوائے ان لوگوں کے جو ہم میں سے فرومایہ اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (ہود آیہ ۲۷)۔

اور وہ اسے ان کی رسالت کے باطل ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔

ایک نشانی اسلام اور قرآن کی عظمت کی بلکہ کلی طور پر انبیاء کی عظمت کی یہ ہے کہ ان سے جتنی سختی کے ساتھ ہو سکتا تھا اس قسم کی سوچوں کا مقابلہ کیا اور ایسے معاشروں میں کہ جن میں طبقاتی اختلاف ایک دائمی مسئلہ شمار ہوتا تھا، ایک موہوم امتیاز کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلمان، ابوذر، صہیب، خباب اور بلال جیسے پاک دل غلام، صاحب ایمان اور عقلمند افراد میں مال و دولت نہ رکھنے کے باوجود معمولی سی بھی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور بے مغز، کور دل، خود خواہ اور متکبر ثروت مند اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے اجتماعی اور معنوی امتیازات سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔

بعد والے جملے میں فرمایا گیا ہے: کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے صاحبان ایمان کو تو اپنے سے دور کمرے نہ ان کا حساب تیرے اوپر اور نہ تیرا حساب ان کے اوپر ہے (مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ) اس کے باوجود اگر تم ان کو اپنے سے دور کرو گے تو ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (فَتَطْرَدُهُمْ الْمُتَكَبِّرُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ)۔

اس کے بارے میں کہ یہاں پر حساب سے کونسا حساب مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض کا احتمال ہے کہ اس سے مراد ان کی روزی کا حساب ہے۔

یعنی اگر ان کا ہاتھ مال دولت سے خالی ہے تو وہ تمہارے کندھے پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے کیوں کہ ان کی روزی کا حساب تو اللہ پر ہے، جیسا کہ تم بھی اپنی زندگی کا بوجھ ان پر نہیں ڈالتے، اور تمہاری روزی کا حساب ان پر نہیں ہے۔

ابھی ہم وضاحت کریں گے یہ احتمال بعید نظر آتا ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ حساب سے مراد عمل کا حساب ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ کس طرح فرماتا ہے کہ ان کے اعمال کا حساب تم پر نہیں ہے حالانکہ ان کا کوئی برا عمل نہیں تھا کہ ایسی بات کرنا ضروری ہوتا، یہ اس بنا پر ہے کہ مشرکین اصحاب پیغمبر میں سے فقراء کو مال ثروت نہ ہونے کی وجہ سے خدا سے دور سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے اعمال خدا کے ہاں قابل

قبول ہوتے تو پھر انھیں زندگی کے لحاظ سے خوش حال کیوں نہیں بنایا گیا، علاوہ ازیں وہ انھیں اس بات سے مستہم کرتے تھے کہ شاید ان کا ایمان لانا زندگی کی اصلاح اور روٹی پانی کے حصول کے لئے تھا۔

قرآن انھیں جواب دیتا ہے کہ فرض کرو کہ وہ ایسے ہی ہوں، لیکن ان کا حساب تو خدا کے ساتھ ہے، صرف اس بات پر کہ وہ ایمان لے آئیں اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں، کسی قیمت پر انھیں دھتکارا نہیں جانا چاہئے اور اس طرح سے امراء قریش کی بہانہ جوئیوں پر گرفت کی گئی ہے۔

شاید یہ تفسیر وہی کہ کہ جو حضرت نوح (علیہ السلام) کی داستان میں بیان ہوئی ہے جو اشراف قریش کی داستان کے مشابہ ہے، جہاں قوم نوح آپ سے کہتی ہے: ﴿انہ من لک واتبعک الا ردلون﴾

کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ بے وقعت افراد نے تیری پیروی کی ہے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) ان کے جواب میں کہتے ہیں:

﴿وما علمى مما كانوا يعملون ان حسابهم الا على ربى لو تشعرون وما انا بطارد المومنین﴾

مجھے ان کے اعمال کی کیا خبر ہے، ان کے اعمال کا حساب تو اللہ پر ہے اگر تم جانو اور جنھوں نے ایمان کا اظہار کیا ہے میں انھیں اپنے سے دور نہیں کر سکتا^(۲)۔

خلاصہ یہ کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ ہے کہ بغیر فرق و امتیاز کے جو شخص بھی ایمان کا اظہار کرے خواہ وہ کسی بھی قوم، قبیلہ اور طبقہ سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو اسے قبول کر لے چہ جائیکہ وہ پاک دل اور صاحب ایمان افراد ہوں کہ جو خدا کے سوا کسی کے جویا نہیں ہیں اور ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ ان کا ہاتھ مال و ثروت سے خالی ہے اور وہ اشراف کی نکبت بار زندگی میں آلودہ نہیں ہیں۔

۱۔ ”وجہ“ کا معنی لغت میں چہرہ ہے اور بعض اوقات ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے، زیر نظر آیت اس سے مراد دوسرا معنی ہی ہے اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کہ جلد دوم، صفحہ ۲۰۵ (اردو ترجمہ) پر مطالعہ کریں۔

اسلام کا ایک عظیم امتیاز

ہم جانتے ہیں کہ آج کل کی مسیحیت میں مذہبی راہنماؤں کا دائرہ اختیار مضحکہ انگیز حد تک پاچکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے لئے گناہ بخش دینے کے حق کے قائل ہیں اور اسی بنا پر اگر وہ چاہیں کسی شخص کو معمولی سی بات پر دھتکار دیں اور کافر قرار سے دیں اور چاہیں تو کسی کو قبول کر لیں۔

قرآن مجید زیر نظر آیت میں اور دیگر آیات میں راحت کے ساتھ یاد دہانی کرتا ہے کہ نہ صرف مذہبی علماء بلکہ پیغمبر کی ذات تک بھی اظہار ایمان کرنے والے کو دھتکارنے اور دور کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے، جب کہ انھوں نے کوئی ایسا کام بھی انجام نہیں دیا کہ جو ان کے اسلام سے خارج ہونے کا سبب بنے، گناہوں کی بخشش اور بندوں کا حساب و کتاب صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس کام میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، آیت میں موضوع بحث ”طرذ مذہبی“ ہے نہ کہ ”طرذ حقوقی“ اس معنی میں کہ اگر مثلاً ایک مدرسہ خاص قسم کے طالب علموں کے لئے وقف ہو اور کوئی شخص ابتدا سے ان شرائط کا حامل ہو اور بعد ان میں یہ شرائط باقی نہ رہے تو اسے اس مدرسہ سے نکالنا کوئی منع نہیں رکھتا اور اسی طرح اگر مدرسہ کا متولی مدرسہ کی مصلحتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کچھ اختیارات رکھتا ہو تو اس مدرسہ کے نظام اور اس کی حیثیت و موقعیت کی حفاظت کی لئے ان جائز اختیارات سے استفادہ کرنے میں کوئی صرح نہیں ہے (اس بنا پر وہ مطالب جو تفسیر المنار میں اس آیہ کے ذیل میں اس مطالب کے برخلاف نظر آتے ہیں وہ ”طرذ مذہبی“ کے ”طرذ حقوقی“ سے اشتباہ سے پیدا ہوئے ہیں)۔

بعد والی آیت میں بے ایمان دولت مند افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ واقعات ان کے لئے آزمائش ہیں اور اگر وہ ان آزمائشوں کی بھٹی سے صحیح طریقے سے باہر نہ نکل سکے تو وہ دردناک عواقب و انجام کے متحمل ہوں گے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس طرح سے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ذریعے آزمایا ﴿وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ﴾ یہاں ”فتنہ“ آزمائش کے معنی میں ہے^(۱)۔

اس سے سخت آزمائش اور کیا ہوگی کہ وہ اشراف اور دولت مند کہ جنھوں نے سا لہا سال سے یہ عادت بنائی ہوئی ہے کہ اپنے تمام معاملات کو نچلے طبقے کے لوگوں سے بالکل الگ رکھیں، نہ ان کی خوشی میں شریک ہوں اور نہ ہی ان کے رنج و غم میں، یہاں تک کہ ان کی قبریں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوں، وہ یکایک ان تمام آداب و رسوم توڑ ڈالیں اور

ان کی عظیم زنجیروں کو اپنے ہاتھ پاؤں سے نکال پھینکےں اور ایسے دین کو اپنالیں کہ جس کی طرف سبقت کرنے والے لوگ اصطلاح کے مطابق نچلے درجے اور طبقہ فقراء کے آدمی شمار ہوتے ہیں۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے کہ ان تو نگروں کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سچے مومنین کی طرف حقارت کی نگاہ ڈال کر کہتے ہیں: کیا یہی لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہمارے درمیاں سے چن لیا ہے اور انہیں نعمت ایمان و اسلام کے ساتھ نوازا ہے، کیا یہ اس قسم کی باتوں کی قابلیت رکھتے ہیں

﴿لَيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا﴾^(۲)

بعد میں ان کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ صاحبان ایمان ایسے افراد ہیں کہ انہوں نے عمل و تشخیص کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور اس کو روبہ عمل لائے ہیں، اسی طرح انہوں نے پیغمبر کی دعوت کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور ان کی دعوت کو قبول کیا ہے، اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر شکر اور کیا ہوگا، اسی بنا پر خدا نے ایمان کو ان کے دلوں میں راسخ کر دیا ہے، کیا خدا شکر گزاروں کو بہتر نہیں پہچانتا ﴿الَّذِينَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ﴾۔

۱۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کہ جلد ۲، سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۱ (صفحہ ۲۶ اردو ترجمہ) اور آیہ ۱۹۳ (صفحہ ۲۹ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ سورہ آل عمران آیہ ۱۶۴ کے ذیل میں اشارہ ہو چکا ہے کہ ”منّہ“ اصل میں نعمت بخشنے کے معنی میں ہے مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۳ (صفحہ ۱۲۲ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

آیات ۵۵، ۵۴

۵۴ ﴿وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

۵۵ ﴿وَكَذَلِكَ نَفْصِلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ﴾ -

ترجمہ:

۵۴۔ جب وہ لوگ ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہو، تم پر سلام ہو تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت فرض کر لی ہے، تم میں سے جو آدمی نادانی سے کوئی برا کام کر لے اس کے بعد توبہ اور اصلاح (وتلانی) کر لے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

۵۵۔ اور ہم اس طرح سے آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں (اور واضح کرتے ہیں) تاکہ گناہگاروں کا راستہ آشکار ہو جائے۔

سلام بر مؤمنان!

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جن کے متعلق گذشتہ آیات میں پیغمبر کو حکم دیا گیا تھا کہ انہیں اپنے پاس سے دھتکارے نہیں اور انہیں اپنے پاس سے جدا نہ کرے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کچھ گناہگاروں کے بارے میں ہے جو پیغمبر کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے بہت گناہ کئے ہیں اس پر رسول اللہ نے سکوت اختیار کیا تو زیر نظر آیت نازل ہوئی۔

بہر حال اس کی شان فزول خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم کلی اور وسیع ہے اور سب پر محیط ہے، کیوں کہ پہلے ایک قانون کلی کے طور پر پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ تمام اہل ایمان کو خواہ وہ گناہگار ہی کیوں نہ ہو، نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے دھتکارے نہیں بلکہ انہیں گلے لگائیں اور قبول کریں، اور فرمایا گیا کہ: جب وہ لوگ کہ جو ہماری آیات پر ایمان لا چکے ہیں تیرے پاس آئیں تو ان سے کہو تم پر سلام ہو

﴿وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ﴾ -

یہ سلام ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے اور پیغمبر کے وسیلہ سے ہو اور یا براہ راست خود پیغمبر کی طرف سے ہو، اور یہ بہر حال میں ان کی پذیرائی اور استقبال کرنے اور ان سے افہام و تفہیم اور دوستی کرنے کی دلیل ہے۔

دوسرے جملہ میں مزید فرمایا گیا ہے: تمہارے پروردگار نے رحمت کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ -

”کتب“ جو مادہ کتابت سے ہے لکھنے کے معنی میں ہیں اور بہت سے موقع پر لازم ہونے، قبول کرنے اور ذمہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیوں کہ لکھنے کے آثار میں سے ایک اثر کسی چیز کا مسلم ہونا اور ثابت رہ جانا ہے۔ تیسرے جملہ میں جو درحقیقت رحمت الہی کی توضیح و تفسیر ہے، ایک محبت آمیز تعبیر کے ساتھ یوں فرمایا گیا ہے: تم میں سے جو شخص کوئی کام از روئے جہالت انجام دے، اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح اور تلافی کرے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے

﴿أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں^(۱)، ایسے موقع پر ”جہالت“ سے مراد وہی شہوت اور خواہش نفسانی اور غلبہ اور طغیان و سرکشی ہے، جس میں انسان دشمنی اور عداوت کی بنا پر نہیں بلکہ ہویٰ و ہوس کے غلبہ کی خاطر اس طرح ہو جاتا ہے کہ فروغ عقل اور خواہش کا کنٹرول ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے، ایسا شخص اگرچہ گناہ اور حرام کا علم رکھتا ہے مگر چونکہ اس کا علم ہویٰ و ہوس کے پردے میں آگیا ہے اس لئے اس پر ”جہالت“ کا اطلاق ہوا ہے، مسئلہ طور پر ایسا شخص اپنے گناہ کے لئے جوابدہ ہے، لیکن چوں کہ وہ گناہ عداوت اور دشمنی کی بنا پر نہیں تھا لہذا وہ سعی و کوشش کرتا ہے کہ اس کی اصلاح اور تلافی ہو جائے۔

حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اسلام کو حکم دے رہی ہے کہ تم کسی بھی صاحب ایمان فرد کو خواہ وہ کسی طبقہ سے ہو، کسی نسل سے ہو اور کیسے ہی حالات سے دوچار ہو نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے نہ دھتکارو بلکہ اپنے دامن کو یکساں طور پر سب کے لئے کھول، یہاں تک کہ اگر کچھ لوگ بہت سے گناہوں میں آلودہ بھی ہو تو انہیں بھی قبول کر لو اور ان کی اصلاح کرو۔

بعد والی آیت میں اس مطلب کی تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: ہم اپنی آیات، نشانیاں اور احکام اس روشن اور مشخص کرتے ہیں کہ حق کے متلاشیوں اور اطاعت گزاروں کا راستہ بھی واضح و آشکار ہو جائے اور ہٹ دھرم گنہگاروں اور حق کے دشمنوں کی راہ بھی معلوم و روشن ہو جائے

﴿وَكَذَلِكَ نَفْصِلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ﴾^(۲) -

واضح ہے کہ اوپر والی آیت میں ”مجرم“ سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، کیوں کہ اس آیت میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب گنہگار ان کے پاس آئیں، خواہ انھوں نے نادانی کی بنا پر کتنے ہی غلط اعمال انجام دئے ہوں، انھیں قبول کر لیں، اس بنا پر یہاں مجرم سے مراد ہی ہٹ دھرم اور سخت قسم کے گنہگار ہیں جو جو کسی ذریعہ سے بھی حق کے سامنے سر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے ہوں، یعنی حق کی طرف اس عمومی اور ہمہ گیر دعوت کے بعد، یہاں تک کہ ان گنہگاروں کو دعوت دینے کے بعد کہ جو اپنے کام سے پشیمان ہیں، اب ہٹ دھرم اور ناقابل توجہ ہیں مجرموں کے طرز عمل کو مکمل طور پر واضح کیا جا رہا ہے۔

۱۔ تفسیر نمونہ جلد ۳، ص ۳۲۸ (اردو ترجمہ)۔

۲۔ حقیقت میں جملہ ”وَلْتَسْتَبِينَ“ عطف ہے ایک محذوف جملہ پر جو مقابلہ کے کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہے یعنی ”وَلْتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ“ تاکہ اطاعت کرنے والے مومنین کا راستہ اور گنہگاروں کا راستہ الگ الگ واضح اور روشن ہو جائے۔

آیات ۵۸، ۵۷، ۵۶

۵۶ ﴿قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلْ لَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذَا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ﴾۔

۵۷ ﴿قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ يَفْصِلُ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ

الْفَاصِلِينَ﴾۔

۵۸ ﴿قُلْ لَوْ أَنَّ عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَفُضِّي الْأَمْرَ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ﴾۔

ترجمہ:

۵۶۔ تم کہہ دو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو، کہہ دو کہ میں تمہاری ہوئی و ہوس کی پیروی نہیں کرتا، اگر میں ایسا کروں گا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔

۵۷۔ تم کہہ دو کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے (اور اسے قبول نہیں کیا) وہ چیز کہ جس کے بارے میں تمہیں زیادہ جلدی ہے وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے، حکم اور فرمان جاری کرنا صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ (حق کو باطل سے) بہترین (طریقہ پر) جدا کرنے والا ہے۔

۵۸۔ تم کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے بارے میں تمہیں جلدی میرے پاس ہوتی (اور میں تمہاری درخواست پر عمل کرتا تو عذاب الہی تم پر نازل ہو جاتا اور) میرا اور تمہارا کام انجام کو پہنچ جاتا اور خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔

ان آیات میں روئے سخن اسی طرح ہٹ دھرم مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے جیسا کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات اسی بحث کے گرد گھومتی ہے، ان آیات کا لب و لہجہ کچھ اس طرح کا ہے جیسا کہ انہوں نے پیغمبر کو دعوت دی تھی کہ پیغمبر ان کے دین کی طرف جھک جائیں لہذا پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ وہ انہیں صراحت کے ساتھ کہہ دے کہ: مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جن کی تم خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہو

﴿قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾^(۱)۔

لفظ ”نہیت“ (منوع قرار دیا گیا ہوں) جو فعل مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ بتوں کی پرستش کا ممنوع ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

اس کے بعد ”کہہ دو اے پیغمبر کہ میں تمہاری ہوئی و ہوس کی پیروی نہیں کرتا“ ﴿قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ﴾، اس جملے کے ذریعہ ان کا مطالبہ کا واضح جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بت پرستی کوئی منطقی دلیل نہیں رکھتی اور ہرگز عقل و خرد سے مطابقت نہیں رکھتی کیوں کہ عقل اچھی طرح سے سمجھتی ہے کہ انسان جماد سے اشرف ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان دوسری مخلوق کے سامنے یہاں تک کہ ایک پست تر مخلوق کے سامنے سر تعظیم جھکائے، اس کے علاوہ وہ زیادہ تر بت خود انسان کے گھڑے اور بنے ہوئے ہوتے تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ چیز کہ جو خود انسان کی مخلوق ہو اس کی معبود اور اس کی حلال مشکلات ہو جائے، اس بنا پر بت پرستی کا سرچشمہ اندھی تقلید، خرافات اور ہوا پرستی کی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں میں مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: اگر میں ایسا کام کروں تو یقیناً گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہ ہوں گا

﴿قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ﴾۔

بعد الی آیت میں انہیں ایک اور جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں، اگرچہ تم نے اسے قبول نہیں کیا اور اس کی تکذیب کی ہے ﴿قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهَا﴾۔ ”بینۃ“ اصل میں ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان اس طرح سے جدائی ڈال دے کہ ان میں کسی طرح سے دوبارہ اتصال اور باہمی تعلق نہ ہو سکے، اس کے بعد روشن اور واضح دلیل کو بھی کہا جانے لگا کیوں کہ وہ حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔

فقہی اصطلاح میں اگرچہ ”بینۃ“ دو عادل افراد کی گواہی کو کہا جاتا ہے لیکن اس کا لغوی معنی کا مل طور پر وسیع ہیں اور دو عادلوں کی گواہی اس کا ایک مصداق ہے، اور اگر معجزات کو ”بینۃ“ کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں، اور اگر آیات و احکام الہی کو ”بینۃ“ کہتے ہیں تو وہ بھی اس وسیع مفہوم کے ایک مصداق کے طور پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں بھی پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا سہارا لیں کہ خدا پرستی کی راہ میں اور بتوں سے جنگ میں میرا درک کامل طور سے روشن اور آشکار ہے اور تمہارا انکار اور تکذیب اس کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد ان کی بہانہ سازیوں میں سے ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو وہ عذاب کہ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اسے جلدی لے آؤ، پیغمبر ان کے جواب میں کہتے ہیں: وہ چیز کہ جس کے بارے میں تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے (مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ) تمام کام اور تمام احکام سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾۔

اور بعد میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہی ہے کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ حق کو باطل سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے ﴿يَقْضُ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ﴾۔

ظاہر ہے کہ حق کو باطل سے وہی اچھی طرح جدا کر سکتا ہے کہ جس کا علم سب سے زیادہ ہو اور اس کے لئے حق و باطل کی شناخت کامل طور سے روشن ہو، علاوہ ازیں وہ اپنے علم و دانش کو روبہ عمل لانے کے لئے کافی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ دونوں صفات (علم و قدرت) نامحدود اور بے پایاں طور پر صرف خداوند تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے، لہذا وہ حق کو باطل سے سب سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ اس ہٹ دھرم اور نادان گروہ کی جانب سے عذاب و سزا کے مطالبہ پر انہیں کہہ دو کہ وہ چیز جس کے جلدی ہو جانے کا مطالبہ تم اس سے کرتے ہو اگر وہ میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی اور میں تمہاری درخواست پر عمل کر دیتا تو میرا اور تمہارا کام ختم ہو گیا ہوتا

﴿قُلْ لَوْ أَنَّ عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَفُضِّى الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ﴾۔

لیکن اس غرض سے کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ان کی سزا کو بھلا دیا گیا ہے آخر میں قرآن کہتا ہے: خداوند تعالیٰ ستمگاریوں اور ظالموں کو سب سے بہتر طور پر پہچانتا ہے اور موقع پر انہیں سزا دے گا ﴿وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ﴾۔

۱۔ لفظ ”الذین“ کا استعمال جو ذوی العقول جمع مذکر کے لئے ہوتا ہے بتوں کے لئے اس بنا پر ہوا، کیوں کہ ان کی فکر کے درپے سے ان سے گفتگو کی جارہی ہے۔

۲۔ قاموس کہتا ہے: قص الشعر والظفر قطع منهما بالمقص ای المقراض ”بالوں اور ناخنوں کو مقارض یعنی قینچی سے کاٹنے کو عرب قص اور مقراض کو مقص (کسر میم) وفتح قاف کے ساتھ) کہتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے گزشتہ قویں اپنے انبیاء سے یہی درخواست کرتی رہی کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اس عذاب کو، جس کے ہمارے اوپر نازل ہونے کی توقع رکھتے ہو ہماری طرف کیوں نہیں بھیجتے۔

قوم نوح (علیہ السلام) نے بھی ان سے یہی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ اے نوح! تم ہم سے اتنی باتیں کیوں کرتے ہو اور ہم سے کیوں جھگڑتے ہو، اگر تم سچ کہتے ہو تو وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرا رہے ہو اسے جلدی سے لے آؤ۔

﴿قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَكُثِرَتْ جِدَالُنَا فَاَتَانَا بِمَا تَعَدُّنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (ہود ۳۲)

ایسا ہی تقاضا قوم صالح (علیہ السلام) نے بھی ان سے کیا تھا۔ (اعراف، ۷۷)۔

قوم عاد نے بھی اپنے پیغمبر ہود (علیہ السلام) سے ایسا ہی تقاضا کیا تھا (اعراف ۷۰)۔

سورہ بنی اسرائیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخواست پیغمبر سے بارہا کی گئی یہاں تک کہ انھوں نے یہ کہا کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے مگر اس وقت جب تم چند کاموں میں سے کوئی ایک انجام نہ دو ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم آسمانی پتھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر پھینکو ﴿اَوْ تَسْقُطُ السَّمٰوٰتُ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا مَعْشَرُ بَنِي اِسْرٰٓءِیْلَ﴾ (بنی اسرائیل ۹۲)۔

یہ نامعقول تقاضے یا تو استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوتے تھے۔ اور یا سچ مچ طلب اعجاز کے لئے اور دونوں صورتوں میں یہ احمقانہ فعل تھا کیوں کہ دوسری صورت میں ان کی نابودی کا سبب ہوتا لہذا معجزہ سے استفادہ کا محل ہی باقی نہ رہتا اور پہلی صورت میں بھی ان واضح دلائل اور نشانیوں کے ہوتے ہوئے کہ جو تمام پیغمبر اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جن سے ہر دیکھنے والے کی نگاہ میں کم از کم ان کی صداقت کا احتمال تو پیدا ہو جاتا تھا تو ایسے احتمال کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنی نابودی کا تقاضا کرے یا اس سے مذاق کرے، لیکن تعصب اور ہٹ دھرمی ایک ایسی عظیم بلا ہے کہ جو ہر قسم کی فکر و منطق کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ ”اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ“ کا جملہ ایک واضح معنی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کے فرامین و احکام کا وہ عالم آفرینش و تکوین سے متعلق ہوں یا وہ عالم احکام دین و تشریح سے تعلق رکھتے ہوں، سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں، اس بنا پر اگر کوئی پیغمبر ان کاموں میں سے کسی کام کو کر کے دیکھتا ہے تو وہ بھی اسی کے فرمان سے کرتا ہے۔

مثلاً اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مردہ کو زندہ کرتے ہیں تو بھی اسی کے اذن سے ہے اسی طرح ہر وہ منصب جو کسی کو سپرد ہوا ہے خواہ وہ رہبری الہی ہو یا قضاوت و حکمرانی، پروردگار کی طرف سے ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے واضح اور روشن جملہ سے پوری تاریخ میں بارہا غلط استفادہ کیا گیا ہے۔ کبھی خوارج نے جنگ صفین میں ”حکین“ کے تعین کے مسئلہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہ جو خود ان کے اور ان جیسے لوگوں کے تقاضے پر صورت پذیر ہوا تھا اس جملے کا سہارا لیا اور حضرت علی (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق وہ ایک کلمہ حق کو ایک باطل معنی میں استعمال کرتے رہے اور رفتہ رفتہ جملہ ”لا حکم الا للہ“ ان کا شعار ہو گیا۔

وہ اس قدر نادان و احمق تھے کہ خیال کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا کے فرمان اور دستور اسلام کے مطابق بھی کسی موضوع میں حکم مقرر ہو جائے تو وہ ”إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ“ کا مخالف ہے حالانکہ وہ قرآن کو زیادہ پڑھتے تھے لیکن اسے بہت کم سمجھتے تھے کیوں کہ قرآن تو اسلامی خاندانی جھگڑوں کے سلسلے میں بھی عورت اور مرد کی طرف سے حکم کے انتخاب کی تصریح کرتا ہے: ﴿فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا﴾ (۳۵)۔

کچھ دوسرے لوگوں نے۔ جیسا کہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اس جملے کو مسلک جبر کی ایک دلیل قرار دیا ہے، کیوں کہ جب ہم یہ قبول کر لیں کہ جہاں آفرینش کے تمام فرمان خدا کے ہاتھ میں ہیں تو پھر تو کوئی اختیار کسی کے لئے باقی ہی نہیں رہتا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بندوں کے ارادہ کی آزادی اور ان کا مختار ہونا بھی پروردگار کے فرمان سے ہے، یہ خدا ہی تو ہے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے کاموں میں مختار اور آزاد ہوں تاکہ ان کے مختار اور آزاد ہونے کی حالت میں ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالے اور ان کی تربیت ہو۔

۳۔ ”یقص“ لغت میں ”قطع کرنے“ اور ”کسی چیز کو توڑنے“ کے معنی میں آیا ہے،^(۲) اور یہ جو زیر نظر آیت میں ”یقص الحق“ (خدا حق کو توڑتا ہے) یعنی مکمل طور پر اسے باطل سے جدا اور الگ کر دیتا ہے، تو اس بنا پر بعد والا جملہ ”وہو خیر الفاصلین“ (وہ بہترین طور پر جدا کرنے والا ہے) اس امر کی تاکید شمار ہوگا اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہئے کہ ”یقص“ ”قصہ“ سے نہیں کہ جس کا معنی سرگزشت اور داستان بیان کرنا ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے

۱۔ لفظ ”الذین“ کا استعمال جو ذوی العقول جمع مذکر کے لئے ہوتا ہے بتوں کے لئے اس بنا پر ہوا، کیوں کہ ان کی فکر کے درجے سے ان سے گفتگو کی جارہی ہے۔

۲۔ قاموس کہتا ہے: قص الشعر والظفر قطع منھما بالمقص ای المقراض ”بالوں اور ناخنوں کو مقارض یعنی قینچی سے کاٹنے کو عرب قص اور مقراض کو مقص (کسر میم وفتح قاف کے ساتھ) کہتے ہیں۔

آیات ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲

۵۹ ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا فِي ظُلُمَاتٍ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾ -

۶۰ ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ -

۶۱ ﴿وَهُوَ الْغَايُ تُفُوقَ عِبَادِهِ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ﴾ -

۶۲ ﴿ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلُّ شَيْءٍ عِلْمَهُ﴾ -

ترجمہ:

۵۹- غیب کی چابیاں صرف اسی کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اسے نہیں جانتا اور خشکی اور دریا میں جو کچھ ہے وہ اسے جانتا ہے کوئی پتہ (کسی درخت سے) نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اس سے آگاہ ہے اور زمین کی پوشیدہ و تاریک جگہوں میں کوئی کوئی دانہ ہے اور نہ ہی کوئی خشک و تر چیز وجود رکھتی ہے مگر یہ کہ وہ واضح کتاب (کتاب علم خدا) میں ثبت ہے۔

۶۰- وہی وہ ذات ہے کہ جو تمہاری روح کو رات کے وقت (نیند میں) لے لےتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کسب کیا (اور انجام دیا) ہے اس سے باخبر ہے پھر وہ دن میں (نیند سے) تمہیں اٹھاتا ہے (اور یہ کیفیت ہمیشہ جاری رہتی ہے) یہاں تک کہ معین گھڑی آپہنچے، اس کے بعد تمہاری بازگشت اسی کی طرح ہوگی اور جو کچھ عمل تم کرتے ہو وہ اس کی تمہیں خبر دے گا۔

۶۱- وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے، اور تمہارے اوپر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی جان لے لیتے ہیں اور وہ (بندوں کے اعمال کے حساب کی نگہداری میں) کوتاہی نہیں کرتے۔

۶۲- اس کے بعد (تمام بندے) خدا کی طرف جو ان کا مولانا حقیقی ہے پلٹ جائیں گے، جان لو کہ حکم کرنا اسے کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ سب سے جلدی حساب کرنے والا ہے۔

اسرار غیب

گذشتہ آیات میں گفتگو خدا کے علم و قدرت اور اس کے حکم و فرماں کے دائرے کی وسعت کے بارے میں تھی اب ان آیات میں اس بیان کی گذشتہ آیات میں اجمالاً ذکر ہوا تھا وضاحت کی کی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے علم خدا کے موضوع کو لیتے ہوئے کہتا ہے:

”غیب کے خزانے (یا غیب کی چابیاں) سب کی سب خدا کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی انھیں نہیں جانتا ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾۔“

”مفتاح“ جمع ”مفتاح“ (بروزن بہتر) چابی کے معنی میں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمع ”مفتاح“ (بروزن دفتر) خزانہ اور کسی چیز کی حفاظت کے مرکز کے معنی میں ہو۔

پہلی صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ تمام غیب کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ غیب کے تمام خزانے اسے کے قبضے میں ہیں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ دونوں ہی معانی ایک عبارت میں مراد ہوں اور جیسا کہ ہم علم اصول میں ثابت کر چکے ہیں کہ ایک لفظ کا استعمال چند معانی میں کوئی مانع نہیں رکھتا اور دونوں صورتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، کیوں کہ جہاں کہیں خزانہ ہے وہاں چابی بھی موجود ہے۔

لیکن زیادہ تر یہی نظر میں آتا ہے کہ ”مفتاح“ چابیوں کے معنی میں ہے نہ کہ خزانے کے معنی میں، کیوں کہ مقصد و ہدف یہاں علم خدا کو بیان کرنا ہے اور وہ چابی کے مسئلہ کے ساتھ۔ جو مختلف ذخائر سے آگاہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ دو اور مواقع پر جہاں قرآن میں لفظ ”مفتاح“ استعمال ہوا ہے، وہاں بھی چابی ہی مراد ہے ^(۱)۔

اس کے بعد مزید توضیح و تاکید کے لئے کہتا ہے: جو کچھ بروبحر میں ہے خدا اسے جانتا ہے ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾۔

”بر“ وسیع مکان کے معنی میں ہے اور عام طور پر خشک علاقوں کو ”بر“ کہا جاتا ہے اور ”بحر“ بھی اصل میں وسیع جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں زیادہ پانی جمع ہو اور عام طور پر یہ لفظ سمندروں پر اور کبھی بڑے بڑے دریاؤں پر بھی بولا جاتا ہے۔

بہر حال خدا ان کی ان چیزوں سے آگاہی کہ جو خشکیوں اور سمندروں میں ہے اس کے علم کے تمام چیزوں پر احاطے کے معنی میں ہے اور اس جملہ کے معنی کی وسعت کی طرف توجہ سے (جو کچھ خشکیوں اور سمندروں میں ہے خدا اسے جانتا ہے) حقیقت میں اس کے وسیع علم کا ایک گوشہ واضح ہوتا ہے۔

یعنی وہ سمندروں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے اربوں زندہ موجودات کی جنبش سے ۔

اور تمام جنگلوں اور پہاڑوں میں درختوں کے پتوں کے ہلنے سے ۔

اور ہر غنچے کے چٹخنے اور ہر پھول کے کھلنے کی قطعی تاریخ سے ۔

اور بیابانوں میں نسیم کی موجوں کے چلنے اور دروں کی خمیدگی سے ۔

اور ہر انسان کے بدن کی رگوں کی صحیح گنتی اور خون کے گلوبولز (GLOBULES) سے ۔

اور ایٹم کے اندر تمام الیکٹرانوں (ELECTROLS) کی مخفی حرکتوں سے ۔

اور آخر یہ کہ تمام افکار و تخیلات جو ہمارے دماغوں کے اندر سے گزرتے ہیں ۔

اور ہماری روح کی گہرائیوں ۔۔۔۔۔ ہاں ہاں وہ ان سب سے یکساں طور پر باخبر ہے ۔

پھر بعد والے جملے میں خدا کے علمی احاطہ تاکید کے لئے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

گیا ہے: کوئی پتہ درخت سے جدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے (وَمَا تَشْهَدُ مِنْ ذَرْبٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا) ۔

یعنی ان پتوں کے تعداد اور شاخوں سے ان کے جدا ہونے کا وقت، ہوا کے درمیان ان کی گردش، اور ان کے زمین

پر آگرنے کا لمحہ ۔ یہ سب امور اس کے علم کے سامنے واضح اور روشن ہے اسی طرح کوئی دانہ زمین کی کسی پوشیدہ جگہ

میں نہیں ٹھہرتا مگر یہ کہ وہ اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے

﴿وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ﴾ ۔

در حقیقت (اس آیت میں) دو حساس نقطوں پر انگشت رکھی گئی ہے، کہ جن کا احاطہ کرنا کسی بھی انسان کے لئے

ممکن نہیں ہے، خواہ ہزاروں سال اس کی عمر کے گزر جائیں اور خواہ وہ کتنی بھی صنعتی مہارت اور حیرت انگیز ارتقائی

منزلیں کیوں نہ طے کر لے ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہوائیں ہر شب و روز میں تمام کرہ زمین پر کتنی قسم کے

گھاس پھوس کے بیج ان کے پودوں سے جدا کر کے کہاں کہاں بکھر رہی ہے، ایسے ایسے بیج جو بعض اوقات ممکن ہے کہ

ساہا سال تک زمین کی گہرائیوں میں اس وقت تک چھپے ہوئے پڑے رہیں جب کہ ان کی نشوونما کے لئے کافی مقدار میں

پانی حاصل نہ ہو جائے ۔

ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہر لمحے کیڑے مکوڑوں کے ذریعے یا انسانوں کے وسیلہ سے، کتنے دانے اور کس

کس قسم کے بیج، اور زمین کے کن کن نقاط میں، بکھیرے جا رہے ہیں ۔

کو نسا برقی دماغ ہے وہ جو جنگلوں کے درختوں کی شاخوں سے ہر روز جھڑنے والے پتوں کی تعداد کا شمار کر سکے کسی ایک جنگل کے منظر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے، خاص طور پر موسم خزاں میں اور خصوصاً مسلسل بارش یا تیز ہوا کے بعد، اور اس عجیب و غریب منظر کو دیکھتے ہوئے کہ جو پتوں کے پے درپے گرنے سے پیدا ہوتا ہے، یہ حقیقت اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ بات ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے علوم تک انسان کی دسترس ہو سکے۔

حقیقتاً پتوں کا گرنا ان کی موت کا وقت ہے اور تائیک زمینوں میں دانوں کا گرنا، ان کی حیات و زندگی کی طرف پہلا قدم ہے اور صرف اسی کی ذات ہے کہ جو اس موت و زندگی کے نظام سے خبر ہے، یہاں تک کہ ایک دانہ اپنی کامل زندگی اور پھوٹنے کی طرف جو مختلف قدم اٹھاتا ہے، وہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کے علم کی بارگاہ میں واضح و آشکار ہے۔

اس امر کے بیان کا ایک اثر فلسفی ہے اور اثر تربیتی، اس کا فلسفی اثر تو یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے خیال کی کہ جو خدا کے علم کو کلیات میں منحصر سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اس جہان کے جزئیات سے آگاہ نہیں ہے، نفی کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا تمام کلیات و جزئیات سے مکمل آگاہی رکھتا ہے (۲)۔

باقی رہا اس کا تربیتی اثر تو وہ واضح ہے، کیوں کہ اس وسیع و بے پایاں علم پر ایمان رکھنا انسان سے یہ کہتا ہے کہ تیرے وجود کے تمام اسرار، اعمال، گفتار، نیات، اور افکار سب کے سب اس کی ذات پاک کے لئے واضح و آشکار ہے، اس قسم کے ایمان کے ساتھ کس طرح ممکن ہے کہ انسان اپنے حالات پر نگاہ نہ رکھے اور اپنے اعمال، گفتار اور نیات پر کنٹرول نہ کرے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کوئی خشک و تر نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں ثبت ہے ﴿وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾۔

یہ جملہ ایک مختصر سی عبادت کے ساتھ تمام موجودات کے لئے خدا کے غیر متناہی علم کی وسعت کو بیان کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی کیوں کہ ”تھر“ اور ”خشک“ سے مراد ان کا لغوی معنی نہیں ہے بلکہ یہ تعبیر معمولاً عمومیت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

کتاب مبین کے بارے میں مفسرین نے مختلف احتمال پیش کئے ہیں لیکن ان میں جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب مبین سے مراد وہی مقام علم پروردگار ہے یعنی تمام موجودات اس کے بے پایاں علم میں ثبت ہے اور

اس کی لوح محفوظ سے تعبیر کرنا بھی اسی معنی کے مطابق قرار دینے کے قابل ہے کیوں کہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ لوح محفوظ سے مراد وہی صفحہ علم خدا ہو۔

کتاب مبین کے معنی میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ علم خلقت اور سلسلہ علت و معلول ہو کہ جو تمام چیزیں اس میں لکھ دی گئی ہیں۔

بہت سی روایات میں ہیں جو اہلبیت علیہم السلام کے طرق سے پہنچی ہیں ان میں ”ورقہ“ سقط شدہ جنین کے معنی میں، ”جہ“ فرزند کے معنی میں ”ظلمات الارض“ ماؤں کے رحم کے معنی میں اور ”رطب“ ان نطفوں کے معنی میں جو زندہ رہتے ہیں اور ”یابس“ ان کے معنی میں جو ختم ہو جاتے ہیں تفسیر ہوئی ہے (۳)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تفسیر ان الفاظ کے لغوی معنی جمود کی صورت میں تو تطبیق نہیں کرتی کیوں کہ ”ورقہ“ کا معنی ہے پتہ ”جہ“ کا معنی ہے دانہ اور ”ظلمات الارض“ کا معنی ہے زمین کی تاریکیاں اور ”رطب“ کا معنی تر اور ”یابس“ کا معنی ہے خشک، لیکن ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے حقیقت میں اس تفسیر سے مسلمانوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے کہ انھیں آیات قرآن میں ایک وسیع اور کشادہ نگاہ کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور ان کے معانی سمجھنے میں صرف لفظ پر جمود نہ کریں بلکہ جہاں قرائن معنی کی وسعت پر دلالت کرتے ہوں تو وسعت معنی کی طرف نگاہ رکھیں۔

اوپر والی روایت میں حقیقت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم صرف گھاس پھوس کے دانوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ انسانی نطفوں کے بیج تک اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

بعد والی آیت میں اعمال انسانی پر علم خدا کے احاطہ کی بحث کی گئی ہے کہ جو اس کا ہدف اصلی ہے اور خدا کی قدرت قاہرہ کو بھی مشخص کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس مجموعی بحث سے ضروری تربیتی نتائج حاصل کر سکیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمھاری روح کو رات کے وقت قبض کر لیتی ہے اور جو کچھ تم دن میں انجام دیتے ہو اور کمائی کرتے ہیں اس سے آگاہ ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ﴾۔

”توفی“ لغت میں واپس لے لینے کے معنی میں ہے اور اور یہ جو نیند کو ایک طرح سے روح کو واپس لے لینا کہا گیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ نیند۔ جیسا کہ معروف ہے۔ موت کی بہن ہے، موت انسانی دماغ کے کارخانہ کا مکمل طور سے معطل ہو جانا ہے اور روح و جسم کے تعلق کا مطلقا منقطع ہو جانا ہے، جب کہ نیند صرف دماغی کارخانہ کے ایک حصہ کا تعطل ہے اور اس تعلق کا ضعیف ہو جانا اس بنا پر نیند موت کا ایک چھوٹا مرحلہ شمار ہوتی ہے (۴)۔

”جر حتم“ ”جر حرح“ کے مادہ سے ہے یہاں اکتساب اور کسی چیز کا حاصل کرنے معنی میں ہے یعنی تم رات دن خدا کے علم قدرت کے سائے میں رہتے ہو، وہ ذات کہ جو مٹی کے اندر نباتات کے دانوں کی پرورش اور ہر زمان و مکان میں پتوں کے گرنے اور ان کی موت سے آگاہ ہے، وہ تمہارے اعمال سے بھی آگاہ ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ نیند اور بیداری کا نظام بار بار دہرایا جا رہا ہے رات کو تم سو جاتے ہو اور دن تمہیں بیدار کر دیتا ہے، اور یہ حالت اسی طرح سے جاری رہتی ہے یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات آجاتے ہیں ﴿ثُمَّ يَبْعَثُكُم فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (۵)۔

بلا آخر بحث کے آخری نتیجہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: پھر سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے، اور وہ تمہیں اس سے جو تم انجام دے چکے ہو آگاہ کرے گا

﴿ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

(بعد والی آیت میں دوبارہ بندوں کے اعمال کی نسبت خدا کے علمی احاطے کی مزید وضاحت اور قیامت کے دن ان کے حساب کی انتہائی دقیق نگہداشت کے بارے میں قرآن کہتا ہے: وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے اور وہی ہے جو تمہارے لئے محافظ و نگہبان بھیجتا ہے تاکہ وہ تمہارے اعمال کا حساب انتہائی احتیاط کے ساتھ محفوظ کریں ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ”قاہریت“ کسی چیز پر ایسے غلبہ اور تسلط کامل کے معنی میں ہے کہ جس میں مد مقابل میں ٹھہرنے کی طاقت و سکت ہی نہ ہو اور بعض کے نظریہ کے مطابق یہ لفظ عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جس میں مد مقابل عقل رکھتا ہو جب کہ لفظ غلبہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی خصوصیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کا معنی کامل طور سے وسیع ہے۔

”حفظہ“ ”حافظ“ کی جمع ہے اور یہاں ان فرشتوں کے معنی میں ہے کہ جو انسانوں کے اعمال کی حفاظت پر مامور ہیں جیسا کہ سورہ انفطار کی آیہ ۱۰ تا ۱۲ میں ہے: ﴿إِن عَلَيْكُمْ لِحَافِظِينَ كَرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾

تمہارے اوپر نگہبانی کرنے والے محافظ (فرشتے) متعین کر دئے گئے ہیں دو محترم و مکرم لکھنے والے ہیں جو تمہارے ہر کام سے آگاہ ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ وہ اعمال انسانی کے محافظ نہیں ہیں بلکہ ان کی ڈیوٹی خود انسان کی اجل معین تک حوادث بلایا سے حفاظت کرنا ہے اور وہ ”حتی اذا جاء احدکم الموت“ کو کہ جو ”حفظۃ“ کے بعد ذکر ہوا ہے اس کا قرینہ سمجھتے ہیں اور سورہ رعد کی آیہ ۱۱ کو بھی ممکن ہے اس بات پر شاہد قرار دیں (۴)۔

لیکن پوری زیر بحث آیت پر غور فکر کرنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی کہ ”حفظۃ“ سے مراد یہاں وہی حفظ اعمال ہیں، باقی رہے وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں ان کے بارے میں انشاء اللہ سورہ رعد کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس حساب کی نگہداری زندگی کے ختم ہونے کے آخری لمحے اور موت کے آجانے تک جاری ہے ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾۔

اس وقت ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) جو قبض ارواح پر مامور ہیں اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں ﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾۔ (۷) آخر میں مزید کہتا ہے کہ یہ فرشتے کسی طرح بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی، قصور اور تفریط نہیں کرتے نہ روح کے لینے کے لمحہ کو مقدم کرتے ہیں اور نہ موزر ﴿وَهُمْ لَا يَفْرِطُونَ﴾ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ صفت انسانوں کے اعمال کے حساب کی حفاظت کرنے والے فرشتوں سے مربوط ہو کہ وہ اعمال کے حساب کی نگرانی و حفاظت میں کم سے کم کوتاہی اور قصور نہیں کرتے اور زیر بحث آیت میں گفتگو کا مدار بھی اسی حصہ پر ہے۔

بعد والی آیت میں انسان کے آخری مرحلہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: افراد بشر اپنے دوران زندگی کو ختم کرنے کے بعد اپنے ان اعمال ناموں کے ساتھ کہ جن میں پوری تنظیم کے ساتھ سب کچھ ثبت و ضبط ہوگا قیامت کے دن اپنے اس پروردگار کی طرف جو ان کا حقیقی مولا ہے پلٹ جائیں گے

﴿ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ﴾۔

اور اس کی عدالت میں انصاف کرنا، حکم دینا اور فیصلہ کرنا خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے ﴿أَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾، اور افراد بشر اپنی پر شور طولانی تاریخ میں جو جو عمل کرتے رہے اور ان کے جو اعمال نامے تھے ان کا بڑی تیزی کے ساتھ حساب کرے گا ﴿وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ﴾۔

یہاں تک کہ بعض روایات میں ہے کہ: انہ سبحانہ یحاسب جمیع عبادہ مقدار حلب شاة

خداوند تعالیٰ اپنے تمام بندوں کا حساب اتنے تھوڑے سے وقت میں لے لے گا جتنے وقت میں ایک بکری کا دودھ دوبا جاتا ہے۔ (۸)

جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں بندوں کا حساب اتنی تیزی کے ساتھ لیا جائے گا کہ لمحہ بھر میں ان سب کا تمام حساب کر لیا جائے گا اور ایک بکری کے دودھ دوہنے کے وقت کا بیان اور اوپر والی روایت کم سے کم وقت کی نشادہی کے لئے ہے اور اسی ایک دوسری روایت میں ہے

ان الله تعالى يحاسب الخلائق كلهم في مقدار لمح البصر۔ (۹)

خداوند تعالیٰ تمام بندوں کا حساب ایک لمحہ میں کرے گا۔

اور اس کی دلیل وہی ہے جو اوپر والی آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اعمال خواہ اس کے وجود میں اور اس کے اطراف کے موجودات میں اپنا اثر چھوڑتے ہیں، یعنی وہ بالکل ان مشینوں کی طرح ہیں کہ جو اپنی حرکت کی مقدار اور اپنی کارکردگی کو نمبروں والے آلات میں ظاہر کر دیتے ہیں زیادہ واضح الفاظ میں (یوں کہا جاسکتا ہے) اگر ایسے دقیق آلات موجود ہوں تو انسان کی آنکھ ایسی خیانت آمیز نظروں کی تعداد کو جو اس نے کی، پڑھا جاسکتا ہے اور انسان کی زبان پر آئے ہوئے جھوٹ، تہمتوں، زبان کے زخموں اور غلط باتوں کی تعداد کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، خلاصہ یہ کہ انسان کی روح کے علاوہ اس کے بدن کا ہر عضو خود اپنے اندر اعداد و شمار بتلانے والے اور حساب و کتاب ظاہر کرنے والے آلات رکھتا ہے کہ ایک ہی لمحہ میں اس کا سارا حساب و کتاب معلوم ہو جائے گا۔

اب اگر ہم کچھ روایات میں یہ پڑھتے ہیں کہ زیادہ فرائض رکھنے والے اور بہت زیادہ مال و دولت کے مالک افراد کا حساب اس دن بہت طولانی ہوگا تو وہ حقیقت میں اس بنا پر نہیں ہے کہ ان کے اصل حساب تک رسائی نہیں ہوئی ہے، بلکہ وہ اس بنا پر ہے کہ ان کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ان سوالات کا جو ان کے اعمال کی نسبت ہوں گے جواب دیں، یعنی جوابدہی کے بوجھ کی سنگینی اور جواب دینے کا لازمی و ضروری ہونا اور اتمام حجت ان کی پیشی کے وقت کو طولانی کر دے گا۔

یہ آیات بندگان خدا کے لئے مکمل تربیتی درس ہے، خدا کا اس جہان کے کئے کئے چھوٹے چھوٹے ذرات سے آگاہ ہونا تمام چیزوں پر اس کا احاطہ علمی، بندوں کی نسبت اس کی قدرت قہاریت اس کا تمام اعمال بشر سے مطلع ہونا، باریک بین

لکھنے والوں کے ذریعہ حساب اعمال کی نگہداری و حفاظت، وقت مقرر پر اس کی جان کا لینا، قیامت کے دن اس کا اٹھایا جانا اور پھر اس انسان کے تمام کاموں کی دقت نظر اور سرعت کے ساتھ جانچ پڑتال۔
 کون ہے کہ جو ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اپنے اعمال پر نظر نہ رکھے؟ بے حساب ظلم ستم کرے، بلا وجہ جھوٹ بولے اور دوسرے پر زیادتی کرے، کیا یہ اعمال مذکورہ اصول پر ایمان، اعتقاد اور توجہ کے ساتھ کبھی جمع ہو سکتے ہیں؟۔

۱۔ ما ان مفاتحه لتنوء بالعصبة اولی القوة۔ (قصص ۷۶)، اوما ملکتکم مفاتحه (نور ۶۱)

۲۔ مزید وضاحت کے لئے کتاب ”خدا را چگونہ بشاسیم“ کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ تفسیر بہان جلد اول صفحہ ۵۲۸۔

۴۔ تفسیر نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۳۴۱ پر بھی اس سلسلہ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

۵۔ فیحا کی ضمیر ”نہار“ کی طرف لوٹی ہے اور ”بعث“ بھی یہاں نیند سے اٹھنے اور بیدار ہونے کے معنی میں ہے اور ”اجل مسی“ سے مراد وہ عمر ہے جو کسی شخص کے لئے مقرر ہے۔

۶۔ تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۱۳۴۔

۷۔ قبض ارواح اور آدمی کی جان کے لینے کے بارے میں تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد صفحہ ۸۳ کی طرف رجوع کریں۔

۸۔ مجمع البیان، جلد ۳ صفحہ ۳۱۳۔

۹۔ تفسیر مجمع البیان، جلد ۱ و جلد ۲، صفحہ ۲۹۸۔

آیات ۶۳، ۶۴

۶۳ ﴿قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَعَلَّ أَنْجَانًا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ﴾ -

۶۴ ﴿قُلْ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْكُرُونَ﴾ -

ترجمہ:

۶۳ - کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ جو تمہیں خشکی اور سمندروں کی تاریکیوں سے رہائی بخشتا ہے جب کہ تم اسے آشکار اور پوشیدہ طور پر (دل ہی دل میں) پکارتے ہو (اور کہتے ہو) اگر تو نے ہمیں ان (خطرات اور تاریکیوں) سے رہائی بخش دی، تو ہم شکرگزاروں میں سے ہو جائیں گے۔

۶۴ - کہہ دو کہ خدا تمہیں ان چیزوں سے اور ہر مشکل و پریشانی سے نجات بخشتا ہے پھر بھی تم اس کے لئے شریک قرار دیتے ہو (اور کفر کی راہ پر چلتے ہو)

تفسیر وہ نور جو تاریکی میں چمکتا ہے

دوبارہ قرآن مشرکین کا ہاتھ پکڑ کر ان کی فطرت کے اندر لے جاتا ہے، اور اس اسرار آمیز نہاں خانہ میں انہیں توحید کے نور اور یکتا پرستی کی نشاندہی کراتا ہے اور پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ انہیں اس طرح کہیں: کون ہے وہ کہ جو تمہیں بر و بحر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے

﴿قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ -

اس بات کی یاد دہانی کر ادینا بھی ضروری ہے کہ ظلمت و تاریکی کبھی تو جنبہ حسی رکھتی ہے اور کبھی جنبہ معنوی، ظلمت حسی یہ ہے کہ نور کلی طور پر منقطع ہو جائے یا اس قدر کمزور ہو جائے کہ انسان کسی جگہ کو نہ دیکھ سکے یا مشکل سے دیکھ سکے اور ظلمت معنوی مشکلات، مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں کہ جن کا انجام تاریک و نامعلوم ہے، جہالت تاریکی ہے، اجتماعی و اقتصادی ہرج مرج اور فکری بے سروسایا بنائیاں، انحراف اور اخلاقی آلودگیاں کہ جن کے برے انجام پیش بینی کے قابل نہیں ہیں یا وہ چیز کہ جو بد بختی اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو، یہ سب کی سب ظلمت ہیں۔

ظلمت و تاریکی اپنی ذات سے ہولناک اور توہم انگیز ہیں کیوں کہ بہت سے خطرناک جانوروں، چوروں اور مجرموں کا حملہ رات کی تاریکی میں ہی ہوتا ہے اور ہر شخص کو اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش رہتا ہے، لہذا تاریکی میں پھنس

جانے کی صورت میں اوہام و خیالات انسان کی جان لے لیتے ہیں، خیالات کے مختلف زاویوں سے مختلف صورتیں اور وحشتناک شکلیں نکل نکل کر بھاگنے لگتی ہیں اور عام افراد کو خوف و ہراس میں پھنسا دیتی ہیں۔

ظلمت و تاریکی عدم کا شعبہ ہے اور انسان ذاتی طور پر عدم سے بھاگتا ہے اور وحشت رکھتا ہے، اسی سبب سے وہ عام طور سے تاریکی سے ڈرتا ہے۔

اگر یہ تاریکی واقعی وحشتناک حوادث سے مل جائے، مثلاً انسان ایک ایس سمندری سفر میں پھنس جائے جس میں اندھیری رات، موجوں کا خوف ہو اور طوفان آیا ہوا ہو، تو اس کی وحشت و پریشانی ان مشکلات سے کئی درجے زیادہ ہوگی جو دن کے وقت ظاہر ہوں، کیوں کہ عام طور سے ایسے حالات میں انسان کے لئے چھٹکارے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح اگر اندھیری رات میں کسی جنگل بیابان میں انسان راستہ بھول جائے اور درندوں کی وحشتناک آوازیں، جو رات کے وقت اپنے شکار کی تلاش میں ہوتے ہیں دور اور نزدیک سے سنائی دے رہی ہوں، یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جس میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور خود اپنے اور اس تابناک نور کے سوا جو اس کی روح کی گہرائی میں چمکتا ہے اور اسے ایک مبدا کی طرف بلاتا ہے کہ صرف وہی ہے کہ جو اس قسم کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے، باقی اسے کچھ یاد نہیں رہتا اس قسم کے حالات جہان توحید و خدا شناسائی کا دریچہ ہے، اسی لئے بعد کے جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اس قسم کی حالت میں تم اس کے لامتناہی لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہو، بعض اوقات آشکار خضوع و خشوع کے ساتھ اور کبھی پوشیدہ طریقے سے دل ہی دل کے اندر اسے پکارتے ہو ﴿تَدْعُوْنَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾۔

اور ایسی حالت میں تم فوراً اس عظیم مبدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہو کہ اگر ہم اس خطرے سے نجات دے دے تو ہم یقیناً اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور اس کے سوا کسی اور سے دل نہیں لگائیں گے ﴿لَعَلَّ اَنْجَانًا مِنْ هٰذِهِ لَنْكُوْنَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ﴾

لیکن اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ خدا تمہیں ان تاریکیوں سے اور ہر قسم کے دوسرے غم و اندوہ سے نجات دے تا ہے (اور بارہا تمہیں نجات دی ہے) لیکن تم رہائی پانے کے بعد اسی شرک و کفر کے راستے پر چل پڑتے ہو ﴿قُلْ اللّٰهُ يَنْجِيْكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ”تضرع“ کا ذکر جو دعائے آشکار کے معنی میں ہے اور ”خفیہ“ کا تذکرہ جو کہ پنہانی دعا ہے شاید اس سبب سے ہو کہ مشکلات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، بعض اوقات شدت کے مرحلہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے انسان کو پنہانی دعا کی دعوت دیتی ہے اور بعض اوقات وہ شدید مرحلہ تک پہنچ جاتی ہے تو علی الاعلان دست دعا بلند کرتا ہے اور بعض اوقات نالہ و فریاد کی نوبت آ جاتی ہے، مقصد یہ ہے کہ خدا تمھاری شدید مشکلات کو بھی حل کرتا ہے اور ضعیف مشکلات کو بھی۔

۲۔ بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی چار نفسیاتی حالتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جن میں سے ہر ایک مشکلات کے ظہور کے وقت ایک قسم کا عکس العمل ہے حالت دعا و نیاز، حالت تضرع و خضوع، حالت اخلاص اور مشکلات سے نجات حاصل ہوتے وقت شکر گزاری کے التزام کی حالت۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان افراد میں سے بہت سوں کے لئے قیمتی حالات بجلی کی طرح جلدی سے گزر جانے والے اور شدائد و مشکلات کے مقابلے میں تقریباً اضطراری شکل میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن چوں کہ ان میں علم و آگاہی نہیں ہوتی لہذا شدائد و مشکلات کے برطرف ہوتے ہی خاموشی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر یہ حالات اگرچہ زود گزر ہی ہوں پھر بھی دور افتادہ افراد کے لئے خدا شناسی کے سلسلے میں دلیل بن سکتے ہیں۔

۳۔ ”کرب“ (بروزن صرب) در اصل زمین کو نیچے اوپر کرنے اور کھودنے کے معنی میں ہے، نیز وہ محکم گرہ جو کنویں کے ڈول کی طناب میں لگائی جاتی ہے، کے معنی میں بھی آتا ہے، اس کے بعد وہ غم و اندوہ جو انسان کے دل کو زیر و زبر کرتے ہیں اور جو گرہ کی طرح انسان کے دل پر بیٹھ جاتے ہیں کے لئے بھی بولا جانے لگا۔

اس بنا پر اوپر والی آیت میں لفظ ”کرب“ جو ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کی بڑی سے بڑی مشکلات پر محیط ہے یہ ”بر و بحر کی تاریکیوں“ کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو شدائد کے ایک خاص حصہ کا کہا جاتا ہے، ایک خاص مفہوم بیان کرنے کے بعد ایک عام مفہوم کے طور پر آیا ہے (غور کیجئے گا)۔

یہاں پر وہ حدیث بیان کرنا کہ جو اس آیت کے ذیل میں بعض اسلامی تفاسیر میں نقل ہوئی ہے نامناسب نہ ہوگا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: خیر الدعاء الخفی وخیر الرزق ما یکفی

بہترین دعا وہ ہے کہ جو پنہانی (اور انتہائی خلوص کے ساتھ) صورت پذیر ہو اور بہترین روزی وہ ہے کہ جو بقدر کفایت ہو (نہ کہ اسی ثروت اندوزی کہ جو دوسروں کی محرومیت کا سبب بنے اور انسان کے کندھے پر ایک سنگین بوجھ ہو)۔

اور اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

مر بقوم رفعوا اصواتهم بالدعا فقال انکم لاتدعون الا صم ولا غائباً وانما تدعون سمیعاً قریباً۔^(۱)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گروہ کے قریب سے گزرے وہ لوگ بلند آواز سے دعا کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: تم کسی بہرے کو تو نہیں پکار رہے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو پکار رہے ہو کہ جو تم سے پوشیدہ اور دور ہو بلکہ تم تو ایک ایسی ہستی کو پکار رہے ہو کہ جو سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دعا آہستہ آہستہ اور توجہ اور اخلاص کے ساتھ کی جائے تو بہتر ہے۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان ونور الثقلین مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔

آیت ۶۵

۶۵ ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِّنْ تَحْتَ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ﴾۔

ترجمہ:

۶۵۔ تم کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اوپر کی طرف سے تم پر نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے کی طرف سے بھیج دے، یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں ایک دوسرے کے سامنے بھڑا دے اور جنگ (وناراحتی) کا ذائقہ تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعے چکھا دے، دیکھو ہم طرح طرح کی آیات کو کس طرح ان کے لئے واضح کرتے ہیں شاید وہ سمجھ لیں (اور پلٹ آئیں)۔

رنگ رنگ کے عذاب

گذشتہ آیات میں توحید فطری کے بیان کے ضمن میں درحقیقت بندوں کے ساتھ ایک قسم کی تشویق اور اظہار محبت ہوا تھا کہ خداوند تعالیٰ شدائد و مشکلات کے وقت انہیں کس طرح اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور ان کی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔

اس آیت میں تربیت کے مختلف طرق کی تکمیل کے لئے خدائی عذاب اور سزا سے ڈرانے کے مسئلہ کا سہارا لیا گیا ہے یعنی جس طرح کہ خدا الرحمن الرحیم اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دینے والا ہے، اسی طرح طغیانگروں اور سرکشوں کے مقابلے میں قہار و منتقم بھی ہے، اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ مجرموں کو تین قسم کی سزاؤں کی دھمکی دو، اوپر کی طرف کے عذابوں کی، نیچے کے طرف کے عذابوں کی اور باہمی اختلاف کے ذریعے جنگ کی آگ کے بھڑک اٹھنے اور خونریزی کی سزائیں، لہذا فرمایا گیا کہ: کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اوپر کی طرف سے تم پر نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے بھیج دے ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِّنْ تَحْتَ أَرْجُلِكُمْ﴾۔

یا تمہیں مختلف گروہ کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑا دے اور جنگ و خونریزی کا ذائقہ تم سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعے چکھا دے ﴿أَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيْعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾۔

اور آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: دیکھو! ہم طرح طرح کی نشانیوں اور دلائل کو کس طرح ان کے لئے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں اور حق کی طرف لوٹ آئیں ﴿انْظُرْ كَيْفَ نُنْصِرُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ﴾ -

چند اہم نکات

۱۔ اس بارے میں کہ ”اوپر“ کی طرف سے ”عذاب“ اور ”نیچے“ کی طرف عذاب سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ (فوق و تحت) بہت ہی وسیع معنی رکھتے ہیں، ان میں حسی طور پر اوپر اور نیچے کا مفہوم بھی شام ہے یعنی ایسی سزائیں جو اوپر کی طرف سے آتی ہیں، مثلاً بجلیاں، خطرناک بارشیں اور طوفان اور ایسی سزائیں جو نیچے کی طرف سے آتی ہیں مثلاً زلزلے اور زین کو ویران و برباد کرنے والے شگاف اور دریاؤں اور سمندروں کے طوفان، سب اس میں داخل ہیں۔

وہ دردناک عذاب بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں کہ جو حکام کے طبقہ اور معاشرے کے اوپر والے حصے کی طرف سے بعض قوموں کے سروں پر آتے ہیں اور وہ پریشانیاں اور سختیاں جو مزدوروں اور نا فہم اور فرض ناشناس افراد کی طرف سے لوگوں کو دامنگیر ہو جاتی ہیں جو بعض اوقات پہلے گروہ کے عذاب سے کم تر نہیں ہوتی، سبھی اس کے معنی میں داخل ہیں۔

اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے زمانے کے خوفناک جنگی ہتھیار کہ جو فضا اور زمین سے وحشتناک صورت میں انسانی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں اور تھوڑی سی دیر میں آباد ترین شہروں کو ہوائی بمباری اور زمینی حملوں سے، میزائیلوں اور آبدوزوں سے خاکستری ٹیلوں میں بدل جاتے ہیں وہ بھی آیت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

۲۔ ”لبسکم“ ”لبس“ (بروزن جس) مٹھ بھیڑ کمرانے اور ایک دوسرے سے ٹکرائے کے معنی میں ہے نہ کہ مادہ ”لبس“ (بروزن قرض) لباس پہننے کے معنی میں، اس بنا پر جملہ کے معنی یوں ہوگا کہ وہ تمہیں مختلف گروہ اور دستوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی سکتا ہے۔^(۱)

اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی کہ اختلاف کلمہ (تفرقہ بازی یا پھوٹ) اور جمعیت کی پرگندگی کا مسئلہ اس قدر خطرناک ہے کہ وہ آسمانی عذاب اور بجلیوں اور زلزلوں کا ہم پلہ اور ہم پایہ قرار پایا ہے، حقیقتاً ہے بھی ایسا ہی بلکہ بعض اوقات اختلاف و پرگندگی سے پیدا ہونے والی ویرانیاں ان ویرانیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتی ہے جو بجلیوں اور

زلزلوں سے آتی ہے، بارہا دیکھا گیا ہے کہ آباد ملک نفاق اور تفرقہ بازی کے منحوس سائے متعلق تباہی کی نظر ہو جاتے ہیں اور یہ جملہ تمام مسلمانان عالم کے لئے ایک تنبیہ اور صدائے ہوشیار باش ہے۔

یہ احتمال بھی اس جملہ کی تفسیر میں موجود ہے کہ خدا نے آسمانی اور زمینی عذاب کے مقابلہ میں دو دوسرے عذاب بیان کئے ہیں، ایک عقیدہ اور فکر و نظر میں اختلاف کا عذاب (جو حقیقت میں اوپر کے عذابوں کی مانند ہے) اور دوسرے عمل اور اجتماعی طور طریقوں میں اختلاف کا عذاب جس کا نتیجہ جنگ اور خونریزی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو نیچے کی طرف کے عذاب کے مشابہ ہے، اس بنا پر آیت میں چار قسم کے طبعی عذابوں اور دو قسم کے اجتماعی عذابوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ اس بات کا اشتباہ نہ ہونے پائے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ خدا تمہارے درمیان تفرقہ ڈال دے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا بلا وجہ لوگوں کو نفاق و اختلاف میں گرفتار کر دے گا بلکہ یہ لوگوں کے برے اعمال، خود خواہیوں، خود پرستیوں اور شخصی نفع خوریوں کا نتیجہ ہے کہ جس کا اثر نفاق اور تفرقہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت اس سبب سے ہے کہ اس نے اس قسم کا اثر ان برے اعمال میں قرار دے دیا ہے۔

۴۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے، ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک مشرک معاشرہ جو توحید اور یکتا پرستی کے راستے سے منحرف ہو چکا ہے، وہ طبقات بالا کے ظلم و ستم میں بھی گرفتار ہوتا ہے اور نچلے طبقہ کی فرض ناشناسی کی مصیبت میں بھی گرفتار ہوتا ہے، اختلاف عقیدہ کی خرابیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے اور اجتماعی خونیں کشمکشوں میں ہی گرفتار ہوتا ہے، جیسا کہ آج کی مادی دنیا میں معاشرے، جو صرط صنعت و ثروت کے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں ان تمام عظیم بلاؤں میں مبتلا ہیں اور ان کے درمیان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

ہمیں اسے مذاہب کا بھی علم ہے کہ جو توحید و خدا پرستی کا دم بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر مشرک اور بت پرست ہیں، ایسے مذاہب و اقوام بھی انھیں مشرکین کے سے انجام میں گرفتار ہوں گے اور یہ جو ہم بعض احادیث میں پڑھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: قل هذا فی اهل القبلة۔ یہ سب سزائیں مسلمانوں میں ہی واقع ہوں گی۔

ممکن ہے کہ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہو کہ جب مسلمان توحید کے راستے سے منحرف ہو جائیں، خود خواہی اور خود پرستی اخوت اسلامی کی جگہ لے لے، شخصی مفاد عمومی مفاد پر مقدم سمجھا جانے لگے اور ہر شخص اپنی ہی فکر میں لگ جائے اور خدائی احکام بھلا دئے جائیں، تو وہ بھی ایسے انجام میں گرفتار ہو جائیں گے۔

۱۔ ”شيعا“ جمع ہے شيعہ کی جس کا معنی گروہ ہے۔

آیات ۶۶، ۶۷

۶۶ ﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾ -

۶۷ ﴿لِكُلِّ نَبِيٍّ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ -

ترجمہ:

۶۶- تیری قوم نے اس کی تکذیب اور انکار کیا حالانکہ وہ حق ہیں (ان سے) کہہ دو کہ میں تمہارے بارے میں (قبول کرنے اور ایمان لانے کا) جوابدہ ہوں (میرا فریضہ صرف ابلاغ رسالت ہے نہ کہ تمہیں ایمان پر مجبور کرنا)۔
۶۷- ہر خبر (جو خدا نے تمہیں دی ہے آخر کار اس) کی ایک قرار گاہ ہے (اور وہ اپنی وعدہ گاہ میں انجام پائی گی) اور تم جلدی ہی جان لو گے۔

جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو کہ

یہ دونوں آیات حقیقت میں اس بحث کی تکمیل ہے جو خدا، معاد اور حقائق اسلام کی طرف دعوت دینے اور خدائی سزاؤں سے ڈرانے کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ: تیری قوم و جمعیت یعنی قریش اور مکہ کے لوگوں نے تیری تعلیمات کی تکذیب کی حالانکہ وہ سب حق ہے اور مختلف عقلی، فطری اور حسی دلائل ان کی تائید کرتے ہیں ﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ﴾ - (۱)

اس بنا پر ان کی تکذیب اور انکار سے ان حقائق کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی خواہ مخالفت کرنے والے اور منکرین کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد حکم دیا گیا کہ: ان سے کہہ دو کہ میری ذمہ داری تو صرف ابلاغ رسالت ہے اور میں تمہارے قبول کرنے کا ضامن نہیں ہوں ﴿قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾

ان متعدد آیات سے کہ جن میں یہی تعبیر اور اسی کے مانند تعبیر آئی ہے (مثلاً انعام - ۱۰۷، یونس - ۱۰۸، زمر - ۴۱ اور شوریٰ - ۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر ”وکیل“ سے مراد ایسا شخص ہے کہ جو ہدایت عملی کے لئے جوابدہ اور دوسروں کا ضامن ہو، اس طرح پیغمبر انھیں بتاتے ہیں کہ یہ صرف تم ہو کہ جو حقیقت کو قبول کرنے یا روکنے کے سلسلے میں پورا پورا اختیار رکھتے ہو اور ہدایت کو قبول کرتے ہو، میں تو صرف ابلاغ رسالت اور دعوت الہی پر مامور ہوں

بعد والی آیت میں ایک مختصر اور پر معنی جملہ کے ساتھ انھیں تنبیہ کر رہا ہے اور صحیح راستہ انتخاب کرنے کے بارے میں دقت نظر اور باریک بینی کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے: ہر خبر جو خدا یا پیغمبر تمھیں دیتے ہیں بلا آخر اس جہاں میں یا دوسرے جہاں میں اس کی کوئی نہ کوئی قرار گاہ ہے اور آخر کار وہ اپنی مقررہ میعاد پر انجام پائے گی اور تمھیں بہت جلد اس کی خبر ہو جائے گی ﴿لِكُلِّ نَبِيٍّ مُّسْتَفْضَرٍّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ - (۲)

۱۔ ضمیر ”ہ“ کو بعض نے قرآن کی طرف لوٹایا ہے اور بعض نے اس خاص عذاب کی طرف جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہوا تھا لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ان تمام باتوں کی طرف اور پیغمبر کی تمام تعلیمات کی طرف جن کی دشمنان پیغمبر تکذیب و انکار کیا کرتے تھے، لوٹتی ہے اور آیت کا آخری جملہ بھی اس معنی پر گواہ ہے۔

۲۔ ہو سکتا ہے ”مستقر“ مصدر میبی، بمعنی اسقرار ہو، یا یہ اسم زمان و مکان محل استقرار کے معنی میں ہو، پہلی صورت میں خدائی وعدوں کے اصل تحقق کی خبر دے رہا ہے اور دوسری صورت میں ان وعدوں کے زمان و مکان کی خبر ہے۔

آیات ۶۸، ۶۹

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَتَّبِعُهُ بَعْدَ الذِّكْرِ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ -

﴿وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرِي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ -

ترجمہ:

۶۸۔ جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو کہ جو ہماری آیات کا مذاق اڑاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لو، یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو جو نہی (اس) ستمگر گمراہ کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے تو ان کے پاس بیٹھنے سے کنارہ کشی کر لو۔

۶۹۔ اور اگر صاحب تقویٰ افراد (انہیں ہدایت اور پسند و نصیحت کرنے کے لئے ان کے پاس بیٹھ جائیں) تو ان کے حساب (وگناہ) میں سے کوئی چیز ان کے اوپر عائد نہیں ہوگی لیکن (یہ کام صرف انہیں) یاد دہانی کرانے کے لئے ہونا چاہئے شاید (وہ سننے اور) پرہیزگاری اختیار کر لیں۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ جب پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو کفار اور آیات الہی کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع کیا گیا، تو مسلمانوں کی ایک جماعت کہنے لگی کہ اگر ہم چاہیں کہ اس حکم پر ہر جگہ عمل کریں تو نہ ہمیں مسجد الحرام میں جانا چاہئے اور نہ ہی خانہ کعبہ کا طواف کرنا چاہئے (کیوں کہ وہ مسجد کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور آیات الہی کے بارے میں باطل باتوں میں مشغول ہیں اور ہم مسجد الحرام کے کسی بھی گوشہ میں خواہ کتنا بھی مختصر توقف کریں اس میں ان کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ سکتی ہیں)، اس موقع پر دوسری آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے موقع پر انہیں نصیحت کرے اور جتنا ہو سکے ان کی ہدایت اور رہنمائی کریں۔

اس آیت کے لئے شان نزول کا ذکر جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں تمام سورۃ کے اکٹھا نازل ہونے کے منافی نہیں کیوں کہ ممکن ہے مسلمانوں کی زندگی میں ایسے مختلف حوادث پیش آئیں، اس کے بعد ایک سورہ اکٹھی نازل ہو اور اس کی کوئی آیت ان حوادث میں سے کسی حصہ کو مد نظر رکھتے ہوئے آئی ہو۔

اہل باطل کی مجالس سے دوری

چونکہ اس سورہ کے زیادہ تر مباحث مشرکین اور بت پرستوں کی کیفیت کے بارے میں ہے لہذا ان دو آیات میں ان سے مربوط ایک دوسرے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ: جس وقت تم ہٹ دھرم اور بے منطق مخالفین کو دیکھو کہ وہ آیات خدا کا استہزاء کر رہے ہیں تو ان سے منہ پھیر لو جب تک وہ اس کام سے صرف نظر کر کے دوسری گفتگو کو شروع نہ کر لیں ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ﴾ - (۱)

اس جملے میں اگرچہ روئے سخن پیغمبر کی طرف ہے، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مومنین کے لئے ہے۔ اس حکم کا فلسفہ بھی واضح ہے کہ اگر مسلمان ان کی مجالس میں شرکت کرتے تھے تو وہ انتقام لینے اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لئے اپنی باطل اور ناروا باتوں کو جاری رکھتے تھے، لیکن جب وہ بے اعتنائی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر جائیں تو وہ فطرتاً خاموش ہو جائیں گے اور دوسرے مسائل شروع کر دیں گے، کیوں کہ ان کا سارا مقصد تو پیغمبر اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ موضوع اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ ”اگر شیطان تمہیں یہ بات بھلا دے اور اس قسم کے افراد کے ساتھ بھول کر ہم نشین ہو جاؤ تو جب بھی اس موضوع کی طرف توجہ ہو جائے فوراً اس مجلس سے کھڑے ہو جاؤ اور ان ظالموں کے پاس نہ بیٹھو ﴿وَإِنَّمَا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرِىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ - (۲)

۱۔ ”خوض“ جیسا کہ ”راغب“ کتاب ”مفردات“ میں کہتا ہے دراصل پانی میں وارد ہونے اور اس میں چلنے (اور نہانے) کے معنی میں ہے لیکن بعد اور امور میں وارد ہونے کے معنی میں بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن میں اس لفظ کا اطلاق زیادہ تر باطل اور بے بنیاد مطلب میں وارد ہونے کے معنی میں ہوا ہے۔

۲۔ شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ ”لا تقعد“ (ان کے پاس نہ بیٹھو) سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف ایسے افراد کے پاس بیٹھنا ممنوع ہے، بلکہ مقصد تو ان کی جماعت میں شرکت کرنا ہے، چاہے بیٹھنے کی شکل میں ہو یا قیام کی صورت میں یا چلنے کی حالت میں۔

دوسوال اور ان کا جواب

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان پیغمبر پر تسلط پیدا کرے اور ان کے نسیان کا باعث بنے، دوسرے لفظوں میں کیا مقام عصمت اور خطا مصونیت کے باوجود حتیٰ کہ موضوعات میں یہ بات ممکن ہے کہ پیغمبر اشتباہ اور نسیان میں گرفتار ہو جائے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ روئے سخن آیت میں پیغمبر کی طرف سے ہے لیکن حقیقت میں ان کے پیروکار مراد ہیں کہ اگر وہ فراموش کاری میں گرفتار ہو جائیں اور کفار کے گناہ آمیز اجتماعات میں شرک ہو جائی تو جس وقت بھی انھیں یاد آجائے فوراً وہاں سے اٹھ کھڑے ہو اور باہر نکل جائیں، اور قسم کی بحث ہماری روزمرہ کی گفتگو میں اور مختلف زبانوں کے ادبیات میں عام نظر آتی ہے کہ انسان روئے سخن تو کسی اور کی طرف کرتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سن لیں، عربوں کی مشہور ضرب المثل کی طرح، جس میں کہتے ہیں:

ایاک اعنی واسمعی یا جارة

میری مراد تو تم ہو اور اے پڑوسن تو سن لے۔

بعض مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور ابو الفتوح نے اپنی مشہور تفسیر میں ایک دوسرا جواب دیا ہے کہ جس کا حاصل یہ ہے انبیاء کے لئے خدا کی طرف سے احکام کے پہنچانے اور مقام رسالت میں سہو و فراموشی اور بھول چوک کا ہونا تو جائز نہیں ہے لیکن موضوعات خارجی میں اگر لوگوں کی گراہی کا سبب نہ ہو تو کوئی صرح نہیں ہے لیکن یہ جواب اس اصول کے ساتھ جو ہمارے متکلمین کے درمیان مشہور ہے کہ انبیاء وائمہ علیہم السلام احکام کے علاوہ عام موضوعات میں بھی غلطی سے معصوم و مصنون ہیں مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض علمائے اہل سنت نے اس آیت کو رہبران دینی کے لئے تقیہ جائز نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے کیوں کہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے: دشمنوں کے سامنے تقیہ نہ کرو یہاں تک کہ اگر تم ان کی مجلس میں بھی موجود ہو تو ان کی مجلس سے کھڑے ہو جاؤ،

اس اعتراض کا جواب بھی بالکل واضح اور روشن ہے، کیوں کہ شیعہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر جگہ تقیہ ضروری ہے بلکہ تقیہ بعض مواقع پر تو قطعاً حرام ہے اور اس کا وجوب صرف ایسے مواقع کے لئے ہے کہ جہاں تقیہ کرنے اور اظہار حق نہ

کرنے میں کچھ ایسے فوائد و منافع ہوں کہ جو اس کے اظہار سے زیادہ ہو یا یہ کہ تقیہ دفع ضرر اور خطر کلی کے دور ہونے کا موجب ہو۔

بعد والی آیت میں ایک موقع کو مستثنیٰ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اگر صاحب تقویٰ لوگ نہی از منکر کی غرض سے ان کے جلسوں میں شرکت کریں اور پرہیزگاری کی امید اور ان کے گناہ سے پلٹ آنے کی امید پر انہیں نصیحت کریں تو کوئی مانع نہیں ہے اور ہم ان کے گناہ کو ایسے افراد کے حسام میں نہیں لکھے گ، کیوں کہ ہر حالت میں ان کا ارادہ تو خدامت اور اپنے فرض کی بجا آوری تھا ﴿وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرِي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾۔

اس آیت کے لئے ایک دوسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ظاہر آیت اور اس کی شان نزول کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

ضمناً اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہئے کہ صرف وہ افراد استثنیٰ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جو آیت کی تعبیر کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری کے مقام کے حامل ہوں اور نہ صرف یہ کہ وہ خود ان سے متاثر ہوں، بلکہ وہ انہیں خود اپنے سے متاثر کر سکیں۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ کے ذیل میں بھی مذکورہ آیت کے مشابہ ایک مضمون آیا ہے اور وہاں پر دوسرے مطالب بیان ہوئے ہیں۔^(۱)

آیت ۷۰

۷۰ ﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَعَرِثَهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكَرَ بِهِ أَنْ تَبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلُّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾ -

ترجمہ:

۷۰۔ تم ایسے لوگوں کہ جنہوں نے اپنے فطری دین کو کھیل تماشہ (اور استہزاء) بنا لیا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں مغرور کر دیا ہے، چھوڑ دو اور انہیں نصیحت کرو تا کہ وہ اپنے اعمال کے (برے نتائج) میں گرفتار نہ ہوں، (اس دن) خدا کے سوا نہ ان کا کوئی یار ویاور ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا اور (ایسے شخص سے) خواہ وہ کسی بھی قسم کا عوض کیوں نہ دے اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو ان اعمال میں گرفتار ہوئے ہیں کہ جو انہوں نے انجام دئے ہیں، ان کے پینے کے لئے گرم پانی ہے اور دردناک عذاب ہے، یہ اس سبب سے ہوگا کیوں کہ انہوں نے کفر اختیار کیا ہے۔

دین حق کو کھیل بنانے والے

یہ آیت اصل میں گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہے اور پیغمبر اکرم کو حکم دے رہی ہے کہ وہ ”ایسے اشخاص سے کہ جنہوں نے اپنے دین و آئین کو مذاق بنا لیا ہے اور لہو لعب کو دین قرار دے لیا ہے اور دنیاوی زندگی اور اس کے وسائل نے انہیں مغرور کر دیا ہے، منہ پھیر لیں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں“ ﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَعَرِثَهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا﴾ -

یہ بات واضح ہے کہ ایسے اشخاص کو چھوڑ دینے کا حکم مسئلہ جہاد کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتا، کیوں کہ جہاد کی کچھ خاص شرائط ہیں اور کفار کے ساتھ بے احتیاطی برتنے کے شرائط دوسری ہیں، ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر انجام پذیر ہونا چاہئے، بعض اوقات تو بے اعتنائی کے ذریعہ ہی مخالفین کو دبانا لازم ہوتا ہے اور کبھی مبارزہ و جہاد اور مسلح جنگ کے ذریعہ مقابلہ ضروری ہوتا ہے اور بعض حضرات نے جو یہ تصور کر لیا ہے کہ آیات جہاد نے اوپر والی آیت کو منسوخ کر دیا ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

حقیقت میں مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دیم اپنے مفاہیم کے لحاظ سے یہود اور فضول ہے اور انھوں نے چند ایسے اعمال کا نام دین رکھ لیا ہے جو بچوں کے کاموں اور بوڑھوں کی لغویات سے زیادہ مشابہ ہے، ایسے لوگ بحث و گفتگو کے قابل نہیں ہے، لہذا حکم دیا گیا ہے کہ تم ان سے رخ موڑ لو اور ان کی اور ان کے کھوکھلے مذہب کی پرواہ نہ کرو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ ”ذینہم“ سے مراد وہی ان کا شرک و بت پرستی والا مذہب ہی ہے، یہ احتمال کہ اس سے مراد ”دین حق“ ہو اور ان کی طرف دین کی اضافت و نسبت دین کے فطری ہونے کی وجہ سے ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کفار کی ایک جماعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ وہ خود اپنے دین و مذہب کو ایک لہو لعاب ہی سمجھتے تھے، اور ہرگز اس میں ایک حقیقی مطلب کے طور پر غور نہیں کرتے تھے، یعنی وہ اپنی بے ایمانی میں بھی بے ایمان تھے اور اپنے بے بنیاد مذہب کے اصولوں سے بھی وفادار نہیں تھے۔

بہر حال آیت کفار کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی اور ان تمام لوگوں کے حالت پر محیط ہے جو مقدسات الہی اور احکام خداوندی کو اپنے شخصی اور مادی مقصد کے حصول کا ایک کھیل قرار دیتے ہیں، دین کو دنیا کا آلہ اور خدا کے حکم کو اعتراض شخصی کا کھلونہ بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں ان اعمال پر تنبیہ کریں کیوں کہ ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہر شخص اپنے اعمال کے آگے سپر انداختہ ہوگا اور اس کے لئے اس کے چنگل سے فرار کی راہ نہیں ہوگی ﴿وَذَكِّرْ بِهِ أَنَّ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ - (۱)

اور اس دن خدا کے سوا ناکوئی اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا ﴿لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ﴾ -

اس کا معاملہ اس دن اس قدر سخت اور دردناک ہوگا اور وہ اپنے اعمال کی زنجیر میں اس طرح گرفتار ہوں گے کہ: خواہ کتنا بھی تاوان اور جرمانہ (بالغرض ان کے پاس ہو اور وہ) دیں کہ اپنے آپ کو سزاؤں سے نجات دلا لیں تو وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا ﴿وَإِنْ تَعْدِلْ كُلُّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذَ مِنْهَا﴾ (۲)

کیوں کہ وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہو چکے ہیں، اس دن نہ تو تلافی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی توبہ کا وقت باقی ہے لہذا ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا﴾۔

اس کے بعد ان کی دردناک سزاؤں کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیوں کہ انھوں نے حق اور حقیقت کو ٹھکرا دیا ہے لہذا ان کے لئے دردناک عذاب کے ساتھ پینے کے لئے کھولتا ہوا گرم پانی ہوگا (ل ﴿هُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ﴾) وہ گرم گرم کھولتے ہوئے پانی کی وجہ سے اندر سے جل رہے ہوں گے اور باہر کی طرف سے آگ میں جل رہے ہوں گے۔

ایک نکتہ کہ جس کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے یہ ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا﴾، ”وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہوں گے“ حقیقت میں ان سے تاوان قبول نہ ہونے اور ان کا ولی و شفیع نہ ہونے کی دلیل و علت کے طور پر ہے، یعنی ان کی سزا کسی خارجی عامل کی وجہ سے نہیں ہے کہ جسے کسی طرح سے دفع کیا جاسکے، بلکہ خود ان کی ذات و صفات اور اعمال کے اندر ہی اس کا سرچشمہ ہے، وہ اپنے برے اعمال کے قیدی ہیں اس لئے ان کی رہائی ممکن نہیں ہے، کیوں کہ اعمال اور ان کے آثار سے الگ ہونا خود اپنے آپ سے جدا ہونے کے مترادف ہے۔

لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہئے کہ یہ شدت و سختی اور راہ باز گشت کا مسدود ہونا اور شفاعت کا عدم وجود ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو کفر پر اصرار کرتے ہیں اور ہمیشہ اسی پر کار بند رہے، جیسا کہ (بما کانوا یکفرون) کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کیوں کہ فعل مضارع کسی چیز کے استمرار کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔

۱۔ ”تبسل“ اصل میں مادہ ”بسل“ (بروزن نسل) کسی چیز سے قہر و غلبہ کے ذریعہ بچنے اور منع کرنے کے معنی میں، اسی لئے کسی کو تسلیم و سپردگی کے لئے ابھارنے کو ابسال کہا جاتا ہے، نیز اسی مناسبت سے سزا دینے اور یرغمال بنانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور ”جیش باسل“ لشکر شجاع کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے ہے، کیوں کہ وہی دوسروں کو قہر و غلبہ سے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے، اوپر والی آیت میں بھی کسی شخص کا تسلیم اور گرفتار ہونا اپنے برے اعمال کے چنگل میں کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ ”عدل“ یہاں معادل اور وہ چیز جو کسی غلط کام کی تلافی کے طور پر دی جائے کے معنی میں ہے تاکہ مد مقابل آزاد ہو جائے، حقیقت میں اس کا معنی غرامت، جرمانے اور فدیہ سے شباهت رکھتا ہے۔

آیات ۷۱، ۷۲

۷۱ ﴿قُلْ أَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرْثِدْ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانًا لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَىٰ امْتَثِنَا قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَأْمُرْنَا لِنُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔

۷۲ ﴿وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴾۔

ترجمہ:

۷۱۔ تم کہہ دو کہ کیا ہم خدا کے سوا کسی اور چیز کو پکاریں کہ جو نہ ہمارے لئے کوئی فائدہ دینے والی ہے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچانے والی اور (اس طرح سے) ہم پیچھے کی طرف پلٹ جائیں جب کہ خدا نے ہمیں ہدایت کر دی ہے، اس شخص کی مانند کہ جسے شیاطین کے وسوسوں نے گمراہ کر دیا ہو اور وہ زمین میں حیراں ہو، حالانکہ اس کے لئے ایسے یار و مددگار بھی ہیں کہ جو اسے ہدایت کی طرف بلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) کہ ہماری طرف آؤ، تم کہہ دو کہ صرف خدا کی ہدایت ہی (اصل) ہدایت ہے، اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔

۷۲۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے وہ ذات کہ جس کی طرف تم محشور ہو گے۔

کیا ہم سابقہ حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

یہ آیت اس اصرار کے مقابلہ میں ہے جو مشرکین مسلمانوں کو کفر و بت پرستی کی دعوت کے لئے کھڑے تھے، پیغمبر کو حکم دے رہی ہے کہ ایک دندان شکن دلیل کے ساتھ انھیں جواب دیں اور ایک استفہام انکاری کی صورت میں ان سے پوچھیں کہ: کیا تم یہ کہتے ہو ہم کسی ایسی چیز کو خدا کا شریک قرار دیں کہ جو نہ ہمارے لئے فائدہ رکھتی ہے کہ اس فائدہ کی خاطر ہم اس کی طرف جائیں اور نہ ہی کوئی ضرر رکھتی ہے کہ ہم اس کے نقصان سے ڈریں

﴿قُلْ أَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا﴾۔

یہ جملہ حقیقت میں اس جملہ کی طرف اشارہ ہے کہ عام طور سے انسان کے تمام کام انھیں دونوں سرچشموں میں سے کسی ایک سرچشمہ سے پیدا ہوتے ہیں، یا تو نفع کے حصول کی خاطر ہوتے ہیں (خواہ وہ مادی نفع ہو یا معنوی) اور یا وہ دفع ضرر کی خاطر ہوتے ہیں (ضرر بھی خواہ معنوی ہو یا مادی)۔

کوئی عاقل کیسے کوئی ایسا کام کرے گا کہ جس میں ان دونوں میں سے کوئی سا عامل بھی موجود نہ ہو؟۔

اس کے بعد مشرکین کے مقابلے میں ایک اور استدلال پیش کیا گیا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور ہدایت الہی کے بعد شرک کی راہ میں گامزن ہو جائیں (تو اس طرح) تو ہم پیچھے کی طرف لوٹ جائیں گے اور یہ بات قانون ارتقاء کے خلاف ہے کہ جو عالم حیات کا ایک عمومی قانون ہے ﴿وَنُرِيدُ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا

اللَّهُ﴾ - (۱)

اس کے بعد ایک مثال کے ذریعہ اس مطلب کو اور زیادہ واضح اور روشن کیا گیا ہے اور قرآنیوں کہتا ہے: (توحید سے شرک کی طرف بازگشت) مثل اس کے ہے کہ کوئی شخص شیطانی وسوسوں سے (یا غولہائے بیابانی سے کہ جو جاہلیت کے عربوں کے خیال کے مطابق راستوں میں گھات لگا کر بیٹھے ہوا کرتے تھے اور مسافروں کو ان کی راہ سے بے راہ کر دیا کرتے تھے) راہ مقصد گم کر دے اور بیابان میں حیران و سرگرداں رہ گیا ہو

﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ خَيْرَانَ﴾ -

حالانکہ اس کے ایسے دوست بھی ہیں کہ جو اسے ہدایت اور شاہراہ (حق) کی طرف بلاتے ہیں اور اسے آوازیں دے رہے ہیں کہ ہماری طرف آؤ۔ لیکن وہ اس طرح سے حیران و سرگرداں ہیں کہ جیسے وہ ان کی باتوں کو سن ہی نہیں رہا ہے، یا وہ قوت ارادی نہیں رکھتا ﴿لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَىٰ ائْتِنَا﴾ - (۲)

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ تم صراحت کے ساتھ یہ کہہ دو کہ: ”ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم صرف عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کریں“ ﴿قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَأُمِّرْنَا لِنُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ -

یہ جملہ حقیقت میں مشرکین کی مذہب کی نفی پر ایک اور دلیل ہے کیوں کہ صرف ایسی ذات کے سامنے ہی سر تسلیم خم کرنا چاہئے کہ جو مالک خالق اور مربی عالم ہستی ہو، نہ کہ بتوں کے سامنے کہ جو اس جہاں کی ایجاد و تخلیق میں کوئی نقش و اثر نہیں رکھتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے پہلے مشرکین کے مذہب کے پیرو تھے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ: ”رَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا ب“
کیا ہم سابقہ حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

حالانکہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کبھی بھی بت سے سامنے سجدہ نہیں کیا اور کسی بھی تاریخ میں اس قسم کی کوئی چیز لکھی ہوئی نہیں ہے پھر اصولی طور پر مقام عصمت بھی ایسے کسی امر کی اجازت نہیں دیتا۔
یہ لفظ حقیقت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کی زبان سے ادا ہوا ہے ناکہ ذات پیغمبر کی زبان سے اسی لئے جمع کے صیغہ اور ضمیروں کے ساتھ ادا ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں دعوت الہی کے بعد عائد ہونے والے فرائض کی یوں تشریح کی گئی ہے کہ ہم نے توحید کے علاوہ یہ حکم دیا ہے کہ ”نماز قائم کرو اور تقویٰ اختیار کرو“ ﴿واقم الصلاة واتقوہ﴾۔

اور آخر میں مسئلہ معاد و قیامت کی طرف توجہ کرواتے ہوئے اور یہ کہ تمہارا حشر و نشر اور بازگشت خدا کی طرف ہے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے

﴿وہوالذی الیہ تحشرون﴾۔

حقیقت میں ان چند مختصر جملوں وہ پروگرام جس کی طرف پیغمبر دعوت دیا کرتے تھے اور جس کا سرچشمہ عقل اور فرمان خدا تھا، چار اصولوں کے پروگرام کی صورت میں جس کا آغاز توحید اور انجام معاد و قیامت تھا اور اس کے درمیانی مراحل خدائی رشتوں کو محکم کرنا اور ہر گناہ سے پرہیز کرنا تھا، پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ ”اعقاب“ جمع ”عقب“ (بروزن خشم) ایڑی کے معنی میں اور ایڑی پر پھرنے کو پیچھے کی طرف پھرنا کہتے ہیں اور یہ ہدف و مقصد سے انحراف اور پھرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وہی چیز ہے کہ جسے آجکل ارتجاع (یعنی رجعت پسندی) سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ”اشھوۃ“ ”ہوی“ کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ کسی کو ہوا و ہوس کی پیروی پر آمادہ کرنے کے معنی میں ہے ”حیران“ لغت میں آمد و رفت کے معنی میں ہے اور عام طور سے سرگردانی سے کنایہ ہے، کیوں کی لوگ سرگردانی سے کچھ راستہ چلتے ہیں پھر پلٹ آتے ہیں اس بنا پر یہ آیت ان افراد کو جو ایمان سے شرک کی طرف پلٹ جائیں سرگرداں ہوا پرستوں سے تشبیہ دیتی ہے جو اپنا اصل پروگرام شیطانی الہام کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔

آیت ۷۳

۷۳ ﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْحَنِيفُ﴾۔

ترجمہ:

۷۳۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور اس دن وہ کہے گا 'ہو جاتو' (جس بات کا ارادہ کیا ہے) وہ ہو جائے گا، اس کا قول حق ہے، اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن تو حکومت اسی کے ساتھ مخصوص ہوگی، وہ (تمام) پوشیدہ اور ظاہر و آشکار (چیزوں) سے باخبر ہے اور وہ حکیم و خیر ہے۔

صرف وہی ذات کہ جو مبداء عالم ہستی ہے،

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیت کے مطالب پر ایک دلیل، اور پروردگار عالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی ہدایت کی پیروی کرنے کے لازم ہونے کی بھی ایک دلیل ہے، لہذا پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا ہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ﴾۔

صرف وہی ذات کہ جو مبداء عالم ہستی ہے، اور رہبری کے لئے شائستہ و لائق ہے اور صرف اسی کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے کیوں کہ اس نے تمام چیزوں کو ایک صحیح مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔

اوپر والے جملے میں "حق" سے مراد وہی نتیجہ، مقصد، ہدف، مصلح اور حکمتیں ہیں، یعنی اس نے ہر چیز کو کسی مصلحت اور اور ہدف و نتیجہ کے لئے پیدا کیا ہے حقیقت میں یہ جملہ اس مطلب سے مشابہ ہے جو سورہ ص آیہ ۲۷ میں بیان ہوا ہے کہ ہم جہاں پر ہے: ﴿وَمَا خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا﴾۔

ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: نہ صرف مبداء عالم ہستی وہی بلکہ معاد و قیامت بھی اسی کے حکم سے صورت پذیر ہوگی اور جس دن وہ حکم دینا کہ قیامت پیا ہو جائے تو وہ فوراً پیا ہو جائے گی ﴿وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ﴾^(۱)۔

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملہ سے مراد وہی آغاز آفرینش اور مبداء جہاں ہستی ہے کہ تمام چیزیں اس کے فرمان سے ایجاد ہوئی ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقول" فعل مضارع ہے، اور یہ کہ اس جملے

پہلے اصل آفرینش کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح بعد کے جملوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ جملہ قیامت اور اس کے بارے میں حکم خدا کے ساتھ ہی مربوط ہے۔

جیسا کہ ہم (تفسیر نمونہ کی) جلد اول (سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ کے ذی میں) میں بیان کرچکے ہیں، کہ ”کن فیکون“ سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا ایک لفظی فرمان ”ہو جا“ کی طرف صادر فرماتا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے خلق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کسی دوسرے عامل کی احتیاج کے بغیر اس کا ارادہ خود بخود جامہ عمل پہن لیتا ہے، اگر اس نے یہ اراد کیا ہے کہ وہ چیز دفعتاً اور ایک ہی مرتبہ موجود ہو جائے تو وہ ایک ہی دفعہ موجود ہو جاتی ہے اور اگر اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ چیز تدریجاً وجود میں آئے تو اس کا تدریجی پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ: خدا کی بات حق ہے، یعنی جس طرح آفرینش کی ابتدا ہدف و نتیجہ اور مصلحت کی بنیاد تھی، قیامت و معاد بھی اسی طرح ہوگی ﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ﴾۔

اور اس دن جب صور میں پھونکا جائے گا اور قیامت پرپا ہو جائے گی، تو حکومت و ملکیت اسی کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہوگی ﴿وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ﴾۔

یہ صحیح ہے کہ خدا کی ملکیت اور حکومت تمام عالم ہستی پر ابتدا جہاں سے رہی ہے اور دنیا کے خاتمہ تک اور عالم قیامت میں بھی جاری رہے گی اور قیامت کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں رکھتی لیکن چونکہ اس جہان میں اہداف و مقاصد کی تکمیل اور کاموں کے انجام دینے کے لئے عوامل و اسباب کا ایک سلسلہ اثر انداز ہوتا ہے لہذا بعض اوقات یہ عوامل و اسباب خدا سے جو مسبب الاسباب ہے غافل کر دیتے ہیں، مگر وہ دن کہ جس میں تمام اسباب بے کار ہو جائیں گے تو اس کی ملکیت و حکومت ہر زمانے سے زیادہ آشکار و واضح ہو جائی گی، ٹھیک ایک دوسری آیت کی طرح جو یہ کہتی ہے کہ:

﴿لَمَن مِّلْكُ الْيَوْمِ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾۔

حکومت اور ملکیت آج (قیامت کے دن) کس کی ہے؟ صرف خدا نے یگانہ و قہار کے لئے ہے، (سورہ المومن، آیہ ۱۶)۔ اس بارے میں کہ صور۔ جس میں پھونکا جائے گا۔ سے مراد کیا ہے اور اسرافیل صور میں کس طرح پھونکے گا کہ اس سے تمام جہاں والے مرجائیں گے اور دوبارہ صور میں پھونکے گا تو سب زندہ ہو جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی، انشاء اللہ ہم سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کریں گے کیوں کہ یہ بحث اس آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں خدا کی صفات میں سے تین صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: خدا پنہاں و آشکار سے باخبر ہے ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾

اور اس کے تمام کام حکمت کی رو سے ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے (وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ)، قیامت سے مربوط آیات میں اکثر خدا کی ان صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ آگاہ بھی ہے اور قادر و حکیم بھی، یعنی اپنے علم و آگاہی کے اقتضاء کے مطابق وہ ہر شخص کو مناسب جزا دیتا ہے۔

۱۔ اس بارے میں کہ ”یوم“ جو قواعد ادبی کے مطابق ظرف ہے کس سے متعلق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض اسے ”خلق“ کے جملے سے بعض ”اذکروا“ کے جملہ سے جو محذوف ہے متعلق سمجھتے ہیں، لیکن یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ ”لیکن“ سے متعلق ہو، اور پھر جملے کے معنی اس طرح ہوگا: ”يَكُنُ الْقِيَامَةُ يَوْمَ يَقُولُ اللَّهُ كُنْ“۔

آیت ۷۴

۷۴ ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ أَرَزَّرَ اتَّخَذُ أَصْنَامًا آلِهَةً إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ -

ترجمہ:

۷۴ (اور یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے مربی (چچا) آزر سے یہ کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا خدا بناتے ہو، میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو واضح گمراہی میں پاتا ہوں۔

یہ سورہ شرک و بت پرستی سے مقابلے کا پہلو رکھتی ہے

کیوں کہ یہ سورہ شرک و بت پرستی سے مقابلے کا پہلو رکھتی ہے اور اس میں روئے سخن زیادہ قربت پرستوں کی طرف ہے لہذا ان کو بیدار کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے، یہاں بہادر بت شکن ابراہیم کی سرنوشت کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بت شکنی کے سلسلہ میں ان کی قومی منطق کو چند آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے بیان توحید اور بتوں سے مبارزہ کے سلسلہ میں بہت سے مباحث میں اسی سرگذشت کو ذکر کیا ہے، کیوں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تمام اقوام کے لئے خصوصاً مشرکین عرب کے لئے قابل احترام تھے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) کو تنبیہ کی اور اس سے کہا کہ: کیا تم ان بے قیمت اور بے جان بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ أَرَزَّرَ اتَّخَذُ أَصْنَامًا آلِهَةً﴾ -

اس میں شک نہیں کہ میں تجھے اور تیرے پیروکار اور ہم مسلک گروہ کو واضح گمراہی میں دیکھتا ہوں، اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان اپنی مخلوق کو اپنا معبود قرار دے اور بے جان اور بے شعور موجود کو اپنی پناہ کا سمجھ لے اور اپنی مشکلات حل ان سے طلب کرے ﴿إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ -

کیا آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا

لفظ ”اب“ عربی زبان میں عام طور پر باپ کے لئے بولا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم دیکھے گئے کہ بعض اوقات چچا، نانا، مربی و معلم اور اسی طرح وہ افراد کہ جو انسان کی تربیت میں کچھ نہ کچھ زحمت و مشقت اٹھاتے ہیں ان پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ بولا جائے اور کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر معنی کے لئے پہلے باپ ہی ذہن میں آجاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سچ مچ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ وہ بت پرست شخص (آزر) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا تو کیا ایک بت پرست اور بت ساز شخص ایک اولوالعزم کا پیغمبر کا باپ ہو سکتا ہے، اس صورت میں کیا انسان کی نفسیات و صفات کی وراثت اس کے بیٹے میں غیر مطلوب اثرات پیدا نہیں کر دے گی۔

اہل سنت مفسرین کی ایک جماعت نے پہلے سوال کا مثبت جواب دیا ہے اور آزر کا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا حقیقی باپ سمجھا ہے، جب کہ تمام مفسرین و علماء شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں تھا، بعض اسے آپ کا نانا اور بہت سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چچا سمجھتے ہیں۔

وہ قرآن جو شیعہ علماء کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں حسب ذیل ہے:

۱۔ کسی تاریخی منبع و مصدر اور کتاب میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام آزر شمار نہیں کیا گیا بلکہ سب نے ”تاریخ“ لکھا کتب عہدین میں بھی یہی نام آیا ہے، قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ آزر تھا، یہاں انھوں نے ایسی توجیہات کی ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام تاریخ اور اس کا لقب آزر تھا، حالانکہ یہ لقب بھی منابع تاریخ میں ذکر نہیں ہوا، یا یہ کہ آزر ایک بت تھا کہ جس کی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ پوجا کرتا تھا حالانکہ یہ احتمال اوپر والی آیت کے ظاہر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ آزر ان کا باپ تھا کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتی، مگر یہ کہ کوئی جملہ یا لفظ مقدر مانیں جو کہ خلاف ظاہر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ مسلمان یہ حق نہیں رکھتے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں اگرچہ وہ ان کے عزیز و قریب ہی ہوں، اس کے بعد اس غرض سے کہ کوئی آزر کے بارے میں ابراہیم (علیہ السلام) کے استغفار کو دستاویز قرار نہ دے اس طرح کہتا ہے: وما كان استغفار ابراهيم الا عن موعده وعدة فلما تبين له انه عدو لله تبرأ منه (سورہ توبہ: ۱۱۴)۔

ابراہیم (علیہ السلام) کی اپنے باپ آزر کے لئے استغفار صرف اس وعدہ کی بنا پر تھی جو انھوں نے اس سے کیا تھا، چونکہ آپ نے یہ کہا تھا کہ: ﴿سَأُغْفِرْ لَكَ رَبِّي﴾ (مریم: ۴۷)۔ یعنی میں عنقریب تیرے لئے استغفار کروں گا۔

یہ اس امید پر تھا کہ شاید وہ اس وعدہ کی وجہ سے خوش ہو جائے اور بت پرستی سے بعض آجائے لیکن جب اسی بت پرستی کی راہ میں پختہ اور ہٹ دھرم پایا تو اس کے لئے استغفار سے دستبردار ہو گئے۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے آزر سے مایوس ہو جانے کے بعد پھر کبھی اس کے لئے طلب مغفرت نہیں کی، اور ایسا کرنا مناسب بھی نہیں تھا، تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی جوانی کے زمانے کا ہے جب کہ آپ شہر بابل میں رہائش پذیر تھے اور بت پرستوں کے ساتھ مبارزہ اور مقابلہ کر رہے تھے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیات نشاندہی کرتی ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی آخری عمر میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے باپ کے لئے طلب مغفرت کی ہے (البتہ ان آیات میں جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا، نشان باپ سے ”اب“ کو تعبیر نہیں کیا بلکہ ”والد“ سے تعبیر کیا ہے جو صراحت کے ساتھ باپ کے مفہوم کو ادا کرتا ہے)۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ--- رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾-

”حمد ثنا اس خدا کے لئے ہے کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کئے، میرا پروردگار دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اے پروردگار مجھے، میرے ماں باپ اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے“۔^(۱)

اس آیت کو سورہ توبہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے جو مسلمانوں کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے منع کرتی ہے اور ابراہیم - کو بھی ایسے کام سے، سوائے ایک مدت محدود کے وہ بھی صرف ایک مقدس مقصد و ہدف کے لئے، روکتی ہے، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت میں ”اب“ سے مراد باپ نہیں ہے بلکہ چچا یا نانا یا کوئی اور اسی قسم کا رشتہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ”والد“ باپ کے معنی میں صریح ہے جب کہ ”اب“ میں صراحت نہیں پائی جاتی۔

قرآن کی آیات میں لفظ ”أَب“ ایک مقام پر چچا کی لئے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۱۳۳:

﴿قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالِاهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا﴾

”یعقوب کے بیٹوں نے اس سے کہا ہم تیرے خدا اور تیرے آباء ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے خدائے یکتا کی پرستش کرتے ہیں“۔

ہم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسماعیل - یعقوب - کے چچا تھے باپ نہیں تھے۔

۳۔ مختلف اسلامی روایات سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آنحضرت سے منقول ہے:

”لم یزل ینقلنی اللہ من اصلاب الطاہرین الی ارحام المطہرات حتی اخرجنی فی عالمکم ہذا لم یدنسنی بدنس الجاہلیہ“۔

”خداوند تعالیٰ مجھے ہمیشہ پاک آباء و اجداد کے صلب سے پاک ماؤں کے رحم میں منتقل کرتا رہا اور اس نے مجھے کبھی زمانہ جاہلیت کی آلودگیوں اور گندگیوں میں آلودہ نہیں کیا۔“ (۲)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کی واضح ترین آلودگی شرک و بت پرستی ہے اور جنہوں نے اسے آلودگی زنا میں منحصر سمجھا ہے ان کے پاس اپنے قول پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ قرآن کہتا ہے کہ:

”إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ“ ”مشرکین گندگی میں آلودہ اور ناپاک ہیں۔“ (۳)

طبری جو علمائے اہل سنت میں سے ہے اپنی تفسیر ”جامع البیان“ میں مشہور مفسر مجاہد سے نقل کرتا ہے کہ وہ صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا۔ (۴)

اہل سنت کا ایک دوسرا مفسر آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں اسی آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا شیعوں سے مخصوص ہے ان کی کم اطلاعی کی وجہ سے ہے کیونکہ بہت سے علماء (اہل سنت) بھی اسی بات کا قیدہ رکھتے ہیں کہ آزر ابراہیم - کا چچا تھا۔ (۵)

”سیوطی“ مشہور سنی عالم کتاب ”مسالک الخفاء“ میں فخر الدین رازی کی کتاب ”اسرار التنزیل“ سے نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام - کے ماں باپ اور اجداد کبھی بھی مشرک نہیں تھے اور اس حدیث سے جو ہم اوپر پیغمبر اکرم سے نقل کر چکے ہیں استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد سیوطی خود اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہم اس حقیقت کو دو طرح کی اسلامی روایات سے ثابت کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کی روایات تو وہ ہیں کہ جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر کے آباؤ اجداد حضرت آدم - تک ہر ایک اپنے زمانے کا بہترین فرد تھا (ان احادیث کو ”صحیح بخاری“ اور ”دلائل النبوة“ سے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے)۔

اور دوسروں قسم کی روایات وہ ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہر زمانے میں موحد و خدا پرست افراد موجود رہے ہیں، ان دونوں قسم کی روایات کو باہم ملانے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اجداد پیغمبر کہ جن میں سے ایک ابراہیم کے باپ بھی ہیں یقیناً موحد تھے۔^(۶)

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت کی مذکورہ بالا تفسیر ایک ایسی تفسیر ہے جو خود قرآن اور مختلف اسلامی روایات کے واضح قرائن کی بنیاد پر بیان ہوئی ہے نہ کہ تفسیر بالرائے ہے جیسا کہ بعض متعصب اہل سنت مثلاً مولف المنار نے کہا ہے۔

۱۔ سورہ ابراہیم، آیہ ۴۱، ۳۹۔

۲۔ اس روایت کو بہت سے شیعہ و سنی مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، نیشاپوری نے تفسیر غرائب القرآن میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے۔

۳۔ سورہ توبہ آیہ ۲۸۔

۴۔ جامع البیان جلد ۷ صفحہ ۱۵۸۔

۵۔ تفسیر روح المعانی جلد ۷ صفحہ ۱۶۹۔

۶۔ مسالک الحقیقہ صفحہ ۱۷ مطابق نقل حاشیہ بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۸ اور بعد۔

آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹

۷۵ ﴿وَكَذَلِكَ نُرَىٰ إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ -

۷۶ ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ -

۷۷ ﴿فَلَمَّا رَأَىٰ الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ -

۷۸ ﴿فَلَمَّا رَأَىٰ الشَّمْسُ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ -

۷۹ ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلذِّی فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ -

ترجمہ:

۷۵۔ اس طرح ہم نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت ابراہیم کو دکھائے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائے۔

۷۶۔ جب رات (کی تاریکی) نے اُسے ڈھانپ لیا تو اُس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا۔ کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۷۷۔ اور جب اُس نے چاند کو دیکھا کہ وہ (سینہ افق کو چیر کر) نکلا ہے تو اُس نے کہا کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا کہ اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو میں یقینی طور پر گمراہ جماعت میں سے ہو جاؤں گا۔

۷۸۔ اور جب اُس نے سورج کو دیکھا کہ وہ (سینہ افق کو چیر کر) نکل رہا ہے تو کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ یہ تو (سب سے) بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا اے قوم میں اُن شریکوں سے جنہیں تم (خدا کے لیے) قرار دیتے ہو بیزار ہوں۔

۷۹۔ میں نے تو اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

آسمانوں میں توحید کی دلیلیں

اس سرزنش اور ملامت کے بعد جو ابراہیم - بتوں کی کرتے تھے، اور اُس دعوت کے بعد جو آپ - نے آزر کو بت پرستی کے ترک کرنے کے لیے کی تھی ان آیات میں خدا ابراہیم کے بت پرستوں کے مختلف گمراہوں کے ساتھ منطقی

مقابلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن کے واضح عقلی استدالات کے طریق سے اصل توحید کو ثابت کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: جس طرح ہم نے ابراہیم کو بت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا اسی طرح ہم نے اس کے لیے تمام آسمانوں اور زمین پر پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تسلط کی نشاندہی کی ﴿وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾^(۱)۔

”ملکوت“ اصل میں ”ملک“ (بروزن حکم) کے مادہ سے ہے جو حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور ”و“ اور ”ت“ کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے، اس بنا پر یہاں اس سے مراد تمام عالم ہستی پر خدا کی حکومت مطلقہ ہے۔ یہ آیت اصل میں اُس تفصیل کا ایک اجمال ہے کہ جو بعد کی آیات میں سورج، چاند اور ستاروں کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں اور اُن کے غروب ہونے سے اُن کے مخلوق ہونے پر دلیل لانے کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی قرآن نے پہلے ان مجموعی واقعات کا اجمالی بیان کیا ہے اس کے بعد ان کی تشریح شروع کی ہے اور اس طرح سے ابراہیم - کو ملکوتِ آسمان و زمین دکھانے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ہمارا ہدف و مقصد یہ تھا کہ ابراہیم اہل یقین میں سے ہو جائے ﴿وَلْيَكُونَنَّ مِنَ الْمُوقِنِينَ﴾

اس میں شک نہیں ہے کہ ابراہیم - خدا کی یگانگت کا استدلالی و فطری یقین رکھتے تھے، لیکن اسرار آفرینش کے مطالبہ سے یہ یقین درجہ کمال کو پہنچ گیا، جیسا کہ وہ قیامت اور معاد کا یقین رکھتے تھے، لیکن سربریدہ پرندوں کے زندہ ہونے کے مشاہدہ سے ان کا ایمان ”عین الیقین“ کے مرحلہ کو پہنچ گیا۔

بعد والی آیات میں اس موضوع کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو ستاروں اور آفتاب کے طلوع و غروب سے ابراہیم - کے استدلال کو ان کے خدا نہ ہونے پر واضح کرتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب رات کے تاریک پردے نے سارے عالم کو چھپا لیا تو اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک ستارہ ظاہر ہوا۔ ابراہیم نے پکار کر کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میں ہرگز ہرگز غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں عبودیت و ربوبیت کے لائق نہیں سمجھتا ﴿فَلَمَّا جَنَّ

عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أَحِبُّ الْآفِلِينَ﴾۔

انھوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں صفحہ آسمان پر گاڑیں۔ اس دفعہ چاند کی چاندی جیسی ٹکیہ وسیع اور دل پذیر روشنائی کے ساتھ صفحہ آسمان پر ظاہر ہوئی۔ جب چاند کو دیکھا تو ابراہیمؑ نے پکار کر کہا کہ کیا یہ ہے میرا پروردگار؟ لیکن آخر کار چاند کا انجام بھی اُس ستارے جیسا ہی ہوا اور اُس نے بھی اپنا چہرہ پر وہ افق میں چھپا لیا تو حقیقت کے متلاشی ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اپنی طرف رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہوں کی صف میں جا کھڑا ہوں گا ﴿فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ﴾۔

اُس وقت رات آخر کو پہنچ چکی تھی اور اپنے تاریک پردوں کو سمیٹ کر آسمان کے منظر سے بھاگ رہی تھی، آفتاب نے افق مشرق سے نکالا اور اپنے زیبا اور لطیف نور کو زربفت کے ایک ٹکڑے کی طرح دشت و کوہ و بیابان پر پھیلا دیا، جس وقت ابراہیمؑ کی حقیقت بین نظر اُس کے خیرہ کرنے والے نور پر پڑی تو پکار کر کہا: کیا میرا خدا یہ ہے؟ جو سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ روشن ہے، لیکن سورج کے غروب ہو جانے اور آفتاب کی ٹکیہ کے ہیولائے شب کے منہ میں چلے جانے سے ابراہیمؑ نے اپنی آخری بات ادا کی، اور کہا: اے گروہ (قوم) میں ان تمام بناوٹی معبودوں سے جنھیں تم نے خدا کا شریک قرار دے لیا ہے بری و بیزار ہوں ﴿فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾۔

اب جب کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس متغیر و محدود اور قوانین طبیعت کے چنگل میں اسیر مخلوقات کے ماوا ایک ایسا خدا ہے کہ جو اس سارے نظام کائنات پر قادر حاکم ہے تو میں تو اپنا رٹخ ایسی ذات کی طرف کرتا ہوں کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدے میں کم سے کم شرک کو بھی راہ نہیں دیتا، میں تو موحد خالص ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

۱۔ اس بنا پر آیت میں ایک حذف اور تقدیر موجود ہے جو آیات قبل سے واضح ہوتی ہے اور حقیقت میں آیت کا مضمون اس طرح ہے: (کما ارینا ابراہیم قبح ما کان علی علیہ قومہ من عبادة الاصنام کذلک نری ابراہیم ملکوت السموت و الارض)۔

یہ گفتگو تحقیق کے طور پر کی تھی

اس آیت کی تفسیر اور بعد والی آیات کی تفسیر میں اور یہ کہ ابراہیم - جیسے موحد و یکتا پرست نے کس طرح آسمان کے ستارے کی طرف اشارہ کیا اور یہ کہا کہ یہ میرا خدا ہے مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔ ان تمام تفاسیر میں سے دو تفسیریں زیادہ قابل ملاحظہ ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کو بعض بزرگ مفسرین نے اختیار کیا ہے اور ان پر منابع حدیث میں بھی شواہد موجود ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم - ذاتی طور پر یہ چاہتے تھے کہ خدا شناسی کے بارے میں غور و فکر کریں اور اُس معبود کو جسے وہ اپنی پاک فطرت کی بناء پر اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں پاتے تھے تلاش کریں۔ وہ خدا کو نورِ فطرت اور عقلی احمالی دلیل سے تو پہچان چکے تھے، اور ان کی تمام تعمیرات بتلاتی ہیں کہ انھیں اُس کے وجود میں کسی قسم کا شک و یعہ نہیں تھا، لیکن وہ اس کے حقیقی مصداق کی تلاش میں تھے، بلکہ اُس کے حقیقی مصداق کو بھی جانتے تھے مگر چاہتے یہ تھے کہ زیادہ واضح عقلی اتدالات کے ذریعہ ”حق الیقین“ کے مرحلہ تک پہنچ جائیں۔ اور یہ واقعہ دور ان نبوت سے پہلے کا ہے اور احتمال یہ ہے کہ ابتداء بلوغ یا قبل از بلوغ کا ہے۔

کچھ روایات اور تواریخ میں ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیم - کی نظر آسمان کے ستاروں پر پڑی تھی اور رات کے نیلگوں صفحہ آسمان کو اس کے روشن اور چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ آپ کی والدہ اُن کے بچنے سے ہی نمرود جبار کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے خوف سے ایک غار کے اندر ان کی پرورش کر رہی تھیں۔

لیکن یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ کوئی انسان کئی سالوں تک غار کے اندر ہی زندگی گزارتا رہے یہاں تک ایک تاریک رات میں بھی اس سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ شاید بعض کی نظر میں اس احتمال کی تقویت (رای کو کبا) کے جملے کے سبب سے ہو کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت تک ستارہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ تعبیر کسی لحاظ سے بھی یہ مفہوم اپنے اندر نہیں رکھتی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اس وقت تک ستارے، چاند اور سورج کو دیکھا تو بہت دفعہ تھا لیکن ایک محقق توحید کے طور پر یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُن پر نظر ڈالی اور ان کے طلوع و غروب کو مقامِ خدائی کی نفی کے ساتھ مربوط ہونے پر غور کرنے لگے۔ درحقیقت ابراہیم - نے انھیں بار بار دیکھا تھا لیکن اس نظر سے نہیں۔

اس بنا پر جب ابراہیم - یہ کہتے ہیں کہ: ہذا ربی (یہ میرا خدا ہے) تو یہ ایک قطعی خبر کے عنوان سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فرض اور احتمال کے طور پر اور ہے اور غور و فکر کے لئے ہے۔ اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی حادثہ کی ملت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو تمام احتمالات اور فروض کو ایک ایک کمر کے مطالعہ کے لیے فرض کرتے چلے ہیں اور ہر ایک کے لوازم کی تحقیق ملت کو پاسکیں اور اس قسم کی بات نہ ہی نفی ایمان پر دلالت کرتی ہے بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ تحقیق اور بہتر سے بہتر شناسائی کا ایک طریقہ ہے اور ایمان کے بلند مراتب تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ جیسا کہ ”معاد“ کے سلسلہ میں بھی حضرت ابراہیم - ممرحہ شہود اور اس سے پیدا ہونے والے اطمینان تک پہنچنے کے لیے بیشتر تحقیق کے درپے ہوئے تھے۔ تفسیر عیاشی میں محمد بن مسلم کے واسطے سے امام باقر - یا امام صادق سے اس طرح منقول ہے:

”إِنَّمَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ طَالِباً لِرَبِّهِ وَلَمْ يَبْلُغْ كُفْرًاو أَنَّهُ مِنَ النَّاسِ فِي مِثْلِ ذَلِكَ فَإِنَّهُ بِمَنْزِلَتِهِ“ -

ابراہیم - م نے یہ گفتگو تحقیق کے طور پر کی تھی اور لوگوں میں سے جو شخص بھی تفکر و تحقیق کے لیے یہ بات کہتے تو وہ ابراہیم - کی طرح ہوگا (۱)

اس سلسلے میں دو روایات اور بھی تفسیر نور الثقلین سے نقل ہوئی ہے -

دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم - نے یہ بات ستارہ پرستوں اور سورج پرست لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کی اور احتمال یہ ہے کہ بابل میں بت پرستوں کے ساتھ سخت قسم کے مقابلے اور مبارزات کرنے اور اس زمین سے شام کی طرف نکلنے کے بعد جب ان اقوام سے ان کا آمناسا منا ہوا تو اس وقت یہ گفتگو کی تھی - حضرت ابراہیم - بابل میں نادان قوموں کی ہٹ و ہرمی کو ان کی غلط راہ و رسم میں آزما چکے تھے لہذا اس بنا پر کہ آفتاب و مہتاب کے پجاریوں اور ستارہ پرستوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، پہلے ان کے ہم صدا ہو گئے اور ستارہ پرستوں سے کہنے لگے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ زہرہ ستارہ میرا پروردگار ہے، بہت اچھا چلو اسے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اس عقیدے کا انجام تمہارے سامنے پیش کروں - تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس ستارے کا چمکدار چہرہ افق کے تاریک پردے کے پیچھے چھپ گیا، یہ وہ مقام تھا کہ ابراہیم - کے ہاتھ میں ایک محکم ہتھیار آگیا اور وہ کہنے لگے میں تو کبھی ایسے معبود کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر ”ہذا ربی“ کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق یہ میرا خدا ہے، یا یہ کہ آپ نے بطور استفہام فرمایا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ اس سلسلے میں بھی ایک حدیث تفسیر نور الثقلین اور دیگر تفاسیر میں عیون اخبار

حضرت ابراہیم - کا توحید پر استدلال

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم - نے آفتاب و مہتاب اور ستاروں کے غروب ہونے سے ان کی ربوبیت کی نفی پر کس سے استدلال کیا؟
ممکن ہے کہ یہ استدلال تین طریقوں سے ہو:

۱۔ موجودات کا پروردگار اور مربی (جیسا کہ لفظ ”رب“ سے معلوم ہوتا ہے) ایسا ہونا چاہیے کہ جس کا مخلوقات کے ساتھ ہمیشہ قریبی ربط ہو کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اُن سے جدا نہ ہو، اس بناء پر وہ موجود جو غروب ہو جائے اور کئی ساعت تک اپنے نور و برکت کو ختم کیے رکھے اور بہت سے موجودات سے بالکل بیگانہ ہو جائے، ان کا پروردگار اور رب کس طرح ہو سکتا ہے؟

۲۔ وہ موجود جو غروب و طلوع کرنے والا ہے وہ قوانین کے چنگل کا اسیر ہے، وہ چیز جو خود ان قوانین کی محکوم ہے وہ ان پر حاکم اور ان کی مالک کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ خود ایک کمزور مخلوق ہے اور ان کے تابع فرمان ہے اور اُن سے انحراف اور تخلف کی کم سے کم توانائی بھی نہیں رکھتی۔

۳۔ جو موجود حرکت رکھتا ہے وہ یقیناً ایک حادث موجود ہے کیونکہ جیسا کہ فلسفہ میں تفصیل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ حرکت ہر مقام پر حدوث کی دلیل ہے کیونکہ حرکت خود ایک قسم کا وجود حادث ہے اور وہ چیز جو معرض حوادث میں ہے یعنی حرکت رکھتی ہے وہ ایک ازلی و ابدی وجود نہیں ہو سکتی۔ (غور کیجئے)۔

”کذا لک“ سے کیا مراد ہے۔؟

۱۔ زیر بحث آیت میں لفظ ”کذا لک“ (اسی طرح سے) اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح سے ہم نے ابراہیم کی عقل و خرد کے لیے بت پرستی کے مضرات و نقائص واضح کیے تھے اسی طرح سے آسمان و زمین پر خدا کی حکومت و مالکیت کی بھی ہم نے اُسے نشاندہی کرائی، بعض مفسرین نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تجھے اپنی قدرت و حکومت کے آثار آسمانوں پر دکھائے اسی طرح ابراہیم کو ہم نے دکھائے تھے تاکہ ان کے ذریعے وہ خدا سے زیادہ آشنا ہو جائے۔

”جن“ سے مراد

۲۔ ”جن“ (مادہ ”جن“ برون ”فن“ سے) کسی چیز کو چھپانے کے معنی میں ہے اور زیر بحث آیت میں جملہ کا معنی یہ ہے کہ ”جب رات نے ابراہیمؑ سے موجودات کا چہرہ چھپادیا اور“۔ اور یہ جو دیوانہ کو مجنون کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا ایک پردہ اس کی عقل پر پڑ گیا ہے اور نظر آنے والے موجود کو جو جن کہتے ہیں تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔ جنین بھی بچے کے شکم مادر میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے اور جنت کا اطلاق بہشت اور باغ پر بھی اسی بنا پر ہے کہ اس کی زمین درختوں کے نیچے چھپی ہوئی ہوتی ہے اور دل کو جنان (بروزن زمان) اسی لیے کہتے ہیں چونکہ وہ سینہ کے اندر پوشیدہ ہے، یا یہ کہ وہ انسان کے اسرار اور رازوں کو چھپائے رکھتا ہے۔

”کوکبا“ کونسا ستارہ مراد ہے؟

۳۔ یہ کہ ”کوکبا“ (ایک ستارہ) سے کونسا ستارہ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین نے زہرہ یا مشتری کا ذکر کیا ہے اور کچھ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانوں میں ستاروں کی پرستش کی جایا کرتی اور ”الہۃ“ (خداؤں) کا حصہ شمار ہوتی تھے لیکن اس حدیث میں جو امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے ”عیون الاخبار“ میں نقل ہوئی ہے کہ یہ تصریح ہوئی ہے کہ یہ زہرہ ستارہ تھا، تفسیر علی بن ابراہیمؑ میں بھی امام صادقؑ سے یہی بات مروی ہے۔^(۱)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کلدہ اور بابل کے لوگوں نے وہاں بت پرستوں کے ساتھ مقابلے اور مبارزے شروع کر رکھے تھے اور ہر ایک ستارے کو خالق یا کسی خاص موجودات کا رب النوع سمجھے تھے، ”مریخ“ کو رب النوع جنگ اور مشتری کو رب النوع عدل و علم اور عطارد کو رب النوع وزراء اور آفتاب کو سب کا پادشاہ سمجھے تھے۔^(۲)

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۳۵ و صفحہ ۷۳۷۔

۲۔ تفسیر ابوالفتوح جلد چہارم صفحہ ۴۶۷ (حاشیہ)۔

”بازغ“ سے مراد

۴۔ ”بازغ“ ”بزغ“ کے مادہ سے (بروزن نذر) ہے۔ یہ اصل میں شگاف کرنے اور خون جاری کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے حیوانات کی جراحی کو بزغ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا آفتاب یا ماہتاب کے طلوع پر اطلاق حقیقت میں ایک قسم کی خوبصورت تشبیہ ہے کیونکہ آفتاب و ماہتاب اپنے طلوع کے وقت گویا تاریکی کے پردے کو پھاڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں افق کے کنارے پر ایک ہلکی سی سرخی جو خون کے رنگ سے ملتی جلتی ہوتی ہے اپنے اطراف میں ایجاد کر لیتے ہیں۔

”فطر“ سے مراد

۵۔ ”فطر“ ”فطور“ کے مادہ سے شگاف کرنے اور پھاڑنے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۱۴ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس لفظ کا آسمان و زمین کی پیدائش پر اطلاق شاید اس سبب سے ہو کہ موجودہ زمانے کے علم کے مطابق ابتداء میں سارا عالم ایک ہی کرہ تھا اور بعد میں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے گئے اور آسمانی کرات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے گئے (مزید توضیح کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیا جائے)۔

۶۔ ”حنیف“ کا معنی

۶۔ ”حنیف“ کا معنی خالص ہے جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ آل عمران آیت ۶۷ کے ذیل میں جلد دوم تفسیر نمونہ ص ۳۲۹ (اردو ترجمہ) میں بیان ہو چکی ہے۔

آیات ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳

۸۰ ﴿وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِي وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾ --

۸۱ ﴿وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ -

۸۲ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ هُمُ الْآمَنُونَ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾ -

۸۳ ﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾ -

ترجمہ:

۸۰۔ اُس (ابراہیم) کی قوم نے اُس سے حجت بازی شروع کی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں حجت بازی کیوں کرتے ہو۔ حالانکہ خدا نے مجھے (واضح و لائل کے ساتھ) ہدایت کی ہے اور جسے تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو میں اُس سے نہیں ڈرتا۔ (اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا) مگر یہ کہ میرا پروردگار کچھ چاہے۔ میرے پروردگار کی آگاہی اور علم اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمام چیزوں پر حاوی ہے، کیا تم متذکر (اور بیدار) نہیں ہوتے۔

۸۱۔ میں تمہارے بتوں سے کس طرح ڈروں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے خدا کا ایسا شریک قرار دے لیا ہے کہ جس کے بارے میں اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی (سچ بتاؤ) ان دونوں گروہوں (بت پرستوں اور خدا پرستوں) میں سے کونسا گروہ (سزا سے) امن میں رہنے کے زیادہ لائق ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔

۸۲۔ ہاں ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، ان کا انجام امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۸۳۔ یہ ہمارے دلائل تھے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دیئے تھے۔ ہم جس شخص کے درجات کو چاہتے ہیں (اور اُسے لائق دیکھتے ہیں) اُوپر لے جاتے ہیں۔ تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

حضرت ابراہیم - کی بت پرست قوم و جمعیت سے بحث و گفتگو

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیم - کے توحیدی استدالات کے سلسلہ میں گزر چکی ہے، ان آیات میں اُسی بحث و گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم - کی بت پرست قوم و جمعیت سے ہوئی تھی۔ پہلے فرمایا گیا ہے: قوم ابراہیم ان کے ساتھ گفتگو اور کج بحثی کرنے لگی ﴿وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ﴾

ابراہیم - نے ان کے جواب میں کہا: تم مجھ سے خدائے یگانہ کے سلسلہ میں بحث اور مخالفت کیوں کرتے ہو حالانکہ خدا نے مجھے منطقی اور واضح دلائل کے ساتھ راہ توحید کی ہدایت کی ہے ﴿قَالَ أَتَحَاجُّونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ﴾۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم - کی قوم کے بت پرستوں کی جمعیت اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو سکے ابراہیم - کو اُن کے عقیدے سے پٹالیں اور بت پرستی کے آئین کی طرف کھینچ لیں۔ لیکن حضرت ابراہیم - انتہائی شجاعت و شہامت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے اور منطقی دلائل کے ساتھ سب کی باتوں کے جواب دیئے۔

یہ بات کہ وہ (بت پرست) کس منطق سے حضرت ابراہیم - کا مقابلہ کرتے تھے ان آیات میں صراحت کے ساتھ کوئی چیز بیان نہیں ہوئی لیکن حضرت ابراہیم - کے جواب سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ کو پانے خداؤں اور بتوں کے غیض و غضب اور سزا کی دھمکی دی اور ان کی مخالفت سے ڈرایا تھا، کیونکہ آیت کے آخر میں ہم حضرت ابراہیم - کی زبانی اس طرح پڑھتے ہیں: میں ہرگز تمہارے بتوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ اُن میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ کسی کو نقصان و ضرر پہنچا سکیں ﴿وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ﴾۔ کوئی شخص اور کوئی چیز مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر یہ کہ خدا چاہے ﴿إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا﴾۔^(۱)

گویا ابراہیم - اس جملے کے ذریعے یہ جاہتے ہیں کہ ایک اجتماعی پیش بندی کر لیں اور کہیں کہ اگر اس کشمش کے دوران بالفرض مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے، تو اس کا بتوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہوگا بلکہ اس کا تعلق مشیت الہی کے ساتھ ہوگا کیونکہ بے شعور و بے جان بت تو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں وہ کیا دوسرے کے نفع و نقصان کیا مالک ہوں گے؟

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: میرے پروردگار کا علم و دانش اس طرح ہمہ گیر و وسیع ہے کہ ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے ﴿وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾۔

یہ جملہ حقیقت میں سابقہ جملے کی ایک دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ بت ہرگز کوئی نفع یا نقصان پہنچا ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ کسی قسم کا علم و آگاہی نہیں رکھتے، اور نفع اور نقصان پہنچانے کی پہلی شرط علم و شعور اور آگاہی ہے۔ صرف وہ خدا کے جس کے علم و دانش نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے وہی سود و زیاں بھی پہنچا سکتا ہے، تو پھر میں اُس کے غیر کے غیض و غضب سے کیوں ڈروں۔

آخر میں اُن کے فکر و فہم کو بیدار کرنے کے لیے، اُنہیں مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: کیا ان تمام باتوں کے باوجود بھی تم متذکر اور بیدار نہیں ہوتے ﴿أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک اور منطق و استدلال کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ بت پرست گروہ سے کہتے ہیں: ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں بتوں سے ڈروں اور تمہاری دھمکیوں کے مقابلہ میں اپنے اندر وحشت اور خوف پیدا کر لوں حالانکہ مجھے تو ان بتوں میں عقل و شعور اور قدرت کی کسی قسم کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی، لیکن تم باوجود اس کے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہو اور اس کی قدرت اور علم کو بھی جانتے ہو اور اُس نے کسی قسم کا کوئی حکم بتوں کی پرستش کے بارے میں تمہاری طرف نازل نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود تم تو اُس سے نہیں ڈرتے، تو میں بتوں کے غضب سے کس طرح ڈروں ﴿وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا﴾ (۲)۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بت پرست ایسے خدا کے منکر نہ تھے جو آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تو صرف بتوں کو عبادت میں شریک کرتے تھے اور انہیں درگاہ خداوندی میں شفیع خیال کرتے تھے۔

اب تم ہی انصاف کرو کہ میں امن و امان کا زیادہ حقدار ہوں یا تم ﴿فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾۔ حقیقت میں اس مقام پر ابراہیمؑ کی منطق ایک عقلی منطق ہے جو اس واقعیت کی بنیاد پر قائم ہے کہ تم مجھے بتوں کے غضب ناک ہونے کی دھمکی دے رہے ہو۔ حالانکہ ان کے وجود کی تاثیر موہوم ہے، لیکن تم اُس عظیم خدا سے بالکل نہیں ڈرتے جسے تم اور میں دونوں قبول کرتے ہیں اور ہمیں اُس کے حکم کا پیرو ہونا چاہیے اور اس کی طرف سے بتوں کی پرستش کا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ تم نے ایک قطعی و یقینی امر کو تو چھوڑ رکھا ہے اور ایک موہوم چیز کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اُس سوال کا جواب نقل ہوا ہے جو خود انہوں نے قبل کی آیت میں پیش کیا تھا (اور علمی استدالات میں یہ ایک عمدہ طریقہ ہے کہ بعض اوقات استدلال کنندہ شخص مد مقابل کی طرف سے سوال

کر کے پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا واضح ہے کہ جس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے)۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم و ستم کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، امن و امان بھی انہی کے لیے ہے اور ہدایت بھی انہی کے ساتھ مخصوص ہے ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾۔

اُس روایت میں بھی جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی بت پرستوں کے ساتھ گفتگو کا ضمیمہ ہے۔^(۳)

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ خدا کا بیان ہو گا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو۔ لیکن پہلا احتمال علاوہ اس کے کہ یہ روایت میں وارد ہوا ہے، آیات کی وضع و ترتیب کے ساتھ بھی زیادہ بہتر مطابقت رکھتا ہے لیکن یہ احتمال کہ یہ جملہ بت پرستوں کی گفتگو ہو جو حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سننے کے بعد بیدار ہوئے ہوں بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

۱۔ حقیقت میں اوپر والا استثناء، استثناء منقطع سے شبہت رکھتا ہے، کیونکہ بتوں سے نفع و نقصان کی قدرت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے اور خدا کے لیے ثابت ہے۔ اگرچہ اس جملے کے معنی میں اور مفسرین نے اور احتمال بھی ذکر کیے ہیں، لیک جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ سلطان کا معنی برتری و کامیابی ہے اور چونکہ دلیل و برہان کامیابی کا سبب ہوتی ہے لہذا بعض اوقات اُسے بھی سلطان کہتے ہیں اور اوپر والی آیت اسی معنی میں ہے۔ یعنی بتوں کی پرستش کی اجازت کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور حقیقت میں یہ ایسا مطلب ہے جس کا کوئی بت پرست انکار نہیں کر سکتا کیونکہ اس قسم کا حکم عقل یا وحی و نبوت کے ذریعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی دلیل موجود نہیں ہے۔

۳۔ تفسیر مجمع البیان ذیل آیہ زیر بحث۔

یہاں ظلم سے کیا مراد ہے؟

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں ”ظلم“ شرک کے معنی میں ہے۔ سورہ لقمان (کی آیہ ۱۳) میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ ”﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾“ (شرک ظلم عظیم ہے) کو اس معنی کا شاہد قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں بھی ابن مسعود سے یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت یہ (زیر بحث) آیت نازل ہوئی، تو یہ بات لوگوں کو بہت گمراہ معلوم ہوئی۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول ایسا کون ہے کہ جس نے اپنے اوپر تھوڑا بہت ظلم نہ کیا ہو (لہذا یہ آیت تو سبھی کو شامل کر لیتی ہے)

رسول اللہ نے فرمایا: جو تم نے خیال کیا ہے اس سے وہ مراد نہیں ہے۔ کیا تم نے خدا کے صالح بندے (لقمان کا) قول نہیں سنا (جو اپنے بیٹے سے) کہتا ہے ”میرے بیٹے خدا کا شریک قرار نہ دے کہ شرک، ظلم عظیم ہے“۔^(۱)

لیکن چونکہ قرآن کی آیات بہت سے مواقع پر دو یا دو سے زیادہ معانی کی حامل ہوتی ہیں لہذا ممکن ہے کہ اُن میں سے ایک معنی دوسرے معنی سے زیادہ وسیع اور عمومی ہو تو آیت میں یہ احتمال بھی ہے کہ ”انیت“ سے مراد عام انیت ہے خواہ خدا کے عذاب سے امن و امان ہو یا اجتماعی دردناک حوادث سے امن و امان ہو۔

یعنی جنگیں ایک دوسرے پر زیادتیاں، مفسد اور جرائم سے امان، یہاں تک کہ روحانی سکون و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کہ انسانی معاشرے میں دو اصولوں کی حکمرانی ہو، اول ایمان اور دوسرے عدالت اجتماعی، اگر خدا پر ایمان کی بنیادیں ہل جائیں اور پروردگار کے سامنے جوابدہی کا احساس ختم ہو جائے اور عدالت اجتماعی کی جگہ ظلم و ستم کا دورہ ہو، تو ایسے معاشرے میں ان و امان ختم ہو جائے گا اور یہی سبب ہے کہ دنیا کے بہت سے مفکرین کی طرف سے دنیا میں بد امنی کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود دنیا کے لوگوں کا واقعی امن و امان سے دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، اس کیفیت کا سبب وہی ہے کہ طرف زیر نظر آیت میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور عدالت کی جگہ ظلم کا دور دورہ ہے۔

خاص طور پر روحانی امن و سکون میں ایمان کی تاثیر سے تو کسی کے لیے بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسا کہ ارتکاب ظلم سے وجدان کی پریشانی اور روحانی امن و سکون کا چھن جانا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ زیر بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق اُمت اسلامی کی ولایت و رہبری کے سلسلے میں آپ کے بعد ایمان لے آئیں اور اُسے دوسرے لوگوں کی ولایت و رہبری کے ساتھ مخلوط نہ کریں تو وہ امن و امان میں ہیں۔ (۲)

یہ تفسیر حقیقت میں آیہ شریفہ میں موجود مطلب کی روح اور نچوڑ پر نظر رکھتے ہوئے بیان ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں خدا کی ولایت و رہبری کے متعلق گفتگو ہے اور اُسے اُس کے غیر کی رہبری کے ساتھ خلط ملط نہ کرنے کے سلسلہ میں ہے اور چونکہ حضرت علی علیہ السلام کی رہبری آیہ ”﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾“ کے اقتضا کے مطابق خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری کا پر تو ہے اور خدا کی طرف سے معین نہ ہونے والی رہبریاں ایسی نہیں ہیں لہذا اوپر والی آیت ایک وسیع نظر سے ان سب پر محیط ہوگی، اس بناء پر اس حدیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم اسی معنی میں منحصر ہے، بلکہ یہ تفسیر آیت کے اصلی مفہوم کا پر تو ہے۔

اسی لیے ہم حضرت امام صادق علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث میں پڑھتے ہیں کہ یہ آیت خوارج جو ولی خدا کی ولایت سے نکل گئے تھے اور شیطان کی ولایت و رہبری میں چلے گئے تھے، کے بارے میں بھی ہے۔ (۳)

بعد والی آیت اُن تمام بحثوں کی طرف۔ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے توحید کے بیان اور شرک کے خلاف مبارزہ و مقابلہ کے سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ ہمارے وہ دلائل تھے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم و جمعیت کے مقابلہ میں دیئے تھے ﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ﴾۔

یہ صحیح ہے کہ اس استدلال میں منطقی پہلو بھی تھا اور ابراہیمؑ - عقلی قوت اور فطری الہام کی بنا پر اُن تک پہنچے تھے لیکن چونکہ یہ قوت عقل اور وہ الہام فطرت سب خدا کی ہی طرف سے تھے، لہذا خدا ان تمام استدلالات کو اپنی نعمات میں سے شمار کر رہا ہے کہ جو ابراہیمؑ کے دل جیسے آمادہ دلوں میں منعکس ہوتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”تلك“ عربی زبان میں بعید کے لیے اسم اشارہ ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع کی اہمیت، اور اس کا بلند پایہ ہونا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ایک نزدیک کا موضوع بھی اسم اشارہ بعید سے ذکر ہو، جس کی مثال سورہ بقرہ کی ابتداء میں ہے: ”﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾“۔

”یہ عظیم کتاب وہ ہے کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔“

پھر اس بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا یا ہے: ہم جس کے درجات کو چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں ﴿نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ

نَسَاءٍ﴾۔ (۴)

لیکن اس غرض سے کہ کوئی اشتباہ واقع نہ ہو۔ کہ لوگ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ خدا اس درجے کے بلند کرنے میں کسی تبعیض سے کام لیتا ہے، قرآن فرماتا ہے: تیرا پروردگار حکیم اور عالم ہے اور وہ درجات عطا فرماتا ہے وہ ان کی لیاقت و قابلیت سے آگاہی اور میزان حکمت کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جب تک کوئی شخص لائق اور قابل نہ ہو اُس سے بہرہ مند نہیں ہوگا ﴿إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۴۰۔

۳۔ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۳۸۔

۴۔ ”درجہ“ کے بارے میں اور اس کے اور ”درک“ کے درمیان فرق کے بارے میں ہم سورہ نساء آیہ ۱۴۵ جلد چہارم صفحہ ۱۴۸ میں بحث کر چکے ہیں۔

آیات ۸۲، ۸۵، ۸۶، ۸۷

۸۴ ﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ -

۸۵ ﴿وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِيلَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ -

۸۶ ﴿وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيُونُسَ وَلُوطًا كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ -

۸۷ ﴿وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ -

ترجمہ:

۸۴۔ ورہم نے اُسے (ابراہیم - کو) اسحاق و یعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو ہدایت کی، اور نوح کو (بھی) ہم نے (ان سے) پہلے ہدایت کی تھی، اور اس کی ذریت و اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (ہم نے ہدایت کی) اور ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے جزا دیتے ہیں۔

۸۵۔ اور (اسی طرح) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس سب صالحین میں سے تھے۔

۸۶۔ اور اسماعیل، الیسع، یونس اور ہر ایک کو ہم نے عالمین پر فضیلت دی۔

۸۷۔ اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کی۔

نعمت ہے صالح اولاد اور آبرو مند اور لائق نسل

ان آیات میں اپنی نعمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیم - کو عطا کی تھیں اور وہ نعمت ہے صالح اولاد اور آبرو مند اور لائق نسل جو نعمات الہی میں سے ایک عظیم ترین نعمت ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ابراہیم - کو اسحاق اور (فرزند اسحاق) عطا کیے (وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ)۔ اور اگر یہاں ابراہیم - کے دوسرے فرزند اسماعیل کی طرف اشارہ نہیں ہوا، بلکہ بحث کے دوران کہیں ذکر آیا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اسحاق کا سارہ جیسی بانجھ ماں سے پیدا ہونا، وہ بھی بڑھاپے کی عمر میں، بہت عجیب و غریب امر اور ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

پھر اس چیز کو بیان کرنے کے لئے کہ ان دونوں کا افتخار صرف پیغمبر زادہ ہونے کے پہلو سے نہیں تھا، بلکہ وہ ذاتی طور پر بھی فکر صحیح اور عمل صالح کے سائے میں نور ہدایت کو اپنے دل میں جاگزین کیے ہوئے تھے، قرآن کہتا ہے: ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت کی ﴿كُلًّا هَدَيْنَا﴾۔

اس کے بعد یہ بتانے کے لئے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ ابراہیم - سے قبل کے دور میں کوئی علم بردارِ توحید نہیں تھا اور یہ کام بس انہی کے زمانے سے شروع ہوا ہے مزید کہتا ہے: اس سے پہلے ہم نے نوح کی بھی ہدایت و رہبری کی تھی ﴿وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ﴾۔

اور ہم جانتے ہیں کہ نوح - پہلے اولو العزم پیغمبر ہیں جو آئین و شریعت کے حامل تھے اور وہ پیغمبرانِ اولو العزم کے سلسلے کی کڑی تھے۔

حقیقت میں حضرت نوح - کی حیثیت اور ان تمام کی طرف اشارہ کر کے کہ جو حضرت ابراہیم - کے اجداد میں سے ہیں ، اور اسی طرح پیغمبروں کے اس گروہ کے مقام کا تذکرہ کر کے کہ جو ابراہیم - کی اولاد اور ذریت میں سے تھے، حضرت ابراہیم - کی ممتاز حیثیت کو دراثت، اصل اور ثمرہ کے حوالے سے مشخص کیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد بہت سے انبیاء کے نام گنوائے ہیں جو ذریتِ ابراہیم - میں سے تھے، پہلے ارشاد ہوتا ہے: ابراہیم کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، موسیٰ اور ہارون تھے ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ﴾ اور اس جملے کے ساتھ کہ: ”اس قسم کے نیکوکار لوگوں کو ہم جزا دیں گے“ واضح کرتا ہے کہ ان کا مقام و حیثیت ان کے اعمال و کردار کی بنا پر تھا ﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾۔

اس سلسلے میں کہ ”﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ﴾“ (اس کی اولاد میں سے) کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے، ابراہیم - کی طرف یا نوح - کی طرف، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین ابراہیم - کی طرف لوٹاتے ہیں اور ظاہراً اس بات کی تردید نہیں کرنا چاہیے کہ مرجع ضمیر ابراہیم - ہیں کیونکہ آیت کی بحث ان خدائی نعمات کے بارے میں ہے جو ابراہیم - کی نسبت سے ہوئی تھیں نہ کہ حضرت نوح - کے بارے میں۔ علاوہ ازیں اُن متعدد روایات میں سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، جنہیں ہم بعد میں نقل کریں گے۔

صرف ایک مطب اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین نے ضمیر کو نوح- کی طرف لوٹایا ہے اور وہ ہے بعد کی آیات میں حضرت یونس- اور حضرت لوط- کا نام، کیونکہ تواریخ میں مشہور یہ ہے کہ یونس- حضرت ابراہیم- کی اولاد میں سے نہیں تھے اور لوط- بھی حضرت ابراہیم- کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔

لیکن یونس- کے بارے میں تمام مورخین میں اتفاق نہیں ہے، بعض انھیں بھی اولاد ابراہیم- میں سے سمجھتے ہیں^(۱) اور بعض انھیں انبیاء بنی اسرائیل میں سے شمار کرتے ہیں^(۲)

علاوہ ازیں عام طور پر مورخین نسب کی باپ کی طرف سے حفاظت کرتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت یونس- کا بھی حضرت عیسیٰ- کا بھی حضرت عیسیٰ کی طرح کہ جن کا نام درج بالا آیات میں ہے کا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم- تک پہنچتا ہو۔

باقی رہے لوط تو وہ اگرچہ ابراہیم- کے فرزند نہیں تھے لیکن ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں سے تھے، تو جس طرح عربی زبان میں بعض اوقات ”چچا“ کو ”اب“ (باپ) کہا جاتا ہے اسی طرح بھتیجے اور بھانجے پر بھی ”ذیت“ اور فرزند کا اطلاق ہوتا ہے، اس طرح سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ظاہر آیات سے دست بردار ہو جائیں جو کہ ابراہیم- کے بارے میں ہیں اور ضمیر کو نوح- کی طرف پلٹادیں جو یہاں موضوع سخن بھی نہیں ہیں۔

بعد کی آیت میں زکریٰ-، یحییٰ، عیسیٰ- اور الیاس کا نام لیا گیا ہے اور مزید کہا گیا ہے کہ یہ سب صالحین میں سے تھے۔ یعنی ان کا مقام و منزلت تشریفاتی اور اجباری پہلو نہیں رکھتا تھا بلکہ انھوں نے عمل صالح کے ذریعہ بارگاہ خداوندی میں عظمت و بزرگی حاصل کی تھی ﴿وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾۔

بعد الی آیت میں بھی چار اور پیغمبروں اور خدائی رہنماؤں کے نام آئے ہیں اور فرمایا گیا ہے: اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط بھی، اور سب کو ہم نے عالمین پر فضیلت عطا کی (وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ)۔ اس بارے میں الیسع کس قسم کا نام ہے اور پیغمبروں میں سے کون سے پیغمبر کی طرف اشارہ ہے مفسرین اور ادباء عرب کے درمیان اختلاف ہے بعض اسے ایک عبرانی نام سمجھتے ہیں جو اصل میں یوشع تھا اس کے بعد اس پر الف لام داخل ہوئے اور شین، سین سے تبدیل ہو گئی اور بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ایک عربی نام ہے اور ”یسع“ سے لیا گیا ہے (جو وسعت کا فعل مضارع ہے)۔ یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اسی صورت میں گذشتہ انبیاء میں سے کسی نبی کا نام تھا بہر حال وہ جناب بھی نسل ابراہیم- میں سے ایک پیغمبر ہیں۔

اور آخری آیت میں مذکورہ انبیاء کے صالح آباؤ اجداد، اولاد اور بھائیوں کی طرف کہ جن کے نام یہاں پر تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے ایک کلی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے فضیلت دی، انھیں برگزیدہ کیا اور راہ راست کی ہدایت کی ﴿وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾۔

۱۔ تفسیر آلوسی، ج ۷، ص ۱۸۴۔

۲۔ دائرة المعارف فرید وجدی، ج ۱۰، ص ۱۰۵۵ (ذیل مادہ یونس)

چند قابل توجہ امور

۱۔ فرزندانِ پیغمبر۔ اوپر والی آیات میں حضرت عیسیٰ - کو فرزندانِ ابراہیم - (اور ایک احتمال کی بنا پر فرزندانِ نوح) میں سے شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ جنابِ صرفِ ماں کی طرف سے ابراہیم - کی طرف منسوب ہوتے ہیں

یہ بات اس امر کی دلیل سے پوتے اور نواسے دونوں ہی انسان کی ذریت اور فرزند شمار ہوتے ہیں۔

اسی سبب سے آئمہ اہل بیت - کو جو سب کے سب بیٹی کی طرف سے پیغمبر اکرم تک پہنچتے ہیں ”ابناء رسول اللہ“ (فرزندانِ رسول -) کہا جاتا ہے۔

اگرچہ زمانہ جاہلیت میں جب کہ عورت کی کوئی اہمیت نہیں تھی نسب کو صرف باپ کی طرف سے سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اس جاہلانہ فکر پر قلم بطلان پھیر دیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے بعض قلم نگار جو آئمہ اہل بیت - کے ساتھ صحیح لگاؤ نہیں رکھتے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس امر کا انکار کریں اور ابن رسول اللہ کہنے سے اجتناب کریں اور سننِ جاہلیت کو زندہ کریں۔

اتفاق سے یہ موضوع خود آئمہ - کے مانہ میں پیدا ہو چکا تھا اور انھوں نے اسی آیت کے ساتھ کہ جو ایک دندان شکن دلیل ہے، انھیں جواب دیا۔

منجملہ اُن کے کتابِ کافی اور تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ - نے فرمایا: خداوند عالم نے قرآن میں حضرت عیسیٰ - کا نسب جو کہ ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم - تک پہنچتے تھے ذریت (اولاد) کی اولاد کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

پھر آپ - نے آیہ ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ﴾ کو آخر تک اور بعد کی آیت کو لفظ عیسیٰ - تک تلاوت فرمایا۔

تفسیر عیاشی میں بھی ابوالاسود سے مروی ہے وہ کہتا ہے:

ایک دن حجاج نے کسی کو یحییٰ بن معمر کے پاس بھیجا جو خاندانِ رسالت سے محبت رکھتا تھا (اور اُس سے پوچھا) کہ میں نے سنا ہے کہ تو حسن - و حسین - کو فرزندانِ رسول سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں آیات قرآن سے استدلال کرتا ہے، حالانکہ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے مجھے تو کوئی ایسی آیت نہیں ملی، یحییٰ بن معمر نے اس کے جواب میں کہا

کہ کیا تو نے سورہ انعام کی وہ آیت پڑھی ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ---وَيَحْيَىٰ وَعِيسَى﴾ اس نے کہا کہ ہاں میں نے پڑھی ہے تو اس نے کہا کہ کیا ان آیات میں حضرت عیسیٰ - کو ذریت ابراہیم - میں شمار نہیں کیا گیا ہے حالانکہ وہ باپ کی طرف سے اُن تک نہیں پہنچتے تھے۔

”عیون الاخبار“ میں ایک طویل حدیث ہے جس میں امام موسیٰ - بن جعفر - کی ہارون الرشید اور موسیٰ بن مہدی سے گفتگو منقول ہے جس میں ہے:

اُس (ہارون) نے امام کاظم علیہ السلام سے کہا کہ تم لوگ کس طرح کہتے ہو کہ ہم ذریت پیغمبر ہیں حالانکہ پیغمبر کا کوئی بیٹا تو نہیں تھا اور نسل بیٹے سے چلتی ہے نہ کہ بیٹی سے اور تم اُن کی بیٹی کی اولاد ہو، امام علیہ السلام نے جواب میں اس سے فرمایا کہ اس سوال کو رہنے دے لیکن ہارون نے اصرار کیا اور کہا کہ میں کسی طرح بھی اس سوال سے صرفِ نظر نہیں کروں گا کیونکہ تم لوگ عقیدہ رکھتے ہو کہ سب کچھ قرآن مجید میں موجود ہے لہذا اس بارے میں قرآن کی کوئی آیت دکھائیے، امام علیہ السلام نے فرمایا:

”اعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم ﴿وَمِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ، وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَى﴾ -

اس کے بعد آپ - نے سوال کیا: اے ہارون! عیسیٰ - کا باپ کون تھا؟ اُس نے کہا: عیسیٰ - کا تو کوئی باپ نہیں تھا۔ فرمایا: تو اس بنا پر اگر وہ انبیاء کی ذریت سے ملحق ہیں تو مریم کی طرف سے ہیں، ہم بھی رسولِ خدا کی ذریت میں اپنی ماں فاطمہ - کے ذریعہ سے ملحق ہیں^(۱)

یہ بات خاص طور پر توجہ ہے کہ بعض متعصب سنی مفسرین نے بھی یہ موضوع اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک فخر الدین رازی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے:

”یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسن - و حسین - ذریت پیغمبر ہیں کیونکہ خدا ہے عیسیٰ - کو ذریت ابراہیم - میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ صرف ماں کی طرف سے ان (حضرت ابراہیم -) سے تعلق رکھتے ہیں^(۲)

تفسیر ”المنار“ کا مولف بھی جو بعض مخصوص مذہبی مباحث میں فخر رازی سے کم متعصب نہیں ہے، فخر رازی کی اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:

”اس باب میں ایک حدیث حضرت ابوبکر سے بھی صحیح بخاری میں پیغمبر سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے امام حسن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ“ ”میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے“

یعنی آپ نے ”میرا بیٹا“ کے لفظ کا امام پر اطلاق فرمایا حالانکہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے نزدیک لفظ ابن (بیٹا) کا بیٹی کی اولاد پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ اسی بنا پر لوگ اولاد فاطمہ - کو اولاد رسول اور عترت و اہل بیت - رسول جانتے تھے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اولاد کی اولاد بیٹی کی ہو یا بیٹے کی انسان کی اولاد شمار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی یہ تفریق ہمارے پیغمبر کے خصوصیات میں سے ہے اور اس مسئلہ کا مخالفت کا سرچشمہ سوائے تعصب یا زمانہ جاہلیت کے افکار کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے تمام احکام اسلام میں ازدواج، ارث وغیرہ کے قبیل سے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ مسئلہ خمس ہے، جو سیادت کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک خاص جہت سے جو فقہ کی کتاب خمس میں بیان ہوئی ہے اس موضوع کا استثناء ہوا ہے۔

۲۔ ان پیغمبروں کے نام تین حصوں میں کیوں بیان ہوئے؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ پہلا گروہ یعنی داؤد، سلیمان، ایوب، موسیٰ اور ہارون، یہ چھ افراد ان پیغمبروں میں سے تھے جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ حکومت و سلطنت بھی رکھتے تھے، اور شاید جملہ ”وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ“ جو ان کے ناموں کے ذکر کے بعد آیا ہے ان فراواں نیکیوں کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اپنی اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں پر کی تھیں۔

لیکن دوسرا گروہ یعنی زکری، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس - اپنی انبیاء میں سے ہیں کہ جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ زہد و تقویٰ میں اعلیٰ نمونہ تھے ”كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ“ کا جملہ اُن کے اسمائے گرامی کے بعد ہو سکتا ہے کہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔

اور تیسرا گروہ (کے انبیاء) یعنی اسماعیل، الیسع، یونس - اولوط - یہ امتیاز رکھتے تھے کہ انھوں نے بڑی بڑی ہرچہیں کیں اور دین خدا کو محکم کرنے کے لیے ہجرت کے پروگرام کو عملی شکل دی اور جملہ ”كَلَّا فَضْلَنَا عَلَى الْعَالَمِينَ“ کا ذکر بھی (اس قول کی بنا پر کہ اس میں جملہ میں انہی چار افراد کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ان تمام پیغمبروں کی طرف کہ جن کا ذکر ان تین آیات میں آیا ہے) ہو سکتا ہے کہ اُن کے مختلف قوموں اور دنیا جہاں کے لوگوں کے درمیان سیر کی طرف اشارہ ہو۔

۳۔ انسان کی شخصیت کے تعارف میں صالح اور نیک اولاد کی اہمیت: ایک دوسرا موضوع جو زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے یہی مسئلہ ہے کیونکہ خدا شجاع و بت شکن ابراہیمؑ کے مقام والا کے تعارف کے لیے عالم انسانیت کی عظیم شخصیتوں کا جو آپ کی اولاد میں سے مختلف زمانوں میں عالم وجود میں آئی تھیں شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے، اس طور پر کہ ان ۲۵ انبیاء میں سے کہ جن کے نام سالم قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان آیات میں ۱۶ نام ابراہیمؑ کے فرزندوں اور وابستگان کے ہیں اور ایک نام اُن کے اجداد میں سے آیا ہے اور یہ حقیقت میں عام مسلمانوں کے لیے ایک عظیم درس ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ ان کی اولاد اور عزیزوں کی شخصیت ان کی شخصیت کا جزء شمار ہوتی ہے لہذا اُن سے مربوط تربیتی اور انسانی مسائل بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

۴۔ ایک اعتراض کا جواب: ممکن ہے کہ کچھ لوگ آخری آیت سے، جو یہ کہتی ہے کہ ہم نے ان کے بعض آباء اجداد اور اولاد اور بھائیوں کو برگزیدہ کیا اور انھیں راہ راست کی ہدایت کی، یہ سمجھا کریں کہ انبیاء کے آباء اجداد سب کے سب یا ایمان افراد نہیں تھے اور اُن میں غیر موحد بھی ہیں، جیسا کہ بعض مفسرین اہل سنت نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”اجتینا ہم و ہدینا ہم“ سے مراد اس تعبیر کے قرینہ سے کہ جو اسی سلسلہ آیات میں موجود ہے، مقام نبوت و رسالت ہے، یہ مشکل حل ہو جاتی ہے یعنی آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہم نے اُن میں سے بعض کو مقام نبوت کے لیے برگزیدہ کیا۔ اور یہ باقی دوسروں کے موحد و خدا پرست ہونے کی نفی نہیں ہے۔ اس سورہ کی آیت ۹۰ میں بھی (جو اس آیت سے چند آیات بعد کی آیت ہے) ہدایت کا اطلاق مقام نبوت پر ہوا ہے^(۲)

۱۔ نور الثقلین، ج ۱، ص ۷۴۳۔

۲۔ تفسیر فخر رازی، ج ۱۳، ص ۶۶۔

۳۔ ترکیب کے لحاظ سے ”من آباء ہم“، ”جارو و مجرور“ ہے کہ جس کا متعلق یا تو لفظ ”فضلنا“ ہے جو قبل کی آیت میں ذکر ہوا ہے، یا محذوف ہے اور بعد کا حصہ اس محذوف پر دلالت کرتا ہے اور اصل می اس طرح تھا: ”اجتینا ہم من آباء ہم“ ضمناً توجہ رکھنا چاہیے کہ اوپر والی آیت میں ”من“ تبعیضیہ ہے۔

آیات ۸۸، ۸۹، ۹۰

۸۸ ﴿ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

۸۹ ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَیْسُوا بِكَافِرِينَ﴾۔

۹۰ ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ افْتَدَاهِ قُلْ لَأَسْأَلَنَّكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْعَالَمِينَ﴾۔

ترجمہ:

- ۸۸۔ یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کی ہدایت کرتا ہے اور اگر وہ مشرک ہو جائیں تو انھوں نے جو کچھ عمل کیا تھا وہ سب کا سب (ضائع اور) نابود ہو جائے گا۔
- ۸۹۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم و نبوت عطا کی ہے اور اگر وہ اس کا انکار کریں اور کافر ہو جائیں تو (کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ) ہم نے ایسے لوگوں کو اس کا نگہبان بنایا ہے کہ جو اُس کا کفر و انکار کرنے والے نہیں ہیں۔
- ۹۰۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے پس تم ان کی ہدایت کی اقتدا (ویسروی) کرو (اور) یہ کہو کہ میں اس (رسالت و تبلیغ) کے بدلے میں تم سے کوئی اجر اور بدلہ نہیں مانگتا یہ رسالت تو عالمین کے لیے ایک یاد دہانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

تین اہم امتیاز

گذشتہ آیات میں خداوند تعالیٰ پیغمبروں کے مختلف گروہوں کے ناموں کے ذکر کے بعد یہاں ان کی زندگی کے کلی اور اصلی خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت و رہبری کرتا ہے ﴿ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾۔ یعنی اگرچہ وہ صالح اور نیک لوگ تھے اور عقل و فکر کی قوت اور اپنے تمام وجود کے ساتھ ہدایت کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے لیکن پھر بھی اگر توفیق الہی ان کے شامل حال نہ ہوتی اور اس کی مہربانی کا ہاتھ ان کی دستگیری کرتے ہوئے انھیں سہارا نہ دیتا تو ان سب کے بارے میں بھی اور ہر شخص کے لیے لغزش کا امکان موجود تھا اور موجود ہے۔ پھر اس بنا پر کہ کہیں یہ تصور نہ کیا جائے کہ انھوں نے اس راہ میں مجبوراً قدم اٹھایا ہے اور اسی طرح کوئی یہ تصور بھی نہ کرے کہ خداوند تعالیٰ ان کے بارے میں

ایک استثنائی اور بغیر دلیل اور وجہ کے کوئی خاص نظر رکھتا تھا فرماتا ہے: اگر فرض کریں کہ یہ پیغمبر اس مقام و حیثیت کے باوجود جو وہ رکھتے تھے مشرک ہو جاتے تو ان کے تمام اعمال جبط ہو جاتے ﴿وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحِطَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔
یعنی اُن کے لیے بھی وہی قوانین الہی جاری ہیں جو دوسروں کے بارے میں جاری ہوتے ہیں اور کوئی استثناء کسی کے لئے نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں تین اہم امتیازات و خصوصیات کی طرف جو انبیاء کے تمام امتیازات کی بنیاد ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ ایسے لوگ تھے کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب عطا کی اور مقام حکم بھی اور نبوت بھی ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ﴾۔

البتہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سب صاحب کتاب تھے بلکہ چونکہ گفتگو ان سب کے متعلق ہو رہی ہے لہذا اجتماعی طور پر سب کی طرف نسبت دی گئی ہے اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کتاب میں علماء اور ان کی کتب کا تعارف کرایا گیا ہے، یعنی ان کی کتب کہ جنہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔
ضمنی طور پر اس بارے میں کہ ”حکم“ سے کیا مراد ہے تین احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ حکم کا مفہوم:

یہ لفظ یہاں عقل و فہم و ادراک کے معنی میں ہے یعنی اس کے علاوہ کہ ہم نے انہیں آسمانی کتاب دی ہے اس کو سمجھنے کی قدرت بھی انہیں بخشی ہے کیونکہ کتاب کا وجود قوی و کامل ادراک و فہم کے بغیر کوئی اثر نہیں رکھتا۔

۲۔ منصب قضاوت:

یعنی وہ اُن آسمانی قوانین کے سائے میں جو کتاب الہی میں تھے، لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکتے تھے اور اُن سب میں ایک قاضی اور دادرس عادل کی تمام شرائط کامل طور پر موجود تھیں۔

۳۔ حکومت و سلطنت:

کیونکہ وہ مقام نبوت و رسالت کے علاوہ مقام حکومت کے بھی حامل تھے۔
اوپر والے تمام معانی کا شاہد۔ اس کے علاوہ کہ حکم کا لغوی معنی ان تمام معانی پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں بھی حکم ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے^(۱)

اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت میں لفظ حکم ایک جامع معنی میں کہ جس میں تینوں اُپر والے مفہوم موجود ہوں، استعمال ہوا ہو کیونکہ حکم اصل میں جیسا کہ راغب ”مفردات“ میں کہتا ہے منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور چونکہ عقل اشتباہات اور غلط کاریوں سے روکتی ہے، اسی طرح صحیح قضاوت و فیصلہ کرنا ظلم و ستم کرنے سے منع کرتا ہے اور عادل حکومت دوسروں کی ناروا و ناجائز حکومتوں کو روک دیتی ہے (لہذا لفظ حکم) ان تینوں (معانی) میں سے ہر ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام انبیاء ان تمام مقامات کے حامل نہیں تھے۔ لیکن جب ایک گروہ کچھ احکام کی نسبت دی جائے، تو یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے تمام افراد ان تمام احکام کے حامل ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان احکام میں سے فقط بعض احکام کے ہی حامل ہوں۔ لہذا کتابِ آسمانی کا موضوع جو صرف مذکورہ و معدودے چند انبیاء کے بارے میں تھا، مندرجہ بالا آیت کے سمجھنے میں ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر یہ گروہ یعنی مشرکین، اہل مکہ اور ان جیسے لوگ ان حقائق کو قبول نہ کریں تو تیری دعوت جواب کے بغیر نہیں رہے گی کیونکہ ہم نے ایک گروہ کو اس امر پر مامور کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اُسے قبول کریں بلکہ اس کی حفاظت و نگہبانی بھی کریں۔ وہ ایسا گروہ ہے کہ جو (ایمان لانے کے بعد) کفر کے راستے پر گامزن نہ ہوں گے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم رکھیں گے ﴿فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ﴾۔

تفسیر ”المنار“ اور تفسیر ”روح المعانی“ میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے کہ اس جماعت سے مراد ایرانی ہیں (کہ جنہوں نے بہت جلدی اسلام قبول کیا اور اس کی پیش رفت میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ کوشاں رہے اور ان کے علماء اور دانشمندوں نے مختلف اسلامی فنون میں بہت زیادہ کتابیں لکھی ہیں)۔^(۲)

آخری آیت میں ان جزرگ پیغمبروں کے پروگرام (اور کارناموں) کو ہدایت کے ایک اعلیٰ نمونے کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعارف کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ ہدایت الہی جن کے شامل حال تھی لہذا تم بھی ان کی ہدایت کی اقتداء کرو ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ أَقْتَدِهِ﴾۔^(۳)

یہ آیت دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ تمام پیغمبروں کا اصول دعوت ایک ہی ہے۔ اگرچہ خصوصیات کے لحاظ سے مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات کے تناسب سے احکام فرق رکھتے تھے اور بعد کے دین و آئین قبل کے ادیان سے کامل تر ہوتے رہے اور علمی و ترتیبی کلاسیں اپنے انتہائی درجے تک کہ جو آخری کورس تھا یعنی اسلام تک پہنچی ہیں۔

اس بارے میں کہ اس ہدایت سے کونسی ہدایت مراد ہے کہ جو پیغمبر اسلام کے لیے نمونہ قرار پائی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد مشکلات کے مقابلہ میں صبر و پانداری ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مقصود توحید اور تبلیغ رسالت ہے لیکن ظاہر ہدایت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو توحید کو بھی اور دوسرے اصول اعتقادی کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور صبر و استقامت اور باقی اخلاق، تعلیم اور تربیت کے اصول بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت اس بات کے منافی نہیں کہ اسلام تمام گزشتہ ادیان و شرائع کا نسخ ہے کیونکہ نسخ تو صرف احکام کے ایک حصہ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اُن کی دعوت کے کلی اصول منسوخ ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہہ دیں کہ: میں تم سے اپنی رسالت کے بدلے میں کسی قسم کا کوئی اجر اور بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ جیسا کہ گزشتہ انبیاء نے بھی کوئی ایسی درخواست نہیں کی تھی میں بھی انبیاء کی ہمیشہ کی اس سنت کی پیروی کرتے ہوئے ان کی اقتدا کرتا ہوں ﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا﴾۔

نہ صرف یہ کہ انبیاء اور ان کی سنت جاوید کی اقتداء کا تقاضا یہ ہے کہ میں کسی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کروں بلکہ اس سبب سے بھی کہ یہ پاک دین جو میں تمہارے لیے لایا ہوں ایک خدائی امانت ہے جو میں تمہیں سپرد کر رہا ہوں تو خدائی امانت تم تک پہنچانے کا اجر اور جزاء (مانگتے) کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ قرآن، رسالت اور ہدایت تمام عالمین کے لیے ایک صدائے بیدار باش اور یاد آوری ہے ﴿إِنِّ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ﴾۔

اور اس قسم کی عمومی نعمت جو سب کے لیے ہے، نورِ آفتاب، نورِ آفتاب، امواج ہوا اور بارش برسنے کے مانند ہے کہ جو عمومی اور جہانی پہلو رکھتی ہے اور کبھی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور کوئی اس کے بدلے میں اجر و جزا نہیں لیتا۔ یہ ہدایت و رسالت بھی کوئی خصوصی اور اختصاصی پہلو نہیں رکھتی کہ جس کے لیے کسی بدلے کا قائل ہوا جاسکے۔

(اس جملہ کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا قبل کی آیات کے ساتھ تعلق کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے)۔

ضمنی طور پر آخری جملے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ دین اسلام کوئی علاقائی اور قومی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک عالمی اور انسانی دین ہے جو ہر جگہ اور ہر شخص کے لیے ہے۔

۱۔ سورہ لقمان کی آیہ ۱۲ میں علم و فہم کے معنی ہیں، سورہ ص کی آیہ ۲۲ میں قضاوت کے معنی ہیں اور سورہ کہف کی آیہ ۲۶ میں حکومت کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ ”ہولاء“ سے مراد خود انبیاء ہوں یعنی بفرض محال اگر یہ بزرگ انبیائے خدا ادائے رسالت سے سرتابی کر لیتے، تو پھر بھی خدائی پیغام زمین پر نہ پڑا رہتا، اور ایک دوسری جماعت اسے عالمین تک پہنچانے پر مامور ہو جاتی۔ قرآن میں ایسی تعبیرات کی نظیر بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ہم پڑھتے ہیں: ”لَنْ اَشْرَكَ لِيَجْبُنَ عَمَلِك“۔ (زمر: ۶۵)۔

۳۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ ”اقتدہ“ میں ”ہ“ ضمیر نہیں ہے بلکہ ”ہاء سکت“ ہے جو وقف کے وقت کلام میں صرف متحرک سے متعلق ہوتی ہے جیسا کہ ہمزہ وصل استعمال ہوتا ہے کہ جو شروع کے حرف کو ساکن کے ساتھ شروع نہ کرنے کی بنا پر آغاز کا کلام میں لایا جاتا ہے تو جس طرح ہمزہ وصل اتصال کلام کے وقت ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح ”ہائے سکت“ بھی ساقط ہو جانی چاہیے، لیکن چونکہ یہ ”ہاء“ قرآن کے رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے، لہذا رسم الخط کے ظاہر کی رعایت کرتے ہوئے، احتیاط کو اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ یہاں وقف ہوتا کہ ”ہاء“ ظاہر ہو سکے۔

آیت ۹۱

۹۱ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ يَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ يُبَدُّوهَا وَيُخْفُونَ كَثِيرًا وَعَلَّمْنَاهُم مَّا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ قُلْ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ﴾-

ترجمہ:

۹۱۔ انھوں نے خدا کو جیسا کہ پہچاننا چاہیے تھا، نہیں پہچانا جب کہ انھوں نے یہ کہا کہ اُس نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی، تم یہ کہہ دو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے، کس نے نازل کی تھی۔ وہ کتاب جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔ (لیکن تم لوگوں نے) اُسے پر اگندہ کر دیا ہے۔ تم اس کے کچھ حصے کو تو آشکار کرتے ہو اور کچھ کو پوشیدہ رکھتے ہو اور تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جن سے تم اور تمہارے آباؤ اجداد باخبر نہیں تھے۔ کہہ دو کہ خدا نے --- اور پھر انھیں ان کی ہٹ دھرمی میں چھوڑ دوتا کہ وہ کھیل کود میں پڑے رہیں۔

شان نزول

خدا شناس

ابن عباس سے منقول ہے:

یہودیوں کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! کیا واقعاً خدا نے تم پر کتاب نازل کی ہے؟

پیغمبر نے فرمایا: ہاں،

وہ کہنے لگے: خدا کی قسم خدا نے تو کوئی کتاب بھی آسمان سے نازل نہیں کی۔^(۱)

اس آیت کی شان نزول میں کچھ اور روایات بھی نقل ہوئی ہیں اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ سب سے بہتر ہے اور زیادہ مناسب ہے۔

خدا شناسان

اس بارے میں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے یا مشرکین کے بارے میں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ پیغمبر اکرم کی مکہ میں یہود سے گفتگو اور ملاقات نہیں تھی اور جو کچھ اُن کے ساتھ معاملہ رہا وہ مدینہ میں تھا اور دوسری طرف یہ کہ سورہ انعام کہ یہ آیت جس کا جزء ہے مکی ہے، بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت استثنائی طور پر

مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرم کے حکم سے کسی خاص مناسبت کی وجہ سے اس مکی سورہ کے وسط میں رکھی گئی ہے اور قرآن میں اس امر کے کئی نمونے موجود ہیں۔

حقیقت مطلب واضح ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ آیت کی اجمالی تفسیر کو سمجھ لیں اور اس کے بعد اس بارے میں آیت کن لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس کا ہدف و مقصد کیا ہے بحث کریں۔

آیت پہلے یہ کہتی ہے کہ: انھوں نے خدا کو جس طرح چاہیے اس طرح نہیں پہنچانا، کیونکہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ خدا نے کوئی کتاب کسی انسان پر نازل نہیں کی ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ﴾۔

خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تم اُن کے جواب میں یہ کہو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے اور جو لوگوں کے لیے نور و ہدایت تھی وہ کس نے نازل کی تھی ﴿قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ﴾۔

وہی کتاب کہ جسے تم نے پرہیزگارہ صفحات میں تبدیل کر دیا ہے، اس کا کچھ حصہ جو تمہارے مفاد میں ہے (لوگوں پر) ظاہر کرتے ہو اور اس کا بہت سا حصہ جسے تم اپنے لیے مضر سمجھتے ہو (لوگوں سے) چھپاتے ہو ﴿يَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ يُنْبِذُونَهَا وَيُخْفُونَ كَثِيرًا﴾۔

”اور اس آسمانی کتاب میں تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جنہیں تم اور تمہارے آباء اجداد جانتے نہیں تھے اور خدائی تعلیم کے بغیر اُسے جان بھی نہیں سکتے تھے“ ﴿وَعَلَّمْتُم مَّا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ﴾۔

آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ: تم صرف خدا کو یاد کرو اور اُنہیں ان کی باطل باتوں، ہٹ دھرمی اور کھیل کود میں چھوڑ دو کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے کتاب الہی اور اس کی آیات کو کھیل بنا رکھا ہے ﴿قُلْ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ﴾۔

اب اگر یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہو اور روئے سخن یہودیوں کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں کی ایک جماعت تمام انبیاء پر آسمانی کتاب کے نزول کی منکر تھی تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہودیوں اور تورات کی پیروی کرنے والے کتاب آسمانی کے نزول کا انکار کریں۔ جی ہاں! اگر آپ تعجب نہ کریں تو ایک خاص مطلب توجہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتب عہد جدید (اناجیل) اور کتب قدیم (تورات اور اس کے ساتھ وابستہ کتب) کا وقت نظر سے مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کتب میں سے کوئی بھی آسمانی لب و لہجہ نہیں رکھتی۔ یعنی خدا کے انسان سے گفتگو

کرنے کا پہلو ان میں نہیں ہے، بلکہ ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰ - اور حضرت عیسیٰ - کے شاگردوں اور غیر شاگرد پیروکاروں کی زبان سے تاریخ اور سیرت کی صورت میں لکھی گئی ہیں -

اور ظاہراً موجودہ وقت کے یہودی اور عیسائی بھی اس مطلب کا انکار نہیں کرتے کیونکہ ان کتابوں میں حضرت موسیٰ - اور حضرت عیسیٰ - کی وفات کی داستان اور بہت سے ایسے واقعات جو ان کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں لکھے ہوئے ہیں یہ (واقعات) پیش گوئی کے طور پر نہیں بلکہ گزرے ہوئے زمانے کی ایک خبر کے طور پر ہیں - کیا یہ بات ممکن ہے کہ ایسی کتاب حضرت موسیٰ - اور حضرت عیسیٰ - پر نازل ہوئی ہو؟

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتابیں چونکہ ایسے انسانوں کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں جو وحی آسمانی سے باخبر تھے لہذا یہ کتب مقدس، قابل اعتماد اور اشتباہ سے پاک ہیں -

تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے وہ قرآن کے لب و لہجہ سے کہ جو خدا کے پیغمبر سے اور بندوں سے خطاب کی شکل میں ہے کیوں تعجب کرتے تھے؟ اور اوپر والی شانِ غزل میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ انھوں نے تعجب کے ساتھ آپ سے پوچھا کہ کیا خدا نے آسمانی کتاب نازل کی ہے، اور پھر انھوں نے اس امر کا کلی طور پر انکار کیا ہے کہ کوئی کتاب خدا کی طرف کسی انسان پر حتیٰ کہ موسیٰ - پر بھی نازل ہوئی ہے -

لیکن خدا ان کے جواب میں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تم خود عقیدہ رکھتے ہو کہ المواح اور کچھ مطالب موسیٰ پر نازل ہوئے تھے - یعنی جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اگر وہ کتاب آسمانی نہیں ہے تو تم قبول کرتے ہو کہ اس قسم کی کوئی چیز خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی کہ جس کے کچھ حصہ تو تم آشکار کرتے ہو اور زیادہ تر حصہ چھپاتے ہو -

اس طرح سے اس بارے میں کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہودی کتاب آسمانی کے نزول کے منکر ہوں -

اور اگر یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مشرکین کے بارے میں ہو تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ہر قسم کی آسمانی کتاب کے نزول کے منکر ہو گئے تھے تاکہ پیغمبر اکرم اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا انکار کر سکیں، لیکن خدا ان کے لیے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس قسم کا دعویٰ کریں حالانکہ خدا نے تورات موسیٰ - پر نازل کی، اور مشرکین اگرچہ دین یہود قبول نہیں کرتے تھے لیکن وہ گذشتہ انبیاء اور حضرت ابراہیم - کو یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو احتمالاً ایک خاص علاقے اور زمانے کے پیغمبر کے طور پر قبول کرتے تھے اور خود کو دین ابراہیم - کا

پیروکار سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب پیغمبر اسلام نے ظہور کیا تو وہ ان کی علامات کی جستجو کے لیے اہل کتاب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتب کا مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ کیا وہ اس قسم کے پیغمبر کی خبر دیتی ہیں، تو اگر وہ ان کتب کو بالکل قبول نہ کرتے ہوئے تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی درخواست کریں لہذا وہ یہود سے سوال کرنے کے بعد جو کچھ اُن کے فائدے میں تھا اُسے ظاہر کرتے اور جو اُن کے لیے مضر تھا اُسے مخفی رکھتے (مثلاً پیغمبر کی اُن نشانیوں کے جو گزشتہ کتب میں آئی تھیں) لیکن پہلی تفسیر آیہ کے لب و لہجہ، شان فزول اور اُن ضمائر کے ساتھ جو آیت میں ہیں زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ قرطیس:

یہ جمع ہے ”قرطاس“ کی اور اس کی اصل جیسا کہ بعض نے کہا ہے یونانی زبان سے لی گئی ہے۔ اس کا معنی جیسا کہ راغب ”مفردات“ میں کہا ہے ”وہ چیز ہے کہ جس کے اوپر لکھا جائے“ اس بنا پر یہ لفظ عام خط کاغذ، جانوروں کے چمڑے، درختوں کی چھال اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے لیے بھی کہ جن پر قدیم ایام میں خط اور کتابیں لکھتے تھے، استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ کاغذ پر لکھنے کی مذمت؟

ممکن ہے یہ سوال ہو کہ آیت میں یہودیوں کی مذمت کیوں کی گئی ہے کہ انھوں نے وحی آسمانی کو کاغذ وغیرہ پر لکھا تھا، یہ تو کوئی مذمت کی بات نہیں ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ مذمت اس لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ مطالبِ تورات کو پرانندہ کاغذات اور اسی کی مانند دوسری چیزوں کے اوپر لکھتے تھے، پھر جو کچھ اُن کے فائدہ میں ہوتا تھا اُس کو تو وہ دوسرے لوگوں کو دکھاتے تھے اور جو اُن کے نقصان میں ہوتا تھا اُسے مخفی رکھتے تھے۔

۳۔ ”﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾“

(خدا کو جس طرح چاہیے انھوں نے نہیں پہچانا اور اس کے اوصاف کو سمجھا نہیں) حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص خدا صحیح طریقے سے پہچان لے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ اس کی طرف سے رہبر و رہنما کتبِ آسمانی کے ساتھ نوعِ بشر کے لیے بھیجے گئے کیونکہ حکمتِ خدا کا تقاضا یہ ہے کہ:

اول تو اس نے انسان کو جس ہدف و مقصد کے لیے پیدا کیا ہے یعنی ہدف ارتقا، اس کے لیے جو پُرپیچ و خم راستہ اُس کے سامنے ہے اُس میں اس کی مدد کرے ورنہ بصورت دیگر اُس نے غرض تخلیق کا تقاضا پورا نہیں کیا اور یہ ہدف و مقصد وحی بھیجنے، کتاب آسمانی نازل کرنے اور ہر قسم کی خطا و اشتباہ سے خالی، پاک اور صحیح تعلیمات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ خدا کی رحمت عامہ و خاصہ کا مقام ای بات کی اجازت دے دے کہ وہ انسان کو راہ سعادت میں جہاں چروہ ہزار ہا رکاوٹوں سے دوچار ہے اور بہت سی پھلسنے کی جگہیں اس کی راہ میں موجود ہستی، اکیلا چھوڑ دے اور اس کی دستگیری اور رہنمائی کے لیے جامع تعلیمات کے ساتھ رہبر و رہنما بھیجے (اس بنا پر اس کی حکمت بھی اور اس کی رحمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ کتب آسمانی بھیجے)۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کی کنہ ذات اور کنہ صفات کی معرفت تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور زیر بحث آیت میں ایسا کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور صفات کی جتنی مقدار انسان کے لئے ممکن ہے اگر وہ حاصل ہو جائے تو اس بات میں کوئی تردد باقی نہیں رہے گا کہ اس قسم کا خدا اپنے بندوں کو بغیر سرپرست اور بغیر کتاب آسمانی کے نہیں چھوڑے گا۔

۱۔ تفسیر مجمع البیان، ابو الفتوح رازی اور المنار زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

آیت ۹۲

۹۲ ﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ -

ترجمہ:

۹۲- اور یہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، یہ ایک ایسی بابرکت ہے کہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں اُن سب کی تصدیق کرتی ہے (اسے ہم نے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو خدائی جزاؤں کی بشارت دو) اور اس لئے بھیجا ہے تاکہ تم امّ القریٰ (مکہ) اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کو ڈارو۔ جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت و نگرانی کرتے ہیں۔

یہ ایک بہت ہی بابرکت کتاب ہے

اُس بحث کے بعد جو گذشتہ آیت میں یہودیوں کی اسمانی کتاب کے بارے میں تھی، یہاں قرآن کی طرف جو ایک دوسری اسمانی کتاب ہے اشارہ ہوتا ہے اور حقیقت میں تورات کا ذکر قرآن کے ذکر کے لیے ایک مقدمہ کے طور پر ہے، تاکہ ایک بشر پر کتابِ اسمانی کے نزول پر تعجب نہ کریں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ کتاب ہے جس نے ہم نے نازل کیا ہے ﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ﴾۔

یہ ایک بہت ہی بابرکت کتاب ہے کیونکہ یہ طرح طرح کی خوبیوں، نیکیوں اور کامیابیوں کا سرچشمہ ہے ﴿مُبَارَكٌ﴾۔

اس کے علاوہ ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں تصدیق کرتی ہے ﴿مُصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾۔

اس سے مراد کہ قرآن گذشتہ مقدس کتابوں کی تصدیق کرتا ہے یہ ہے کہ وہ تمام علامات (اور نشانیاں) جو اُن میں آئی ہیں وہ اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس طرح گذشتہ دو جملوں میں قرآن کی حقانیت کی دو نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک ان نشانیوں کا موجود ہونا کہ جن کی گذشتہ کتب میں خبر دی گئی تھی اور دوسرے قرآن کریم کے خود اپنے مضامین عالیہ کہ جن میں ہر قسم کی خیر و برکت اور وسیلہ سعادت موجود ہے۔ اس بنا پر اس کے مضامین عالیہ کے لحاظ سے بھی اور اسناد و تاریخی مدارک کی نظر سے بھی اس میں حقانیت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔

اس کے بعد نزول قرآن کے ہدف و مقصد کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے: ہم نے اسے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم امّ القریٰ (مکہ) اور ان تمام لوگوں کو اس کے اطراف و جوانب میں رہتے ہیں، ڈراؤ اور ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے انھیں آگاہ کرو ﴿وَلْتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾۔^(۱)

اور چونکہ ”انذار“ یعنی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے محرک کمرنے سے ڈرنا خصوصاً ایسے اشخاص کو جو سرکش و طغیانگر ہوں قرآن کریم کا اہم ترین پورگرام ہے، لہذا صرف اسی حصے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ لوگ جو قیامت کے دن پر، حساب و کتاب اور اعمال کی جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی ایمان لے آئیں گے اور اپنی نمازوں کی حفاظت بھی کریں گے ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾۔

۱۔ اس بارے میں کہ ”لتنذر“ کا عطف کس پر ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن زیادہ ترجو بات نظر آتی ہے یہ ہے یہ ایک محذوف لفظ مثلاً ”لتبشر“ وغیرہ پر عطف ہو۔

چند قابلِ توجہ مطالب

۱۔ اسلام ایک عالمی دین ہے: قرآن کریم کی مختلف آیات اچھی طرح سے گواہی دیتی ہیں کہ اسلام ایک عالمی دین ہے۔ و تعبیرات جیسے: ﴿لَا نَذِرُكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾

”میرا ہدف یہ ہے کہ تم سب کو اور اُن تمام لوگوں کو جن تک میری بات پہنچے قرآن کے ذریعے ڈراؤں“ (انعام/۱۹)

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾

”یہ قرآن عالمین کے لیے تذکر و یاد دہانی ہے“ (انعام/۹۰)

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾

”کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں“ (اعراف/۱۵۸)

اور ایسی بہت سی دوسری آیات کہ جو قرآن میں بکثرت موجود ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں اور خاص طور پر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، یعنی اس موقع پر جب کہ اسلام ابھی اس شہر کے حدود اربعہ سے باہر نہیں نکلا تھا۔

لیکن زیر بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبر کی بعثت کا ہدف مکہ اور اس کے گرد گرد کے لوگوں کو ڈرانا اور انہیں ہدایت کرنا کیسے بیان کیا گیا ہے؟ کیا یہ اسلام کے عالمی دین ہونے کے منافی نہیں؟ اتفاق سے یہ اعتراض بعض یہودیوں اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے نقل ہوا ہے اور انہوں نے اپنے گمان میں اسلام کے عالمی دین ہونے کے مقابلہ میں اس کو ایک محکم ہتھیار پایا ہے جو اسے ایک خاص علاقہ میں محدود کر دیتا ہے (یعنی مکہ اور اطراف مکہ^(۱))

جواب دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ امر کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت نہ صرف یہ کہ اسلام کے عالمی ہونے کے منافی نہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے یہ اسلام کے عالمی ہونے کی دلیل ہے۔

۱۔ قریہ، قرآن کی زبان میں ہر قسم کی آبادی کے معنی میں ہے چاہے وہ بڑا شہر ہو یا کوئی گاؤں، مثلاً ہم سورۃ یوسف میں یوسف کے بھائیوں کی زبان سے ان کے باپ کے سامنے ان کا بیان پڑھتے ہیں کہ: ﴿وَاسْتَقِلَّ الْفُرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا﴾

”ہم جس قریہ میں تھے اس قریہ سے پوچھ لیجئے“۔ (یوسف - ۸۲)

اور ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ گفتگو انھوں نے مصر کے پایہ تخت سے واپس لوٹنے اور عزیر مصر کی حکومت کی طرف سے اُن کے بھائی ”بنیامین“ کو مصر میں روک لینے کے واقعہ کے بعد کی تھی۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

”وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“

”اگر وہ تمام لوگ جس روئے زمین کی آبادیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم آسمان سے اور زمین سے ان پر (اپنی) برکتوں (کے دروازوں) کو کھول دیں گے“۔ (اعراف ۹۶)

یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں صرف بستیاں (گاؤں) مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے تمام دنیا کے رہائشی اور آباد علاقے مراد ہیں

دوسری طرف متعدد روایات میں ہے کہ زمین کی خشکی کے علاقے خانہ کعبہ کے نیچے سے بچھائے گئے تھے اور اسی وجہ سے ”دحو الارض“ (زمین کا بچھانا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابتداء میں سیلابی بارشوں کے زیر اثر تمام کمرہ زمین پانی سے ڈھکا ہوا تھا، پانی رفتہ رفتہ نیچے چلا گیا، اور زمین کے پست علاقوں میں ٹھہر گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی کے نیچے سے سر نکالنے لگیں۔ اسلامی روایات کے مطابق زمین کا پہلا ٹکڑا جس نے پانی سے سر نکالا وہ سر زمین مکہ تھی۔

اور اگر اس زمین کی بلندی موجودہ وقت میں تمام دنیا کی زمینوں کی بلندیوں سے بدترین نہیں ہے تو یہ امر ہماری اس گفتگو کے منافی نہیں کیونکہ اُس دن سے کئی لاکھ سال گزر چکے ہیں اور اب روئے زمین کے نقاط کی کیفیت بالکل بدل چکی ہے۔ بعض پہاڑ سمندروں کی تہوں میں چلے گئے ہیں اور بعض مقامات سمندروں کی تہوں سے نکل کر پہاڑوں کی چوٹیاں بن چکے ہیں اور یہ امر علم زمین شناسی (GEOLOGY) کے مسلمات میں سے ہے۔

۲۔ لفظ ”ام“ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ہر چیز کی اصل و اساس اور ابتدا و آغاز کے معنی میں ہے۔ اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ روئے زمین کی تمام خشکیوں کے پیدا ہونے کی اصل و اساس اور ابتدا و آغاز ہے۔ تو اس بنا پر ”ومن حولہا“ (جو اس کے گردا گرد ہیں) تمام روئے زمین کے لوگوں کے لیے ہوگا۔

گذشتہ آیات بھی اسلام کے عالمی ہونے کے بارے میں اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اکرم کے ایسے بہت سے مخلوط جو انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً کسریٰ و قصیر کے نام لکھے تھے جن کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۳۶۰ (اردو ترجمہ) پر گزر چکی ہے، اس امر کا ایک اور گواہ ہیں۔

۲۔ قرآن پر ایمان اور آخرت میں ربط: مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ: ”جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے، یعنی وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ جہاں دوسرے جہاں کے لیے ایک مقدمہ ہے، اور کھیتی یا یونیورسٹی یا تجارت خانہ کی مانند ہے۔ بہر صورت ایک سلسلہ قوانین، لائحہ عمل، اور آئین اور دستور اس کے لیے ناگزیر ہے اور انبیاء کے آئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اس ہدف عالی تک پہنچ سکیں اور اس دن (آخرت) کے لیے تیاری کر سکیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات مد نظر رکھتے ہوئے، کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں تکامل و ارتقا کے لیے بھیجا ہے، اور اس کی اصلی منزل دوسرا جہان ہے اگر وہ انبیاء اور آسمانی کتب اس کے لیے نہ بھیجے تو اس نے مقصد کو ضائع کر دیا ہے اور اس طرح سے خدا و معاد پر ایمان سے نبوت انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان کا نتیجہ نکالا جاتا ہے (غور کیجئے)۔

۳۔ نماز کی اہمیت: مندرجہ بالا آیت میں تمام دینی احکام میں سے صرف نماز کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نماز خدا سے رشتہ جوڑنے اور اُس کے ساتھ ربط کا مظہر ہے اور اسی سبب سے تمام عبادات سے برتر و بالاتر ہے۔ بعض کے عقیدہ کے مطابق ان آیات کے نزول کے وقت اسلامی فریضہ فقط نماز ہی تھا۔^(۲)

۱۔ تفسیر المنار، ج ۷، ص ۶۲۱۔ تفسیر فی ضلال، ج ۳، ص ۳۰۵ میں کچھ مستشرقین کی طرف سے یہ اعتراض نقل ہوا ہے۔

۲۔ تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۶۲۲۔

آیت ۹۳

۹۳ ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾-

ترجمہ:

۹۳۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے، یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے حالانکہ اس پر وحی نازل نہ ہوئی ہو اور وہ شخص کہ جو یہ کہے کہ میں بھی ایسا ہی (کلام) جیسا کہ اللہ نے نازل کیا ہے نازل کروں گا اور اگر تم ان ظالموں کو اُس وقت دیکھو جب کہ یہ موت کے شدائد میں گھرے ہوں گے اور فرشتے ہاتھ پھیلانے انہیں کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان (اور روح) کو باہر نکالو۔ آج تم اُن دروغ گوئیوں کے بدلے جو تم نے خدا پر باندھی تھیں اور اس کی آیات کے سامنے جو تکبر تم کیا کرتے تھے اس کے بدلے ذلیل کرنے والے عذاب دیکھو گے (اور اس دن ان کی حالت پر تمہیں افسوس ہوگا)۔

شان نزول

اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں منابع حدیث اور کتب تفاسیر میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد نامی ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جو کاتبِ وحی تھا، پھر اس نے خیانت کی تو پیغمبر نے اُسے دھتکار دیا (اور اپنے پاس سے نکال دیا) اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں بھی قرآنی آیات جیسی آیات لاسکتا ہوں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت یا اس کا کچھ حصہ مسیلہ کذاب کے بارے میں نازل ہوا ہے کہ جو نبوت کا چھوٹا دعویٰ کرنے والوں میں سے تھا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مسیلہ کا قصہ پیغمبر اکرم کی عمر کے آخری زمانے کا ہے اور یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے، اس شان نزول کے طرفدار یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ آیت اس سورہ کی چند دوسری آیات کی طرح مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اس سورہ کی آیت کے درمیان قرار دے دی گئی ہے۔

لیکن ہر صورت میں قرآن کی دوسری تمام آیات کی مانند کہ جو خاص حالات میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا مضمون و مطلب کلی اور عمومی ہے اس آیت کا مضمون و مطلب بھی کلی و عمومی ہے، اور ایسے تمام مدعیان نبوت اور ان جیسے تمام لوگوں پر محیط ہے۔

ایسے گنہگاروں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے

گذشتہ آیات کے بعد کہ جن میں کسی بھی شخص پر کتب آسمانی کے نزول کی نفی کے بارے میں یہود کی گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس آیت میں دوسرے ایسے گنہگاروں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو ان کے نقطہ مقابل میں ہیں اور اپنے اوپر وحی آسمانی کے نزول کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

حقیقت میں زیر بحث آیت میں اس قسم کے افراد کے تین گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن پہلے کہتا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں کسی آیت کی تحریف کرتے ہیں، اور خدا کے کلاموں میں سے کسی کو بدل دیتے ہیں ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا﴾۔

دوسرا گروہ ان کا ہے جو نبوت اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ نہ وہ پیغمبر ہیں اور نہ ہی اُن پر وحی نازل ہوتی ہے، ﴿أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ﴾۔

تیسرا گروہ ان کا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے انکار کے طور پر یا تمسخر اور استہزا سے کہتے ہیں کہ: ”ہم بھی اس قسم کی آیات نازل کر سکتے ہیں حالانکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ اس کام کی کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتے ﴿وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾“۔

ہاں یہ سب کے سب ستم گر ہیں اور ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ خدا کے بندوں پر راہ حق کو بند کر دیتے ہیں اور انہیں راستے سے ہٹا کر سرگردان کر دیتے ہیں، اور سچے رہبروں کی ہدایت کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ ایسے افراد جو رہبری کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے وہ رہبری کا دعویٰ کریں۔ وہ بھی خدائی اور آسمانی رہبری کا۔

اگرچہ آیت مدعیان نبوت و وحی سے ربط رکھتی ہے، لیکن اس کی روح اُن تمام افراد پر محیط ہے جو جھوٹ طریقہ سے کسی ایسے مقام کا دعویٰ کریں کہ جس کے وہ اہل نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے افراد کی دردناک سزایوں بیان کی گئی ہے: اے پیغمبر! اگر تم ان ظالموں کو اس وقت میں دیکھو جب کہ جان کنی کے شائد میں غرق ہوں گے اور روح قبض کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان کو باہر نکالو، تو تم دیکھو گے کہ ان کی حالت بہت ہی دردناک اور افسوس ناک ہے ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمْ﴾^(۱)۔

اس حالت میں عذاب کے فرشتے اُن سے کہتے ہیں: آج تم دو کاموں کی وجہ سے ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں گرفتار ہو گے، پہلا یہ کہ تم خدا پر جھوٹ باندھتے تھے اور دوسرا یہ کہ اس کی آیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے ﴿الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ نبوت کے جھوٹے دعویداروں اور بناوٹی رہنماؤں اور رہبروں کا جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں آیت میں بدترین ظالم کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا ہے اور حقیقت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہے کہ کسی کی فکر کو چرا لیا جائے اور اُس کے عقیدے کو خراب کر دیا جائے اور راہ سعادت اس پر بند کر دی جائے اور اُسے اپنی فکری نوآبادی بنالیا جائے۔

۲۔ ”﴿بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ﴾“ کا جملہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ قبض روح کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلاتے ہی ان کی روح کو قبض کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں سزا دینے کی ابتدا کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانے کے معنی میں ہو۔

۳۔ ”﴿أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمْ﴾“ (اپنی جان اور روح کو باہر نکالو) حقیقت میں یہ قبض روح کرنے والے فرشتوں کی طرف سے اس قسم کے ظالموں کے لیے ایک قسم کی تحقیر و تذلیل ہے۔ ورنہ روح و جان کا دینا خود ظالموں کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ان فرشتوں ہی کا کام ہے، جیسا کہ کسی قاتل کو موت کے گھاٹ اُتارتے وقت کہتے ہیں کہ اب موت کا مزہ چکھ۔ بہر حال ان کی یہ تحقیر و تذلیل اُس تحقیر کے مقابلہ میں ہے کہ جو انھوں نے آیات خدا، انبیاء اور بندگان خدا کے بارے میں کی تھی۔

ضمنی طور پر یہ آیت روح کے استقلال اور جسموں سے ایک جداگانہ شے ہونے پر ایک اور گواہ بھی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے گنہگاروں کی سزا جان دینے اور موت کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

۱۔ ”غرات“: جمع ہے ”غمرہ“ (بروزن ”ضربہ“ کی جو اصل میں کسی چیز کے آثار کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کثیر پانی کو جو کسی چیز کے تمام چہرہ کو چھادے، نیز ان شداہ، مشکلات اور مصائب کو بھی غمرہ کہا جانے لگا جو انسان کو اپنے حلق کی طرف کھینچیں۔

آیت ۹۲

۹۲ ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾ -

ترجمہ:

۹۲۔ تم سب ہماری بارگاہ میں اکیلے لوٹ کر آئے ہو اسی طرح جیسا کہ پہلے دن ہم نے تمہیں خلق کیا تھا اور جو کچھ ہم نے (دنیا میں) تمہیں عطا کیا تھا اُسے (وہیں دنیا میں ہی) اپنے پس پشت ڈال آئے ہو اور وہ شفاعت کرنے والے کہ جنہیں تم اپنی شفاعت میں شریک سمجھتے تھے انہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھتے۔ تمہارے پیوند اور رشتے قطع ہو گئے ہیں اور وہ تمام چیزیں کہ جنہیں کہ جنہیں تم اپنا سہارا خیال کرتے تھے وہ تم سے دور اور کم ہو گئی ہیں۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبرسی اور تفسیر آلوسی میں منقول ہے کہ مشرکین میں سے نضر بن حارث نامی ایک شخص نے کہا کہ لات اور عزیٰ (عربوں کے دو مشہور بت) قیامت کے دن میری شفاعت کریں گے، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اُسے اور اُس جیسے لوگوں کو جواب دیا گیا۔

گمشدہ لوگ

گذشتہ آیت میں موت کے آستانے پر ظالموں کے کچھ حالات کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ اس آیت میں میں وہ گفتگو جو خدا موت کے وقت یا میدانِ قیامت میں ورود کے وقت اُن سے کرے گا منعکس کی گئی ہے۔ ابتداء میں ارشاد ہوتا ہے: آج سب اکیلے ہی اسی طرح جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلے دن پیدا کیا تھا ہماری طرف لوٹ رہے ہو ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾۔

”اور جو مال ہم نے تمہیں (دنیا میں) بخشا تھا اور وہ زندگی میں تمہارا سہارا تھا، سب کا سب پس پشت ڈال کر خالی ہاتھ آئے ہو“ ﴿وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ﴾^(۱)۔

اسی طرح ”وہ بت کہ جنہیں تم اپنے شفیع خیال کرتے تھے، اور انہیں اپنی سرنوشت میں شریک سمجھتے تھے ان میں سے کسی کو ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھ رہے“ ﴿وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ﴾۔

حقیقت میں تمہارا اجتماع پر انگدگی سے دوچار ہو گیا اور تمام رشتے تم سے ٹوٹ گئے ﴿لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ﴾ اور وہ تمام سہارے جن پر تم بھروسہ کیے ہوئے تھے نابود ہو گئے اور کھو گئے ﴿وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾۔

عرب کے مشرک اور بت پرست تین چیزوں پر تکیہ کرتے تھے۔

۱۔ وہ قبیلہ و عشیرہ کہ جس کے ساتھ وہ وابستہ ہوتے تھے۔

۲۔ وہ مال و دولت کہ جو انھوں نے اپنے لیے اکٹھا کر رکھا تھا اور

۳۔ وہ بت کہ جنھیں وہ انسان کی سرنوشت کے تعین میں خدا کی بارگاہ میں شفیع سمجھتے تھے۔ آیت کے تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں ان تینوں میں سے ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ وہ سب موت کے وقت کس طرح انسان سے الوداع ہوتے ہیں اور اُسے تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔

دو اہم نکات

۱۔ اس آیت کا اُس آیت کے بعد کہ جس میں موت کے وقت روح قبض کرنے والے فرشتوں کی گفتگو بیان کی گئی تھی قرار پانا اور اسی طرح ”تم نے اپنے اموال پس پشت ڈال دیئے“ کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب بھی موت کے وقت ان سے ہوگا لیکن یہ خطاب خدا کی طرف سے ہوگا۔ البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب میدان قیامت میں وارد ہونے کے بعد ہوگا۔ تاہم (اس سے) آیت کے مقصد اور ہدف اصلی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

۲۔ یہ آیت اگرچہ مشرکین عرب کے بارے نازل ہوئی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی۔ اس دن تمام رشتے، مادی تعلقات، تمام خیالی اور بناوٹی معبود، تمام سہارے جو انسان اس جہاں میں اپنے لیے بنائے ہوئے تھا اور انھیں اپنی بد بختی کے دن کے لیے دوست اور مددگار خیال کرتا تھا کلی طور پر اس سے جدا ہو جائیں گے، وہ خود رہ جائیں گے اور اس کے اعمال، وہ ہوگا اور اس کا خدا، اور باقی سب درمیان سے چلے جائیں گے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق وہ سب کے سب گم ہو جائیں گے۔ یعنی وہ اس طرح سے حقیر و پست اور ناشناس ہو جائیں گے کہ نگاہ میں ہی نہیں آئیں گے۔

۱۔ خولناکم ”خول“ (برزون ”عمل“) کے مادہ سے اصل میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو سپرستی، تدبیر اور ادارت کی محتاج ہو اور عام طور پر اموال اور ایسی مختلف نعمتوں کے لیے لولا جاتا ہے جو خدا انسان کو بخشتا ہے۔

آیات ۹۵، ۹۶

۹۵ ﴿إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّا تُؤْفَكُونَ﴾۔

۹۶ ﴿فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾۔

ترجمہ:

۹۵۔ خدا دانے اور گٹھلی کو چیز نے والا ہے اور زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔ یہ ہے تمہارا خدا، پس تم حق سے کیسے منحرف ہوتے ہو۔

۹۶۔ وہ صبح کو شگافہ کرنے والا ہے، اور اُس نے رات کو سکون کا باعث اور آفتاب و ماہتاب کو حساب کا ذریعہ قرار دیا ہے، یہ دانا و توانا خدا کی تقدیر ہے۔

تفسیر

طلوع صبح کرنے والا

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے قرآن توحید کے دلائل کو اسراکانات، نظام آفرینش اور خلقت کی تعجب خیزیوں کے زندہ نمونوں اور پرگش عبارتوں کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلی آیت میں زمین کے تین قسم کے عجیب و غریب شاہکاروں کی طرف اشارہ کیا گیا اور دوسری آیت میں آسمان میں ظاہر ہونے والی تین قسموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے کہتا ہے: خدا دانے اور گٹھلی کا چیز نے والا ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى﴾۔ ”فالق“ ”فلق“ کے مادہ سے (بروزن ”فرق“ کسی چیز کو شگاف کرنے اور اس کے ایک حصے کو دوسرے سے جدا کرنے کے معنی میں ہے۔^(۱))

”حب“ ”وجہ“ غذائی دانوں کے معنی میں ہے، مثلاً گندم، جو اور وہ چیزیں جو کاٹنے کے قابل میں۔^(۲) البتہ بعض اوقات دوسرے گھاس پھوس کے دانوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

”نوی“ گٹھلی کے معنی میں ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ یہ کھجور کی گٹھلی کے ساتھ مخصوص ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ عرب اپنے ماحول کے مخصوص حالات کی بنا پر جب یہ کلمہ استعمال کرتے تھے تو ان کی توجہ کھجور کی گٹھلی کی طرف ہوتی تھی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعبیر میں کونسا نکتہ پوشیدہ ہے۔

اس بات پر خاص طور سے توجہ رکھنا چاہیے کہ ایک کسی پودے کی زندگی میں اہم ترین لحظہ وہی ہے جب دانہ اور گٹھلی شگافتہ ہو رہی ہو کہ جو ایک بچہ کی پیدائش کی طرح ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کا زمانہ شمار ہوتا ہے اور اس لمحے اس کی زندگی میں ایک اہم ترین انقلاب رونما ہوتا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ہری گھاس اور نباتات کے دانے اور گٹھلیاں اکثر بہت ہی زیادہ محکم اور مضبوط ہوتی ہیں۔

اگر کھجور کی گٹھلی اور دوسرے پھلوں مثلاً آڑو اور بعض حبوبات کی گٹھلیوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ نطفہ حیاتی کہ جو حقیقت میں ایک پودا اور ایک چھوٹا سا درخت ہے بہت ہی محکم قلعہ میں محصور ہے۔ لیکن کارخانہ آفریش اس ناقابلِ نفوذ قلعہ کو تسلیم و رضا کی ایسی خاصیت عطا کرتا ہے اور اُس نرم و نازک کو پیل کو جو گٹھلی اور دانے کے اندر پرورش پاتی ہے ایسی خاصیت عطا کرتا ہے اور اُس نرم و نازک کو پیل کو جو گٹھلی اور دانے کے اندر پرورش پاتی ہے ایسی قدرت و طاقت بخشتا ہے کہ وہ اس کی دیواروں کو چیر کر اُس کے اندر سے باہر نکال کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ واقعاً یہ عالم نباتات میں ایک عجیب و غریب قسم کا حادثہ ہے کہ قرآن جس کی طرف توحید کی ایک نشانی کے طور پر اشارہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ زندہ موجودات کو وہ مردہ سے باہر لاتا ہے اور مردہ موجودات کو زندہ سے ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾۔

حقیقت میں یہ جملہ کہ جس کی نظیر قرآن میں بارہا نظر سے گزری ہے، موت و حیات کے نظام اور اُن کے ایک سے دوسرے میں تبدیل ہونے کی طرف اشارہ ہے بعض اوقات سمندروں کی تہ میں اور جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں کی گہرائیوں میں بے جان خشک مواد سے زندگی کے طرح طرح کے چہرے تیار کر کے باہر بھیجتا ہے۔ ایسے ایسے مواد کو جن میں سے ہر ایک زہر قاتل کا کام کرتا ہے ترکیب دے کر حیات بخش مواد تیار کر لیتا ہے اور بعض اوقات اس کے برعکس طاقتور زندہ موجودات کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ایک بے جان موجود میں تبدیل کر دیتا ہے۔ زندہ موجودات کی زندگی کا مسئلہ خواہ وہ موجودات نباتات سے ہوں یا حیوانات میں سے، پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ ابھی تک انسانی علم و دانش اس کے اسرار سے پردہ نہیں اٹھا سکے اور نہ ہی اس کے پوشیدہ رازوں کو معلوم کر سکے کہ کس طرح سے طبیعی عناصر اور خشک مواد ایک عظیم حرکت کے ساتھ زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی دن انسان جیسے کہ ایک مشین کے پرزوں کو جوڑ کر جو پہلے سے بنے ہوئے ہوتے ہیں مشین بنالیتا ہے اسی طرح سے مختلف طبیعی تراکیب سے استفادہ کرتے ہوئے بہت ہی پیچیدہ طریقوں کے ساتھ کوئی زندہ موجود بنا ڈالے لیکن نہ تو آج بشر کا عجز و ناتوانی اور نہ ہی آئندہ زمانے میں اس کام پر قادر ہونے کا احتمال، زندگی اور اس کے پیچیدہ نظام کے ایک عالم و قادر مبداء کی طرف سے ہونے کی بات کی اہمیت کو کم کر سکتی ہے۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وجود خدا کے اثبات کے لیے بارہا اسی مسئلہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ابراہیم - اور موسیٰ جیسے عظیم و بزرگ پیغمبر بھی نمرود اور فرعون جیسے سرکشوں کے مقابلے میں زندگی کے ظہور اور اس کی حکایت کے ذریعہ قادر و حکیم مبداء عالم کے وجود پر استدلال کرتے تھے۔

ابراہیم - نمرود سے کہتے ہیں: ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ﴾ -

”میرا خدا وہ ہے کہ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے“ - (بقرہ - ۳۵۸)

حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلے میں کہتے ہیں: ﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْ نَبَاتٍ شَتَّى﴾

”میرا پروردگار وہ ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور نباتات کے طرح طرح کے جوڑے وجود میں لایا“ - (طہ -

(۵۳)

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ صرف بے جان مواد سے زندہ موجودات کی پیدائش روئے زمین پر زندگی کی پیدائش کے آغاز میں نہیں تھی۔ بلکہ اب بھی پانی اور دیگر مواد کو زندہ موجودات کے خلیوں کے ساتھ جذب کمر کے حقیقت میں ان بے جان موجودات کے جسم پر لباس حیات پہنایا جاتا ہے۔ اس بناء پر وہ قانون جو آج کے علوم طبیعی کی رو سے مسلم ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ زمین کے موجودہ حالات و کوائف میں کوئی بے جان موجود جاندار موجود تخم سے ہوگا، یہ نظریہ اُس سے جو کچھ ہے کہا ہے کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے گا)

ان روایات سے جو اس آیت کی تفسیر میں یا اس کی مشابہ دوسری آیات کی تفسیر میں آئمہ اہل بیت - سے ہم تک پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف مادی حیات و موت ہی نہیں ہے بلکہ یہ معنوی موت و حیات کو بھی اپنے دامنِ مفہوم میں لیے ہوئے ہے^(۲)

ہم صاحبِ ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ بے ایمان آباؤ اجداد سے وجود میں آتے ہیں، اور شریر، آلودہ گناہ اور بے ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ پاک افراد کی نسل سے ہیں اور وہ قانون وراثت کو اپنے ارادہ و اختیار سے توڑ رہے ہیں، جو کہ خالق کائنات کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے کہ اُس نے اس قسم کی قدرت و ارادہ انسان کو بخشا ہے۔

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ ”مخرج“ جو کہ فعل مضارع ہے ”مخرج“ کی طرح جو کہ اسم فاعل ہے استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی مردہ موجودات سے حیات سے پیدائش اور زندہ موجودات سے مردوں کا پیدا ہونا جہاں آفرینش کا ایک دائمی اور عمومی نظام ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر اور مطلب کو محکم بنانے کے لیے کہا گیا ہے: یہ ہے تمہارا خدا، اور یہ ہیں اس کی لاتناہی علم و قدرت کے آثار، تو ان حالات میں تم حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو اور وہ تمہیں باطل کی راہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں ﴿ذَلِكُمُ اللَّهُ فَاَنَّا تَوْفَكُونَ﴾۔

دوسری آیت میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تین جوی و آسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، پہلے کہا گیا ہے: خدا صبح کا شگافتہ کرنے والا اور طلوع صبح کرنے والا ہے ﴿فَالِقُ الْاَصْبَاحِ﴾۔

”فلق“ (بروزن خلق) اصل میں شگاف ڈالنے کے معنی میں ہے اور یہ جو صبح کو فلق کہتے ہیں تو یہ بھی اسی مناسبت سے ہے، ”اصباح“ و ”صبح“ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔

مندرجہ بالا تعبیر بہت ہی موزوں اور خوبصورت تعبیر ہے جو یہاں استعمال ہوئی ہے۔ کیونکہ رات کی تاریکی کو ایک موٹے پردے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کو سفید دم کی طرح روشنی چاک کر کے علیحدہ کر دیتی ہے اور یہ صورت صبح صادق پر بھی منطبق ہوتی ہے اور صبح کاذب پر صادق آتی ہے کیونکہ صبح کاذب کم روشنی کو کہا جاتا ہے جو رات کے آخری حصہ میں ایک عمود کی شکل میں مشرق کی جانب آسمان پر پھیل جاتی ہے، اور وہ ایک شگاف سا ہوتا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف رات کے تاریک و سیاہ پردے میں ظاہر ہوتا ہے اور صبح صادق کہ جو اس کے بعد طلوع کرتی ہے ایک سفید و درخشان اور خوبصورت جھال کی شکل میں ہوتی ہے جو ابتدا میں اُفق مشرق کے عرض میں آشکار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رات کی سیاہ چادر کو نیچے کی طرف شمالاً و جنوباً پھاڑتی ہوئی دور تک بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اوپر کی طرف تدریجاً بڑھتے ہوئے سارے آسمان پر پھیل جاتی ہے۔

قرآن کے علاوہ اس کے بارہا نعمتِ نور و ظلمت اور نعمتِ شب و روز کا ذکر کیا ہے یہاں طلوعِ صبح کے مسئلہ کا والہ دیا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آسمان میں ظاہر ہونے والی روشنی زمین کی فضا کے وجود کا نتیجہ ہے (یعنی ہوا کی وہ ضخیم و دبیز تہ کہ جس نے اس کرہ ارض کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے) کیونکہ اگر کرہ زمین کے اطراف میں کرہ ماہ کی طرح یہ فضا موجود نہ ہوتی تو نہ بین الطلوعین و فلق کا وجود ہوتا اور نہ ہی آغاز شب کی سفید اور شفق ہوتی، بلکہ آفتاب ایک ناخواندہ مہمان کی طرح بغیر کسی اطلاع اور تمہید کے افق مشرق سے سر نکالتا اور اپنا خیرہ کرنے والا نور اُن آنکھوں میں جو تاریکی شب کا عادی ہو چکی ہو تین فوراً اور ایک دم چھڑک دیتا اور غروب کے وقت ایک فراری مجرم کی طرح اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور ایک ہی لمحہ میں تاریکی اور وحشتناک ظلمت تمام جگہوں کو گھیر لیتی۔ لیکن فضائے زمین کا وجود اور وہ فاصلہ جو رات کی تاریکی اور دن کی روشنی کے طلوع و غروب آفتاب کے وقت ہوتا ہے، انسان کو تدریجاً ان دو متضاد ظاہر ہونے والی چیزوں میں سے ہر ایک کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے اور نور سے ظلمت میں تبدیلی اور ظلمت سے نور میں تبدیلی تدریجاً اور آہستہ آہستہ بالکل پسندیدہ اور قابل برداشت صورت میں انجام پاتی ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ رات کے وقت ایک روشن اور پر نور کمرے میں جب اچانک بلب بجھ جاتا ہے تو سب کے لیے کیسی تکلیف دہ حالت ہوتی ہے۔

پھر گھنٹہ بھر بجلی نہ آئے اور پھر بغیر کسی تمہید کے بلب روشن ہو جائے تو پھر بھی ایک قسم کی تکلیف سب کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بلب کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے اور ہم اطراف کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے زحمت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اگر ایسا بار بار ہوتا رہے تو یقیناً آنکھوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا (۴)

لیکن اس بنا پر کہ کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ طلوعِ صبح اس بات کی دلیل ہے کہ تاریکی و ظلمت ایک نامطلوب چیز ہے اور یہ سزا و سلبِ نعمت ہے لہذا بلا فاصلہ قرآن فرماتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ”رات کو سکون و آرام کا باعث قرار دیا ہے“ ﴿وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا﴾۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان نور اور روشنی میں جستجو اور کوشش کی طرف مائل ہوتا ہے، خونِ سطحِ بدن کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور تمام خلیے آمادہ عمل ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ روشنی میں نیند اتنی آرام دہ نہیں ہوتی لیکن ماحول جتنا تاریک ہوگا نیند اتنی ہی گہری اور آرام دہ ہوگی۔ کیونکہ تاریکی میں خونِ بدن کے اندر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خلیے ایک طرح کے آرام و استراحت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اسی سبب سے دنیائے طبیعت میں نہ صرف

حیوانات بلکہ نباتات بھی رات کی تاریکی میں سو جاتے ہیں اور صبح کی پہلی شعاع کے ظاہر ہوتے ہی جنبش اور فعالیت شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مشینی دنیا کے لوگ آدھی رات کے بعد تک بیدار رہتے ہیں اور دن کو طلوع آفتاب کے بہت دیر بعد تک سوئے رہتے ہیں اور بدن کی صحت و سلامتی کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اُن احادیث میں جو اہل بیت علیہم السلام کے طریقوں سے وارد ہوئی ہیں، ہم ایسے دستور العمل پڑھتے ہیں جو سب کے سب یہی مفہوم لیے ہوئے ہیں، منجملہ ان کے نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ - نے اپنے ایک موالی کو حکم دیا کہ رات کے ابتدائی حصہ میں اپنا سفر جاری نہ رکھ کیونکہ خدا نے رات کو سکون و آرام کے لیے قرار دیا ہے اور اسے قیام کا وقت قرار دیا ہے نہ کہ کوچ کرنے کا۔ رات کے وقت اپنے بدن کو آرام پہنچاؤ اور استراحت کرو (۵)

ایک حدیث میں جو کتاب ”کافی“ میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے آپ - نے فرمایا: ”ت” تزوج باللیل فَإِنَّهُ جَعَلَ اللَّيْلَ سَكْنًا“

”مراسم ازدواج کو رات کے وقت قرار دے کیونکہ رات باعث سکون و آرام ہے“ (۶)

جیسا کہ ازدواج اور صحیح طور پر جنسی آمیزش بھی آرام بخش ہے اور کتاب کافی میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ امام علی بن الحسین علیہما السلام اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ رات کے وقت اور طلوع فجر سے پہلے کبھی بھی جانوروں کو ذبح نہ کریں اور فرماتے تھے: ”إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ اللَّيْلَ سَكْنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ“

”خدا نے رات کو ہر چیز کے لیے راحت و آرام کا سبب قرار دیا ہے“۔ (۷)

اس کے بعد خداوند تعالیٰ نے اپنی تیسری نعمت اور اپنی عظمت کی نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: آفتاب و ماہتاب کو تمہاری زندگی میں حساب و کتاب کا ذریعہ قرار دیا ہے ﴿وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا﴾۔

”حسبان“ (بروزن لقمان) مصدر ہے، مادہ ”حساب“ سے اور حساب کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں ممکن ہے یہ مراد ہو کہ ان دو آسمانی کڑوں کی منظم گردش اور سیر مرتب (البتہ ان کی حرکت سے مراد وہ حرکت ہے جو ہمیں نظر آتی ہے جو زمین کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے) اس بات کا سبب بنتی ہے کہ تم اپنی زندگی کے مختلف پروگراموں کو نظام و حساب کے ماتحت کر لو۔ جیسا کہ ہم اوپر والی تفسیریں بیان کر چکے ہیں۔

اس بنا پر پہلی صورت میں خداوند تعالیٰ کی ایک نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اُس نے انسانوں کو دی ہے اور دوسری صورت میں توحید کی ایک نشانی اور وجودِ خدا کے اثبات کی ایک دلیل کی طرف اشارہ ہے اور ممکن ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر صورت یہ بات ہی جاذبِ توجہ ہے کہ لاکھوں سال سے کمرہ زمین آفتاب کے گرد اور ماہِ تبار زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اور اس کے زیرِ اثر ہم اہلِ زمین کی نظر میں آفتاب کی ٹکیہ فلک کے بارہ برجوں کے سامنے گردش کر رہی ہے، اور چاند کی ٹکیہ اپنے منظم حلال کے ساتھ اور تدریجی تغیر پذیری کے ساتھ اور ہر دفعہ ایک ترتیب سے ظاہر ہوتی ہے، یہ گردش اس قدر حساب شدہ ہے کہ ایک لمحہ بھر کی کسی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم سورج کے گرد گردش زمین کی مسافت پر غور کریں جو ایک بیضوی شکل کے مدار میں گردش کرتی ہے جس کی شعاع متوسط ۱۶۰ لاکھ کلومیٹر ہے، حالانکہ آفتاب کی عظیم قوتِ جاذبہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اسی طرح کمرہ ماہ کہ جو خود اپنے دائرے جتنی مسافت کو شعاع متوسط کے ۳۸۴ ہزار کلومیٹر کے ساتھ طے کرتا ہے، جب کہ زمین کی عظیم قوتِ جاذبہ اُسے ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ تو اس وقت ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوں گے کہ ایک طرف سے ان کرات کی قوتِ جاذبہ میں اور دوسری طرف سے ان کرات کے درمیان مرکز سے گریز کی قوت میں کس قدر دقیق تعادل اور برابری برقرار ہے کہ جس سے ان کی سیرِ عظیم میں ایک لحظہ کا وقفہ یا کوئی کمی زیادتی پیدا نہیں ہوتی اور ایسا ایک لامتناہی علم و قدرت کے بغیر ممکن نہیں کہ جو اس کی نقشہ کشی بھی کمرے اور اُسے باریک بینی کے ساتھ جاری بھی رکھے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ خدا کی اندازہ گیری ہے جو توانا بھی ہے اور دانا بھی ہے ﴿ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾۔

۱۔ ۲۔ مفردات راغب صفحہ ۳۸۵ اور ۱۰۵۔

۳۔ اصول کافی، ج ۲، باب ”طینۃ المؤمن والکافر“؛ تفسیر برہان، ج ۱، ص ۵۴۳۔

۴۔ علمائے یمنت کہتے ہیں کہ طلوع صبح اس وقت شروع ہوتا ہے جب آفتاب مشرق کی طرف ۱۸ درجہ فاصلہ پر افق پر پہنچ جائے اور ات کی تاریکی اُس وقت تمام جگہوں کو گھیر لیتی ہے اور شفق گم ہو جاتی ہے جب سورج مغرب کی طرف ۱۸ درجہ افق میں نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔

۵، ۶، ۷۔ تفسیر صافی، ذیل آیہ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شاید اس جملے سے یہ مراد ہو کہ خود یہ دونوں آسمانی کرے ایک نظام کے ماتحت اور ایک حساب سے رواں دواں ہیں۔

آیت ۹۷

۹۷ ﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾-

ترجمہ:

۹۷- اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے تاکہ خشکی اور دریا کی تاریکی میں اُن کے ذریعہ ہدایت حاصل کرو۔ ہم نے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں (اور جو اہل فکر و نظر ہیں) اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔

ہم نے اپنی نشانیاں اور دلائل اہل فکر و نظر اور اہل فہم

گذشتہ آیت کے بعد آفتاب و ماہتاب کی گردش کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہاں پر وردگار کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے ہیں تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور دریا کی تاریکی میں اپنے راستوں کو اندھیری راتوں میں پا لو:

”﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾“

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیاں اور دلائل اہل فکر و نظر اور اہل فہم و فراست کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں ﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾-

انسان ہزار سال سے آسمان کے ستاروں اور ان کے نظام سے آشنا ہے۔ اگرچہ جس قدر انسانی علم و دانش بڑھتا جا رہا ہے اسی قدر وہ اس نظام کی گہرائی میں زیادہ داخل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ہر زمانے میں اسی کی وضع و کیفیت سے کم و بیش آشنا تھا۔ لہذا دریائی اور خشکی کے سفروں میں سمت کے تعین کا بہترین ذریعہ یہی ستارے تھے۔

خصوصاً وسیع و عریض سمندروں میں جہاں راستے اور منزل کے تعین کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوتی تھی، قطب نما بھی اُس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا، آسمانی ستاروں کے سوا اور کوئی قابل اعتماد ذریعہ بھی موجود نہیں تھا۔ یہی ستارے تھے جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو گمراہی اور غرقاب سے نجات دیتے تھے اور انھیں منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔

صفحہ آسمان پر چند رات پے در پے متواتر نگاہ کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ستاروں کی حالت و کیفیت ہر مقام پر ایک ہی جیسی ہے گویا کہ ستارے موتیوں کے دانوں کی طرح ہیں کہ جو ایک سیاہ کپڑے کے اوپر ٹکے ہوئے ہیں اور آغاز شب سے ہی اس کپڑے کو مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف کھینچ دیا جاتا ہے اور وہ سب کے سب اس

کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور زمین کے محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جب کہ ان کے درمیانی فاصلوں میں بھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ صرف ایک استثناء جو اس قانون کلی میں دکھائی دیتا ہے یہ ہے کہ کچھ ستارے ایسے بھی ہیں کہ جنھیں سیارہ کہتے ہیں اور ان کی اپنی مستقل اور مخصوص حرکات ہیں اور ان کی تعداد ۸ سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے ۶ آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں (عطارد، زہرہ، زحل، مریخ اور مشتری) لیکن باقی تین سیاروں (اورانوس، نیپٹون اور پلوٹون) کو صرف دوربین کے ساتھ ہی دیکھا جاسکتا ہے (البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زمین بھی ایک سیارہ ہی ہے جو آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے تو ان کی مجموعی تعداد ۹ تک پہنچ جاتی ہے)۔

شاید قبل از تاریخ کے انسان بھی ”ثوابت“ اور ”سیارات“ کی وضع سے آشنا تھے کیونکہ انسان کے لیے تاریک اور ستاروں بھری رات میں آسمان سے زیادہ دل لہانے والا اور جاذب نظر کوئی منظر نہیں ہے۔ اسی بنا پر بعید نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے راستوں کو معلوم کرنے کے لیے ستاروں سے استفادہ کرتے ہوں۔

بعض روایات سے جو اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ستاروں سے مراد خدائی رہبر اور ہادیانِ راہ سعادت یعنی آئمہ معصومین علیہم السلام کہ جن کے وسیلہ سے لوگ زندگی کی تاریکیوں میں گمراہی سے نجات پاتے ہیں اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی معنوی تفسیر آیت کی ظاہری اور جسمانی تفسیر کے منافی نہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کی نظر دونوں ہی باتوں کی طرف ہو^(۱)

آیات ۹۸، ۹۹

۹۸ ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ﴾ -

۹۹ ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ إِنَّ فِي ذَلِكُمْ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ -

ترجمہ:

۹۸ - اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا حالانکہ بعض انسان پائیدار ہیں (ایمان یا خلقت کامل کے لحاظ سے) اور بعض ناپائیدار ہم نے اپنی آیات اُن لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں بیان کر دی ہیں -

۹۹ - اور وہی وہ ذات ہے کہ جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے طرح طرح کے نباتات اُگلائے - اُن سے سبز تنے اور شاخیں نکالیں اور اُن سے ترتیب کے ساتھ چنے ہوئے دانے اور کجھور کے کچھوں سے باریک دھاگوں کے ساتھ جڑے ہوئے خوشے باہر نکالے اور طرح طرح کے انگور، زیتون اور انار کے باغ (پیدا کئے) جو ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور (بعض) غیر مشابہ (ہیں) جب اُن میں پھل آتا ہے تو تم اُس میں پھل لگنے اور اُس کے پکنے کی طرف نگاہ کرو کہ اس میں صاحبانِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں -

وہی وہ ذات ہے کہ جس نے تمہیں ایک انسان سے پیدا کیا ہے

تفسیر

ان آیات میں بھی توحید اور خدا شناسی کے دلائل ہی بیان ہوئے ہیں - کیونکہ قرآن انسان کو اس ہدف کے لیے کبھی آفاق اور دور رداز کے جہانوں کی سیر کراتا ہے اور کبھی اُسے اپنے وجود کے اندر سیر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے جسم و جان میں موجود خدا کی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے - تاکہ وہ خدا کو ہر جگہ اور ہر چیز میں دیکھ لے -

پہلے کہتا ہے: وہی وہ ذات ہے کہ جس نے تمہیں ایک انسان سے پیدا کیا ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ

وَاحِدَةٍ﴾ -

یعنی تم ان گوناگوں چہروں، مختلف ذوق و افکار اور تمام جنبہ ہائے وجودی میں وسیع تنوع کے باوجود ایک ہی فرد سے پیدا ہوتے ہو۔ اور اس سے خالق و آفریدگار کی انتہائی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے ایک ہی مبداء سے یہ مختلف چہرے کس طرح پیدا کیے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جملہ میں خلقت انسان کو ”انشاء“ سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ جیسا کہ متون لغت سے معلوم ہوتا ہے ایسے ایجاد و ابداع کے معنی ہیں ہے کہ جس میں ترتیب و پرورش کی آمیزش ہو۔ یعنی نہ صرف یہ کہ خدا وند تعالیٰ نے تمہیں بغیر کسی سابقہ تجربے کے پیدا کیا ہے بلکہ اُس نے تمہاری تربیت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اگر کوئی پیدا کرنے والا کسی چیز کو پیدا کر کے پھر اُسے (بے سہارا) چھوڑ دے تو اُس نے کوئی زیادہ قدرت نمائی نہیں کی۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی حمایت میں لے لے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی پرورش و تربیت سے غافل نہ ہو تو اُس نے اپنی عظمت و رحمت کی مکمل نشاندہی کی ہے۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے یہ تو ہم پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جناب خواہماری پہلی ماں (بھی) آدم سے پیدا ہوئی ہیں (جیسا کہ تورات کی فصل دوم سفر تکوین میں آیا ہے) لیکن چونکہ آدم - و حوا روایات اسلامی کے مطابق ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور دونوں ایک ہی جنس اور ایک ہی نوع ہیں لہذا نفس واحدہ کے الفاظ اُن پر بولے گئے ہیں (ہم سورہ نساء کی ابتداء میں بھی اس بارے میں بحث کر چکے ہیں)

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: افراد بشر کی ایک جماعت مستقر ہے اور ایک جماعت مستودع ﴿فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ﴾۔
 ”مستقر“ مادہ ”قر“ (بروزن ”حصر“) سے سردی کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی سردی کہ جس کی ہوا تیز اور سخت ہو وہ انسان اور دوسرے موجودات کو حانہ نشین کر دیتی ہے۔ تو یہ لفظ سکون و توقف اور کسی جگہ قرار پانے کے معنی میں آیا ہے اور ”مستقر“ ثابت اور پائیدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

”مستودع“، ”دوع“ (بروزن ”منع“) کے مادہ سے ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بنا پر ناپائیدار امور بہت جلد اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں لہذا یہ لفظ ناپائیدار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور ودیعہ (امامت) کو اس لیے ودیعہ کہتے ہیں کہ اُسے اپنی جگہ ترک کرنا چاہیے اور اصل مالک کی طرف پلٹ جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض انسان پائیدار ہیں اور بعض ناپائیدار اور اس بارے میں کہ یہاں ان دونوں تعبیرات سے کیا مراد ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن ان

میں سے چند تفاسیر جو اپنی اصل حالت پر رہتے ہوئے بھی آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور ان سب کو ہی آیت کی تفسیر کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے اور وہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ ”مستقر“ سے مراد وہ انسان ہیں کہ جن کی خلقت کامل ہوئی ہے اور وہ رحم مادر میں رہے ہیں یا روئے زمین پر قدم رکھا ہے۔ اور مستودع ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی غفلت ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی اور وہ نطفہ کی صورت میں آباؤ اجداد کے صلب میں ہی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”مستقر“ روح انسان کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک ناپائیدار و برقرار چیز ہے اور ”مستودع“ جسم انسانی کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار اور فانی ہے۔

بعض روایات میں ان دونوں تعبیرات کے لیے ایک معنوی تفسیر بھی بیان ہوئی ہے کہ ”مستقر“ ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو پائیدار ایمان کے حامل ہیں اور ”مستودع“ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار ایمان رکھتے ہیں^(۱)

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مذکورہ بالا دونوں تعبیریں نطفہ انسان کو تشکیل دینے والے اجزائے اولیہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نطفہ انسان دو اجزاء ایک نطفہ مادہ (OVUM) اور دوسرا نطفہ نر (SPERM) سے تشکیل پاتا ہے، مادہ کا نطفہ تو رحم میں تقریباً ثابت اور مستقر ہے، لیکن نر کے نطفے متحرک جانداروں کی شکل میں اس کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں (SPERM) کا پہلا فرد جو (OVUM) تک پہنچتا ہے وہ اُس میں داخل ہو جاتا ہے اور باقی کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتا ہے اور یوں انسان کے تخمہ اولی کی تشکیل ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ کہا گیا ہے: ہم اپنی نشانیوں کو ایک ایک کمر کے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ جو لوگ سمجھدار اور صاحب ادراک ہیں وہ سمجھ لیں ﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ﴾۔

لغت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”فقہ“ ہر قسم کے علم و فہم کو نہیں کہتے بلکہ موجودہ معلومات سے غائب کی معلومات کا کھوج نکالنے کو کہتے ہیں^(۲) اس بنا پر ان طرح طرح کے چہروں اور مختلف جسمانی و روحانی قیافوں کے ساتھ انسان کی خلقت کی طرف توجہ کرنا اس لائق ہے کہ نکتہ سنخ افراد اس میں غور کریں اور اپنے خدا کو پہچانیں۔

دوسری آیت وہ آخری آیت ہے جو ان بحثوں کے سلسلے میں ہمیں جہان خلقت کے عجائبات کے ذریعہ خدا شناسی کی دعوت دیتی ہے۔

شروع میں پروردگارِ عالم کی اہم ترین اور بنیادی ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت کی طرف کہ جسے تمام نعمتوں کی اصل، جڑ، بنیاد اور ماں سمجھا سکتا ہے اشارہ کیا گیا ہے اور وہ نباتات (سرسبز پودے) اور درختوں کا بننا اور رشد و نمو کرنا ہے، چنانچہ یہ آیت کہتی ہے: وہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾۔

جو یہ کہتا ہے کہ آسمان کی طرف سے (یعنی اوپر کی طرف سے، کیونکہ لغت عرب میں آسمان ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو اوپر کی طرف قرار پاتی ہو) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روئے زمین میں پانی کے جتنے بھی منابع ہیں چاہے وہ چشمے ہوں یا دریا، نہریں ہوں یا گہرے کنوئیں، سب کے سب آخر کار ربارش کے پانی کے محتاج ہیں۔ اسی لیے بارش کی کمی اُن سب پر اثر انداز ہوتی ہے اور اگر خشک سالی طول پکڑ لے تو وہ سب کے سب خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بارش کے ایک واضح اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: اسی کے ذریعہ سے تمام اُگنے والی چیزوں کو ہم نے زمین سے نکالا ہے ﴿فَأَخْرَجْنَا بِهِ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ﴾۔

مفسرین نے ”نبات کُلِّ شَيْءٍ“ (ہر چیز کی گھاس) کی تفسیر میں دو احتمال کا ذکر کیا ہے۔ پہلا یہ کہ اس سے مراد ہر نوع اور ہر قسم کی ایسی نباتات ہیں جو ایک ہی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور ایک ہی زمین اور ایک ہی قسم کی مٹی میں پرورش پاتی ہیں اور یہ چیز آفرینش کے عجائبات میں سے ہے کہ یہ تمام قسم قسم کی نباتات اپنے خواص میں مکمل طور پر مختلف ہونے اور بعض اوقات متضاد ہونے اور مختلف شکلوں میں ہونے کے باوجود سب کی سب ایک ہی زمین میں اور ایک ہی پانی سے کیسے پرورش پاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہ نباتات ہیں جن کی ہر کسی کو حاجت اور ضرورت ہے۔ یعنی پرندوں، چوپاؤں، حشرات اور دریائی و صحرائی جانوروں میں سے ہر ایک ان نباتات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اور یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک ہی زمین سے اور ایک ہی پانی سے ہر ایک ضرورت کے مطابق غذا مہیا کی ہے اور یہ قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے کہ فی المثل ایک ہی معین مادے سے ایک باورچی خانہ میں ہزاروں قسم کی مختلف سلیقہ اور مزاجوں کے لوگوں کے لیے مہیا کرتی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ نہ صرف صحراؤں کی اور خشکیوں کی گھاس اور سبزے بارش کے پانی کی برکت سے پرورش پاتے ہیں بلکہ بہت سی ایسی چھوٹی نباتات جو سمندر کے پانی کی موجوں کے درمیان اُگتی ہیں اور

سمندر میں رہنے والی مچھلیوں کی عمدہ خوراک بنتی ہیں، وہ بھی نورِ آفتاب اور بارش کے قطروں کے اثر سے رشد و نمو حاصل کرتی ہیں۔ میں یہ بات بھولتا نہیں ہوں کہ خلیج فارس کے جزائر کا رہنے والا ایک شخص جو شکار کی کسی کی شکایت اس کی علت و سبب کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مچھلی کے شکار کی کمی خشک سالی کے سبب سے ہے اور وہ اس بات کا معتقد تھا کہ سمندر کے اندر بارش کے قطروں کا حیات بخش اثر خشکیوں میں بارش کے اثر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

اس کے بعد اس جملے کی شرح کرتے ہوئے قرآن گہیوں اور درختوں کے ایسے اہم مواقع کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو بارش کے پانی کے ذریعہ پرورش پاتے ہیں پہلے کہتا ہے: ہم نے اُس (بارش کے پانی) کے ذریعہ گہیوں اور نباتات کے سبز تنوں کو زمین سے نکالا ہے اور چھوٹے سے خشک دانے سے ایسا تروتازہ اور سرسبز پیدا کیا ہے کہ جس کی لطافت (وزاکت) اور زیبائی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے ﴿فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ حَضِرًا﴾^(۳)

”اور اُن سبز ڈنٹھلوں اور تنوں سے ایسے دانے کہ جو ایک دوسرے کے اوپر (موتیوں کی طرح) چنے ہوئے ہوتے ہیں (جیسے مکئی اور گندم کے خوشوں میں) باہر نکالتے ہیں ﴿تُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا﴾“^(۴)

اسی طرح اس کے ذریعے کھجور کے درختوں سے سربستہ خوشے باہر نکالتے ہیں جس کے شگافتہ ہونے کے بعد باریک اور خوبصورت دھاگے جو خرما (کھجور) کے دانوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور بوجھ کی وجہ سے نیچے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں، باہر نکلتے ہیں ﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾۔

”طلع“ کا معنی کھجور کا سربستہ خوشہ ہے جو ایک خوبصورت سبز رنگ کے غلاف میں لپٹا ہوتا ہے اور اس کے شگافتہ ہونے اور پھٹ جانے سے اس کے درمیان سے باریک سے دھاگے باہر نکل آتے ہیں اور وہی دھاگے بعد میں کھجور کے خوشوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ ”قنوان“ جمع ہے اور ”قنو“ (برزون ”صنف“) کی جو انہی باریک اور لطیف دھاریوں اور دھاگوں کی طرف اشارہ ہے۔

”دانیہ“ نزدیک کے معنی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان دھاگوں کے ایک دوسرے کے قریب ہونے کی طرف اشارہ ہو، یا زیادہ بوجھ کی وجہ سے ان جھکنا مراد ہو۔

اسی طرح ہم نے انگور، زیتون اور انار کے باغوں کی پرورش کی ہے ﴿وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ﴾۔

اس کے بعد عالم آفرینش کے ایک اور شاہکار کی طرف جس کا تعلق انہی درختوں کے ساتھ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ ایک دوسرے ساتھ شباهت رکھتے ہیں اور نہیں بھی سمجھتے ﴿مُشْتَبِهًا وَعَيْرَ مُتَشَابِهٍ﴾۔

اسی سورہ کی آیت ۱۴۱ کی طرف توجہ کرتے ہوئے جس میں تشابہ اور غیر تشابہ کے وصف کا ذکر زیتون اور انار کے لیے کیا گیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی مذکورہ صفت انہی دو درختوں کے بارے میں ہے^(۵)۔ یہ دونوں درخت ظاہری شکل نیز شاخوں اور پتوں کی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ شبہا بہت رکھتے ہیں۔ جبکہ پھل، ذائقہ اور خاصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ان میں فرق ہے۔ ان میں سے ایک موثر اور قوی روغنی مادہ رکھتا ہے اور دوسرے میں ترش یا میٹھا مادہ ہوتا ہے جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں، علاوہ ازیں بعض اوقات یہ دونوں درخت ایک ہی زمین میں پرورش پاتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں (یعنی ان دونوں صفات میں سے ہر ایک درختوں اور پھلوں کے ایک گروہ کے لئے ہے، لیکن پہلی تفسیر کے مطابق دونوں صفات ایک ہی چیز کے لیے تھیں۔

اس کے بعد بحث کو پیکر درخت کے اعضاء سے موڑتے ہوئے ان کے پھلوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: ایک نظر درخت کے پھل کی طرف کرو جب کہ وہ ثمر آور ہوئے، اور اسی طرح اس کے پکنے کی کیفیت کی طرف نگاہ کرو کہ ان میں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں خدا کی قدرت و حکمت کی واضح نشانیاں موجود ہیں ﴿انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ إِنَّ فِي ذَلِكُمْ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾۔

اس بات کی کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو آج کے زمانے میں نباتات کی تحقیق کے بارے میں پھلوں کی پیدائش کی کیفیت اور ان کے پکنے کے سلسلے میں کہا گیا ہے، وہ خاص نکتہ جس کا قرآن پھل کے بارے میں ذکر کرتا ہے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھلوں کا پیدا ہونا بعینہ جانداروں میں بچہ پیدا ہونے کی طرح ہے۔ مرنطفے مخصوص ذرائع سے (ہوا کے چلنے یا حشرات وغیرہ کے سبب سے) مخصوص تھیلیوں سے جدا ہوتے ہیں اور نباتات کے مادہ حصہ پر جا پڑتے ہیں۔ عمل تلقیح انجام پانے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانے کے بعد پہلا بیج تشکیل پاتا ہے اور کئی قسم کے مواد غذائی اسے اطراف میں گوشت کی طرح آغوش میں لے لیتے ہیں۔ یہ مواد غذائی ساخت کے لحاظ سے بہت ہی متنوع اور مختلف ہیں۔ اسی طرح ذائقہ اور غذائی و طبی خواص کے لحاظ سے بھی بہت مختلف ہیں، کبھی ایک پھل (مثلاً انار اور انگور) میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں کہ جن میں سے ہر دانہ خود جنین اور ایک درخت کا بیج شمار ہوتا ہے اور اس کی ساخت بہت ہی پیچیدہ اور اندر ہی اندر ہوتی ہے۔

انار کی ساخت

تمام پھلوں کی ساخت اور ان کے غذائی و دوائی مواد اس بحث کی گنجائش سے خارج ہیں۔ لیکن کوئی حرج نہیں ہے کہ نمونہ کے طور پر انار کے پھل کی ساخت کی طرف اشارہ کیا جائے کہ جس کی طرف قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے۔

اگر ہم انار کو چیزیں اور اس کا ایک چھوٹا سا دانہ ہاتھ میں لے کر اُسے آفتاب یا چراغ کے سامنے رکھیں اور صحیح طور پر اس میں غور و فکر کریں تم ہم دیکھیں گے کہ وہ چھوٹے چھوٹے حصوں سے بنا ہوا ہے کہ جو انتہائی چھوٹی چھوٹی شیشیوں کا مانند، انار کے پانی کی ایک خاص مقدار لیے، ایک دوسرے کے پاس چن دی گئی ہیں، انار کے ایک چھوٹے سے دانے میں شاید اس قسم کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شیشیاں موجود ہیں۔ پھر ان کے اطراف کو ایک باریک چھلکے کے ساتھ جو انار کے ایک دانے کا چھلکا ہے گھیرا ہوا ہے۔ پھر اس غرض سے کہ یہ بستہ بندی کامل تر، محکم تر اور خطرے سے دور تر رہے، انار کے دانوں کی ایک خاص تعداد کو ایک ستون پر ایک خاص نظام کے ساتھ چن دیا گیا ہے اور ایک سفید رنگ کا پردہ جو نسبتاً موٹا ہے اس کے اطراف میں لپیٹ دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک موٹا اور محکم چھلکا جو دونوں طرف سے خاص قسم کا لعاب رکھتا ہے ان سب کے اوپر کھینچ دیا گیا ہے تاکہ وہ ہوا اور جراثیم کے نفوذ کو روکے اور ضربات سے بھی ان کی حفاظت کرے اور دانوں کے اندر موجود پانی کے بخارات بننے کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ کم کرے۔ یہ نازک اور عمدہ بستہ بندی انار کے دانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ دوسرے پھلوں مثلاً مالٹا اور لیموں وغیرہ میں بھی نظر آتی ہے لیکن انار اور انگور میں زیادہ عمدہ اور جاذب نظر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع بشر نے بھی سیال چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے اسی سے سبق سیکھا ہے کہ وہ پہلے چھوٹی چھوٹی شیشیوں کو ایک چھوٹے ڈبوں کو ایک جڑے کارٹون میں رکھ دیتے ہیں اور ان کے مجموعے کو ایک بڑے بندل کی صورت میں منزل مقصود کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

انار کے دانوں کے داخلی ستونوں پر قرار پکڑنے کی طرز اور اپنے حصہ کا پانی اور مواد غذائی اُن سے حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جنہیں ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان پھلوں کے ذرات کو (مائیکرو سکوپ) دوربین کے نیچے رکھ کر دیکھیں تو اس وقت ایک پُر غوغا جہاں عجیب و غریب اور حیرت انگیز بنیادوں اور تعمیرات کے ساتھ حد سے زیادہ منظم طریقے پر ہماری نظروں کے سامنے مسجّم ہو جاتا ہے۔ تو کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص چشم حقیقت بین کے ساتھ ایک پھل کی طرف نگاہ کرے

اور پھر یہ عقیدہ رکھے کہ اس کو بنانے والا علم و دانش نہیں رکھتا؟ اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں قرآن ”انظروا“ (نگاہ کرو) کے لفظ کے ساتھ اس قسم کے نباتات کے بارے میں دقتِ نظر اور غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے، انہی حقائق کی طرف توجہ کرنے کے لئے ہے۔

ایک طرف سے تو یہ حقائق اور دوسری طرف سے وہ مختلف مراحل جو ایک پھل کچی حالت میں لے پکنے کے موقع تک طے کرتا ہے، بہت ہی قابلِ ملاحظہ ہے، کیونکہ پھلوں کے اندر کی لیبارٹریاں ہمیشہ کام میں مشغول رہتی ہیں اور ترتیب دار اس کی کیمیائی ترکیب میں تبدیلی کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری مرحلہ تک جا پہنچے اور اس کی کیمیائی ترکیب صحیح صورت اختیار کر لے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر خالق کائنات کی عظمت و قدرت کی ایک نشانی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے رکھنا چاہیے کہ قرآن کی تعبیر کے مطابق صرف صاحبانِ ایمان افراد یعنی حق بین اور حقیقت جو ہی ان مسائل کو دیکھتے ہیں، ورنہ چشمِ عناد اور ہٹ دھرمی یا بے اعتنائی اور سہل انگاری کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ ان حقائق میں سے کسی ایک کو بھی نہ سکیں۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۷۵۰۔

۲۔ مفردات راغب، ص ۳۸۴۔

۳۔ ”خضر“ بمعنی ”اخضر“ یعنی ”سبز رنگ“ ہے اس بنا پر تمام سبزوں کو یہاں تک کہ درختوں کی کوپلوں کو بھی شامل ہے لیکن اوپر والی آیت سے چونکہ اس میں غذائی دانوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خصوصیت سے زراعت مراد ہے۔

۴۔ ”مترکب“ ”رکوب“ کے مادہ سے ”سواری“ کے معنی میں یعنی ایسے دانے جو ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں اور زیادہ تر غذائی دانے ایسے ہیں۔

۵۔ راغب کتاب ”مفردات“ میں کہتا ہے: ”مُسْتَبْهًا وَعَبْرَ مُسْتَبَاهٍ“ و ”مُسْتَبْهًا وَعَبْرَ مُسْتَبَاهٍ“ تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

آیات ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳

۱۰۰ ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ﴾۔

۱۰۱ ﴿بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾۔

۱۰۲ ﴿ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾۔

۱۰۳ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾۔

ترجمہ:

۱۰۰۔ انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک قرار دیئے ہیں، حالانکہ خدا نے اُن سب کو پیدا کیا ہے اور انھوں نے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں جھوٹ اور جہالت سے بنا رکھے ہیں، خدا اس بات سے منزہ و برتر ہے جو یہ اس کی توصیف (میں بیان) کرتے ہیں۔

۱۰۱۔ آسمانوں اور زمین کی ابداع کرنے اور (اور انھیں تازہ اور نیا وجود عطا کرنے والا) وہی ہے، کیسے ممکن ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے اور سب چیزوں کو اسی نے پیدا کیا ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

۱۰۲۔ ہاں! ایسا ہی ہی تمہارا خدا، تمہارا پروردگار، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (تم صرف) اسی کی عبادت کرو، اور وہ تمام موجودات کا حافظ اور مدبر ہے۔

۱۰۳۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتی، لیکن وہ سب آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، اور وہ (طرح طرح کی نعمتوں کا) عطا کرنے والا ہے (اور چھوٹے چھوٹے کاموں سے باخبر) اور (تمام چیزوں سے) آگاہ ہے۔

تمام چیزوں کا خالق وہی ہے
ان آیات میں مشرکین اور باطل مذہب رکھنے والوں کے کچھ غلط اور بیہودہ عقائد بیان کئے گئے ہیں اور ان کے منطقی جواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ جنوں میں سے خدا کے لئے شرکاء کے قائل ہو گئے ہیں (وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ)۔

اس بارے میں یہاں پر جن سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی جنس انسانی سے غائب اور پوشیدہ موجودات ہے یا خاص طور پر وہ جنات مراد ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے بارہا گفتگو کی ہے اور ہم اس کی طرف عنقریب اشارہ کریں گے، مفسرین نے اس سلسلہ میں دو احتمال بیان کئے ہیں۔

پہلے احتمال کی بنا پر ممکن ہے کہ آیت ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو فرشتوں اور ہر دکھائی نہ دینے والی چیز کی پرستش کرتے تھے، لیکن دوسرے احتمال کی بنا پر آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو گمراہ جنات کا خدا کا شریک یا اس کی بیوی سمجھتے تھے۔

”کلبی“ ”الاصنام“ میں نقل کرتے ہیں کہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ جا کا نام ”بنو طیج“ تھا کہ جو قبیلہ ”غزاعہ“ کی شاخ تھا جن کی پرستش کرتا تھا ^(۱) کہا جاتا ہے کہ ”جن“ کی عبادت اور اسکی الوہیت کا عقیدہ قدیم یونان اور ہندوستان کے بیہودہ اور فضول مذہب میں بھی پایا جاتا تھا ^(۲)۔

جیسا کہ سورہ صافات کی آیہ ۵۸ ہے: ﴿وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ نَسَبًا﴾۔

”وہ خدا اور جنات کے درمیان رشتہ داری کے قائل ہو گئے تھے“۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے درمیان کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو جنوں کی خدا کے ساتھ ایک قسم کی رشتہ داری کے قائل تھے۔

اور جیسا کہ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے جنات کے ساتھ شادی کی ہے اور فرشتے اس شادی کا نتیجہ اور ثمر ہے۔ ^(۳)

اس کے بعد اس فضول اور بیہودہ خیال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: حالانکہ خدا نے تو انھیں (یعنی جنات کو) پیدا کیا ہے (وَلَخَلَقْنَاهُمْ) یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کی مخلوق اسی کی شریک ہو جائے کیوں کہ شرکت ہم جنس اور ہم رتبہ ہونے کی علامت ہے حالانکہ مخلوق ہرگز خالق کی ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری بیہودہ بات یہ تھی کہ: وہ خدا کے لئے نادانی سے بیٹوں اور بیٹیوں کے قائل ہو گئے تھے (وَعَزَّوَالَهُ بَنِينَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ)۔

حقیقت میں ان بیہودہ عقائد کے باطل ہونے کی بہترین دلیل وہی ہے جو ”بغیر علم“ کے الفاظ سے معلوم ہوتی ہے یعنی کسی قسم کی کوئی دلیل اور نشانی ان خرافات و مہومات کے لئے ان کے پاس موجود نہ تھی۔

لائق توجہ بات یہ ہے کہ ”خرقوا“ ”خرق“ (بروزن غرق) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو اصل میں کسی چیز کو بے سوچے سمجھے اور بلاوجہ پارہ پارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیک لفظ ”خلق“ کے بالمقابل ہے جو کسی چیز کو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ (خلق اور خرق) کبھی کبھار گھڑے ہوئے اور جھوٹے مطالب کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ جو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے گھڑے گئے ہوں وہ تو خلق و اخلاق کہلاتے ہیں اور وہ جھوٹ جو بغیر کسی حساب اور اندازے کے اور اصطلاح کے مطابق شاخدار جھوٹ ہوں انھیں ”خرق و اختراق“ کہا جاتا ہے۔

یعنی انھوں نے یہ جھوٹ اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کئے بغیر اور اس کے لوازم پر نظر کئے بغیر گھڑا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ کونسے گروہ تھے جو خدا کے لئے بیٹوں کے قائل تھے، قرآن نے دوسری آیت میں دو گروہوں کے نام لئے ہیں۔ ایک عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے اور دوسری یہودی جو عزیرؑ کا خدا کا بیٹا سمجھتے تھے اور جیسا کہ سورہ توبہ کی آیہ ۳۰ سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے اور محققین معاصر کی ایک جماعت نے بھی عیسائیت اور بدھ مذہب کے مشترک اصولوں کو خصوصاً مسئلہ تثلیث میں مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ خدا کا بیٹا عیسائیوں اور یہودیوں میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ ان سے پہلے کے فضول و بیہودہ قسم کے مذاہب میں بھی موجود تھا۔ باقی رہا کہ بیٹیوں کے وجود کا عقیدہ تو خود قرآن نے دوسری آیات میں اس مطلب کو واضح کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ:

﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا﴾

”وہ فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں“ (زخرف: ۱۹)

جیسا کہ ہم سطور بالا میں بھی اشارہ کر چکے ہیں تفاسیر و تواتر میں ہے کہ قریش کا ایک گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ فرشتے خدا کی وہ اولاد ہیں جو خدا کی جنیات سے شادی کرنے کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔

لیکن اس آیت کے آخر میں قرآن نے ان بیہودہ مطالب اور موہوم و بے بنیاد خیالات پر قلم سرخ کھینچ دیا ہے اور ایک عمدہ اور بیدار کرنے والے جملے کے ساتھ ان تمام باطل باتوں کی نفی کردی ہے اور فرمایا ہے کہ: خدا (ان خرافات سے) منزہ ہے اور ان اوصاف سے برتر و بالاتر ہے جو وہ اس کے لئے بیان کرتے ہیں (سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ)۔

بعد والی آیت میں ان بیہودہ عقائد کا جواب دیتے ہوئے پہلے کہا گیا ہے: خدا وہ ہستی ہے کہ جس نے آسمان اور زمین کو ایجاد کیا ہے ﴿بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔

آیا کوئی اور بھی ایسا ہے کہ جس نے ایسا کام کیا ہو، یا ایسا کرنے کی قدرت ہی رکھتا ہو۔ جس کی بنا پر وہ عبودیت میں اس کا شریک سمجھا جائے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے، بلکہ سب اس کی مخلوق ہیں اور اسی کے تابع فرمان ہیں اور اسی کی ذات پاک کے سب محتاج ہیں۔

علاوہ ازاں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جب کہ اس کے بیوی ہی نہیں ہے ﴿اَنّٰی يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً﴾۔

اصولی طور پر اسے بیوی کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ بات کس کے لئے ممکن ہے کہ وہ اس کی (بیوی یا) ہمسرہ ہو سکے جب کہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اس کی ذات مقدس عوارض جسمانی سے پاک و منزہ ہے اور بیوی اور اولاد کا ہونا واضح طور پر جسمانی اور مادی عوارض میں سے ہیں۔

دوسری مرتبہ پھر تمام چیزوں اور تمام افراد کے بارے میں اسی کے خالق ہونے اور ان تمام کے متعلق اس کے احاطہ علمی کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا، اور وہ ہر چیز کا عالم ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾۔

تیسری زیر بحث آیت میں تمام چیزوں کا خالق ہونے، آسمان اور زمین کو ایجاد کرنے، اور اس عوارض جسم و جسمانی اور بیوی اور اولاد سے منزہ ہونے اور ہر کام اور ہر چیز پر اس کے احاطہ علمی کا ذکر ہونے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ”تمہارا خدا اور پروردگار ایسی ذات ہے اور چونکہ اور کوئی ان صفات کا حامل نہیں ہے لہذا اس کے سوا اور کوئی بھی عبودیت کے لائق نہیں ہو سکتا، پروردگار وہی اور خالق و آفریدگار بھی وہی ہے اس بنا پر معبود صرف وہی ہو سکتا ہے لہذا اسی کی پرستش و عبادت کرو ﴿ذَلِكُمْ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ﴾۔

آیت کے آخر میں اس مقصد کے پیش نظر اور اس غرض سے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی امید کو قطع کر دے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کو اور خدا کے سوا اور کسی پر بھی بھروسہ کرنے کو کلی طور پر ختم کر دے قرآن کہتا ہے: اور وہی تمام چیزوں کا حافظ و نگہبان و مدبر ہے ﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ﴾۔

اس بنا پر تمہارے مشکلات کے حل کی جا بیاں صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے سوا کوئی بھی شخص اس کام کی توانائی نہیں رکھتا، کیوں کہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کے محتاج اور نیاز مند ہیں اور اس کے احسان کی آس

لگائے بیٹھے ہیں تو ان حالات میں کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص اپنی مشکلات کسی اور کے پاس لے جائے اور اس کا حل اس سے چاہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں ”علیٰ کل شیء وکیل“ کہا گیا ہے نہ ”لکل شیء وکیل“ اور ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہے کیوں کہ لفظ ”علیٰ“ کا ذکر اس کے تسلط اور نفوذ امر کی دلیل ہے جب کہ لفظ ”لام“ کا استعمال تابع ہونے کی نشانی ہے۔

دوسرے لفظوں میں تعبیر اولولایت اور حافظ ہونے کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر نمائندگی کے معنی میں ہے۔ آخری زیر بحث میں تمام چیزوں پر اس کی حاکمیت اور نگہبانی کو ثابت کرنے کے لئے اور اسی طرح تمام موجودات سے اس کے فرق کو ثابت کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ تمام آنکھوں کا ادراک کرتا ہے وہ طرح طرح کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے کام سے باخبر اور آگاہ ہے، وہ بندوں کے مصالح کو جانتا ہے اور ان کی حاجات و ضروریات سے باخبر ہے اور اپنے لطف کرم کے مطابق ان کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾۔

حقیقت جو یہ چاہتا ہو کہ وہ تمام چیزوں کا محافظ و مربی اور سہارا ہو اسے ان صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ علاوہ از اس یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمام موجودات جہاں سے مختلف و متفاوت ہے کیوں کہ ان میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ جو دیکھتی بھی ہیں اور خود بھی دیکھی جاتی ہیں، جیسے انسان ہے اور کچھ ایسی ہیں جو نہ خود دیکھتی ہیں اور نہ ہی دیکھی جاتی ہیں، جیسے ہمارے اندرونی صفات، اور بعض ایسی ہیں کہ جنہیں دیکھا تو جاسکتا ہے لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں، جیسے جمادات، تنہا وہ ہستی ہے کہ جسے دیکھا تو نہیں جاسکتا لیکن وہ ہر چیز اور ہر شخص کو دیکھتی ہے صرف اسی کی ذات پاک ہے۔

۱۔ تفسیر فی ظلال، جلد سوم، صفحہ ۳۲۶ (پاورقی) (حاشیہ)۔

۲۔ تفسیر المنار، جلد ہشتم صفحہ ۶۴۸۔

۳۔ تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر زیر نظر آیہ کے ذیل میں۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ آنکھیں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں: عقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ خدا کو آنکھوں کے ساتھ ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا، کیونکہ آنکھیں صرف اجسام کو یا زیادہ صحیح طور پر کہ وہ ان کی بعض کیفیات کو ہی دیکھ سکتی ہے اور وہ چیز کہ جو نہ جسم ہے اور نہ ہی جسم کی کوئی کیفیت، ہرگز آنکھ سے نظر نہیں آسکتی، دوسرے الفاظ میں اگر کوئی چیز آنکھ سے دیکھی جاسکے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو اور کسی جہت میں ہو اور ماسدہ رکھتی ہو جب کہ وہ ان تمام باتوں سے (پاک اور) برتر ہے، وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جانا محدود ہے اور وہ اسی دلیل سے جہاں مادہ سے بالاتر ہے، کیوں کہ جہاں مادہ میں تمام چیزیں محدود ہیں۔

قرآن کی بہت سی آیات میں جن سے وہ آیات ہیں کہ جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں، اور ان کی طرف سے خداوند تعالیٰ کی رویت کا تقاضا کرنے کے متعلق گفتگو کرتی ہے، وہ کامل صراح کے ساتھ خدا کی رویت کے امکان کی نفی کرتی ہیں (جیسا کہ انشا اللہ اس کی تفصیل سورہ اعراف کی آیہ ۴۳ کی تفسیر میں آئے گی۔)

تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اگر اس جہاں میں نظر نہ آئے تو عالم قیامت میں اس کا دیدار ہو سکے گا، تفسیر المنار کے مولف کے بقول:

”هذا مذاهب اهل السنة والعالم بالحديث“

”یہ عقیدہ اہل سنت اور علماء حدیث کا ہے۔“^(۱)

اور اس کے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ محققین معاصر تک بھی یعنی ان کے روشن فکر حضرات بھی اسی نظریہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات تو وہ بڑی سختی کے اس عقیدہ پر جم جاتے ہیں۔

حالانکہ اس عقیدہ کا باطل ہونا اس قدر واضح ہے کہ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیوں کہ دنیا و آخرت میں (معاد جسمانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں، کیا وہ خدا جو ایک مافوق مادہ وجود ہے قیامت کے دن ایک مادی وجود میں تبدیل ہو جائے گا؟ اور اس نامحدود مقام سے محدود مقام میں تبدیل ہو جائے گا؟ کیا وہ اس دن جسم یا عوارض جسم میں بدل جائے گا؟ کیا خدا کی رویت کے عدم امکان کے بارے میں دلائل عقلی دنیا و آخرت کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق ظاہر کرتے ہیں؟ درانحالیکہ عقل کا فیصلہ اس بارے میں ناقابل تبدیل ہے۔

اور یہ عذر جو ان میں سے بعض نے اختیار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ انسان دوسرے جہان میں ایک دوسرا ادراک اور نظر پیدا کر لے، ایک ایسا عذر ہے کہ جو کامل طور پر بلا دلیل ہے کیوں کہ اگر اس ادراک و نظر سے مراد فکری و عقلی نظر ہے، تو وہ تو اس جہان میں وجود رکھتی ہے اور دل کی آنکھ اور عقل کی قوت سے خدا کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اگر اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہے کہ جس سے جسم کو دیکھا جاسکتا ہے تو ایسی چیز خدا کے بارے میں محال ہے چاہے وہ اس دنیا میں ہو یا دوسرے جہان میں، اس بنا پر مذکورہ گفتگو کہ انسان اس جہان میں تو خدا کو نہیں دیکھتا، لیکن مومنین قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے، ایک غیر منطقی اور ناقابل قبول گفتگو ہے، غالباً تنہا ایک چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ جو اس عقیدہ کا دفاع کرے، یہ ہے کہ کچھ احادیث میں ان کی معروف کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، قیامت میں خدا کی رویت کا امکان بیان ہوا ہے م لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ عقل کے فیصلہ کی رو سے اس موضوع کے باطل ہونے کو ان روایات کے جعلی ہونے اور ان کتابوں کے غیر معتبر ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جن میں اس قسم کی روایات بیان کی نقل کی گئی ہیں، سوائے اس صورت کہ ان روایات کا معنی دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرنا ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی احادیث کی وجہ سے عقل و خرد کے فیصلہ کو چھوڑ دیں اور اگر قرآن کی بعض آیات میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جن سے ابتدائی نظریں رویت خدا کے مسئلہ کا اظہار ہوتا ہے جیسے: ﴿وَجُوهٌ يُّؤَمِّنُونَ نَاصِرَةٌ، اِلٰى رَحْمٰتٍ نَّاطِرَةٌ﴾

”اس دن کچھ چہرے پر تراوت اور پر رونق ہوں گے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“ (۲)

یہ تعبیرات ایسی ہے جیسے: ﴿يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ ”خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے“۔ (۳)

یہ تعبیرات کنایہ کا پہلو رکھتی ہیں کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی کوئی آیت کبھی بھی عقل خرد کے حکم و فرمان کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

قابل وجہ بات یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں اس فضول عقیدہ کی شدت کے ساتھ نفی کی گئی ہے اور ایسے عقائد رکھنے والوں پر دنداں شکن تعبیرات کے ساتھ تنقید کی گئی ہے، منجملہ ان کے امام صادق علیہ السلام کے مشہور اصحاب میں سے ایک صحابی جن کا نام ہشام ہے، فرماتے ہیں:

میں امام صادق - کے پاس موجود تھا کی معاویہ بن وہاب (آپ کے ایک اور صحابی) وارد ہوئے اور کہنے لگے: اے فرزند رسول! آپ اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ جو رسول خدا کے بارے میں وارد ہوئی ہے کہ انھوں نے خدا

کو دیکھا؟ تو آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا؟ اور اسی طرح ایک دوسری حدیث کے بارے میں کہ جو آنحضرت سے نقل ہوئی ہے کہ مومنین بہشت اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، تو وہ کس طرح دیکھے گے؟۔

امام صادق علیہ السلام نے ایک (تلخ) تبسم کیا اور فرمایا: اے معاویہ بن وہاب! یہ بات کتنی جری ہے کہ انسان ستر اسی سال عمر گزرے خدا کے ملک میں زندگی بسر کرے اور اس کی نعمت کھاتا رہے اور اس کو صحیح طرح سے نہ پہچانے، اے معاویہ! پیغمبر نے ہرگز خدا کو اس آنکھ سے نہیں دیکھا، مشاہدہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک دل کی آنکھ سے دیکھنا اور (دوسرے) ظاہری آنکھوں سے دیکھنا، جو شخص دل کی آنکھ سے مشاہدہ کی بات کہتا ہے وہ تو صحیح کہتا ہے اور جو شخص ظاہری آنکھ سے خدا کے مشاہدہ کی بات کرتا وہ جھوٹ بولتا ہے اور خدا اور اس کی آیات کا کافرو منکر ہے، کیوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کو مخلوق کے مشابہ سمجھے وہ کافر ہے۔^(۴)

ایک اور روایت توحید صدوق میں اسماعیل بن فضل سے منقول ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا قیامت کے دن نظر آئے گا؟ آپ - نے فرمایا:

خداوند ایسی چیز سے منزہ ہے، اور بہت ہی منزہ ہے۔۔۔ ﴿اِنَّ الْاَبْصَارَ لَا تَدْرِكُ الْاَمَالَوْنَ وَلَكِیْفِیۡہِ وَاللّٰہُ خَالِقُ الْاَلْوَانِ وَالْکِیْفِیَّاتِ﴾ آنکھیں نہیں دیکھتی مگر ایسی چیزوں کو کہ جو رنگ و کیفیت رکھتی ہیں جب کہ خدا رنگوں اور کیفیات کا خالق ہے۔^(۵)

توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں خصوصیت کے ساتھ ”لون“ (رنگ) کا ذکر کیا گیا ہے اور آج کی دنیا میں ہم پر یہ مطلب واضح ہو چکا ہے کہ خود جسم نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا رنگ دیکھا جاتا ہے، اور اگر کوئی جسم کسی قسم کا رنگ نہیں رکھتا ہو تو وہ ہرگز دیکھا نہیں جائے گا (تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۴۶ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک بحث کر چکے ہیں۔^(۶)

۲۱۲۔۔۔۔ خدا ہی تمام چیزوں کا خالق ہے: بعض مفسرین اہل سنت نے جو عقیدہ کے لحاظ مذہب جبر کے قائل ہیں اوپر والی آیت کے ساتھ جو خدا نے تمام چیزوں کے خالق ہونے کو بیان کرتی ہے مسلک جبر پر استدلال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال و افعال بھی اس جہاں کی اشیاء میں سے ہیں، کیوں کہ ”شیء“ (چیز) ہر قسم کے وجود کو کہا جاتا ہے خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی، خواہ ذات ہو یا صفت، اس بنا پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے افعال کا بھی خالق اور یہ جبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن آزادی ارادہ و اختیار کے طرفدار اس قسم کے استدلال کا روشن اور واضح جواب رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی خالقیت ہمارے افعال کے بارے میں بھی ہمارے مختار ہونے کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں رکھتی، کیوں کہ ہمارے افعال کو ہماری طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور خدا کی طرف بھی، اگر ہم ان کی خدا کی طرف نسبت دیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اس کام کے تمام مقدمات ہمارے اختیار میں دے دیے ہیں، وہی ذات ہے جس نے ہمیں قدرت و طاقت اور ارادہ و اختیار دیا ہے، اس بنا پر چونکہ تمام مقدمات اسی کی طرف سے ہیں لہذا ہمارے اعمال اس کی طرف بھی منسوب کئے جاسکتے ہیں اور اسے ان کا خالق جان سکتے ہیں، لیکن اس نظر سے کہ آخری ارادہ ہماری ہی طرف سے ہے، وہ ہم ہی ہیں کہ جو خدا کی دی ہوئی قدرت و اختیار سے استفادہ کرتے ہیں اور فعل یا ترک میں سے کسی ایک کا انتخاب ہم ہی کرتے ہیں تو اس سبب سے افعال کی نسبت ہماری طرف دی جاتی ہے اور ہم ان کے لئے جوابدہ ہیں۔

فلسفی تعبیر کے مطابق یہاں دو خالق اور دو علتیں ایک دوسرے کے عرض میں نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں، دو علت تامہ کا ایک ہی عرض میں ہونا کوئی مفہوم نہیں رکھتا، لیکن اگر طویل ہوں تو کوئی مانع نہیں ہے، چونکہ ہمارے افعال ان مقدمات کا لازمہ ہیں جو خدا نے ہمیں دیے ہیں، تو ان لوازم کی اس کی طرف بھی نسبت دی جاسکتی ہے اور اس شخص کی طرف بھی کہ جس نے افعال کو انجام دیا ہے۔

اس گفتگو کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنے کارندوں کو آزمانے کے لئے انہیں اپنے کام میں آزاد چھوڑ دے، اور انہیں مکمل اختیار دیدے اور کام کے تمام مقدمات انہیں مہیا کر دے، اب یہ بات ظاہر ہے کہ جو کام وہ انجام دیں گے ابک لحاظ سے ان کے سربراہ کا کام شمار ہوگا لیکن یہ امر کارندوں سے آزادی و اختیار کو سلب نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے کام کے بارے میں جوابدہ ہیں، عقیدہ جبر و اختیار کے بارے میں ہم انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔^(۷)

یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے، ہم سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۷ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ صفحہ ۱۱۲، اردو ترجمہ پر) تفصیل سے اس سوال کے جواب میں بحث کر چکے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ جو ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام موجودات کو خدا سے عدم سے وجود میں لایا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ”عدم“ وہ مادہ ہے کہ جو موجودات عالم کو تشکیل دینے والا ہے، جس طرح سے ہم یہ کہتے ہیں کہ بڑھتی نے

میز کو لکڑی سے بنایا ہے، ایسی چیز یقیناً محال ہے، کیوں کہ عدم وجود کا مادہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس جہان کی یہ تمام موجودات پہلے موجود نہیں تھیں اس کے بعد وجود میں آئی ہیں، یہ امر کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں رکھتا، اور سلسلے میں ہم نے جلد اول میں بھی کچھ مثالیں بیان کی ہیں اور یہاں پر مزید بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے فکر و ذہن میں کچھ ایسی موجودات کو پیدا کر سکتے ہیں جو پہلے کسی صورت میں بھی ہمارے ذہن میں نہیں تھیں، اس میں شک نہیں کہ یہ ذہنی موجودات اپنے لئے ایک قس، کا وجود و ہستی رکھتی ہے، اگر وہ وجود خارجی کی طرح نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ ہمارے افق میں موجود نہیں ہوتی ہے، اگر کسی چیز کا وجود عدم کے بعد محال ہو تو وجود ذہنی اور وجود خارجی کے درمیان کیا فرق ہے اس بنا پر جس طرح ہم اپنے ذہن میں ایجاد و خلق کر لیتے ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں، خداوند تعالیٰ بھی عالم خارج میں ایسا ہی کام کرتا ہے، اس مثال اور ان مثالوں میں جو ہم جلد اول میں بیان کر چکے ہیں تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔

۴۔ لطیف کا معنی کیا ہے: اوپر والی آیات میں خداوند تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ”لطیف“ کا ذکر ہوا ہے اور وہ مادہ لطف سے ہے، جب وہ اجسام کے بارے میں استعمال ہو تو وہ ہلکا ہونے کے معنی میں ہے، جو بوجھل کے مقابلہ میں ہے، اور جس وقت حرکات کے بارے میں (حرکت لطیفہ) استعمال ہو تو ایک چھوٹی سی جلد گزر جانے والی حرکت مراد ہوتی ہے، اور کبھی ایسے موجودات اور کاموں پر بھی جو بہت دقیق اور باریک ہوتے ہیں اور جو قوت حس سے قابل ادراک نہیں ہوتے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور اگر ہم خدا کی لطیف کے نام تو صیف کرتے ہیں تو وہ بھی اسی معنی میں ہے یعنی وہ ایسی نظر نہ آنے والی اشیاء کا خالق اور ایسے افعال کا موجد ہے کہ جو قوت سماعت کے دائرے سے باہر ہے، بہت ہی باریک ہے اور حد سے زیادہ دقیق ہے۔

اس سلسلے میں ایک قابل توجہ حدیث فتح بن یزید جرجانی کے واسطے سے امام علی بن موسیٰ رضا - سے نقل ہوئی ہے جو ایک علمی معجزہ شمار ہوتی ہے حدیث اس طرح ہے کہ امام - فرماتے ہیں:

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا لطیف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے لطیف مخلوقات کو پیدا کیا اور اس سبب سے ہے کہ وہ لطیف و ظریف اور نظر نہ آنے والی اشیاء سے آگاہ ہے، کیا تم اس کی صنعت کے آثار کو لطیف و غیر لطیف نباتات میں دیکھتے نہیں ہو؟ اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی مخلوقات و حیوانات اور باریک حشرات اور ان چیزوں میں جو ان سے بھی چھوٹی ہیں، ایسی موجودات کو کہ جو ہرگز آنکھوں سے دیکھی نہیں جاسکتی، اور اس قدر چھوٹی ہیں کہ ان کے فرما دہ

اور نئے اور پرانے بھی پہچانے نہیں جاتے، جب ہم اس قسم کے موضوعات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔۔۔۔ اور جو کچھ گہرے سمندروں میں، اور درختوں کی چھال کے نیچے اور بیابانوں اور صحراؤں میں موجود ہے ان پر نظر کرتے ہیں۔۔۔۔ اور یہ کہ ایسی ایسی موجودات بھی ہیں کہ جنہیں ہرگز ہماری آنکھیں نہیں دیکھتی اور اپنے ہاتھوں سے انہیں ہم چھو بھی نہیں سکتے تو ان تمام چیزوں سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا لطیف ہے۔^(۸)

اوپر والی حدیث جو جراثیم اور خردبینی حیوانات کی طرف اشارہ ہے اور پاسٹور کی پیدائش سے کئی صدیوں پہلے بیان ہوئی ہے لطیف کی تفسیر کو واضح کرتی ہے۔

اس لفظ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خدا کے لطیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذات پاک ایسی ہے جو ہرگز کسی کے بھی حس سے ادراک نہیں ہو سکتی اس بنا پر وہ لطیف ہے کیوں کہ کوئی شخص بھی اس کی ذات سے آگاہ نہیں ہے اور خیر ہے چونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ ہے، اس معنی کی طرف بھی بعض روایات اہل بیت علیہم السلام میں اشارہ ہوا ہے،^(۹) اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہئے کہ اس لفظ کے دونوں ہی معنی مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

۱۔ تفسیر المنار، جلد ۷، صفحہ ۶۵۳۔

۲۔ قیامت: ۲۳ و ۲۴۔

۳۔ فتح: ۱۰۔

۴۔ معانی الاخبار بنا بہ نقل المیزان جلد ۸، صفحہ ۲۶۸۔

۵۔ نور الثقلین جلد اول، صفحہ ۷۵۳۔

۶۔ دیکھئے اردو ترجمہ صفحہ ۱۸۳۔

۷۔ کتاب ”خدا را چگونه بشناسیم“ کی فصل جبر و اختیار کی طرف بھی رجوع فرما سکتے ہیں۔

۸۔ بدیع کا کیا معنی ہے: جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ لفظ ”بدیع“ کا معنی کسی چیز کو بغیر سابقہ کے وجود میں لانے والے کے ہیں، یعنی خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین کو کسی پہلے سے موجود مادہ یا بنیاد یا نقشہ و منصوبہ کے بغیر ایجاد کیا ہے۔

۹۔ اصول کافی، جلد اول صفحہ ۹۳۔

۱۰۔ تفسیر بہان، جلد اول، صفحہ ۵۴۸۔

آیات ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷

۱۰۴ ﴿قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِخَفِيضٍ﴾

۱۰۵ ﴿وَكَذَلِكَ نُنْصِرُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾

۱۰۶ ﴿اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾

۱۰۷ ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ﴾

ترجمہ:

۱۰۴۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے واضح دلیلیں آئی ہیں، جو شخص (اس کے ذریعہ سے حق کو) دیکھے تو یہ اسی کے فائدہ میں ہے اور جو شخص ان کو دیکھنے سے آنکھیں بند کر لے تو خود اسی کا نقصان ہے اور میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔

۱۰۵۔ اور ہم آیات کو اس طرح مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں، اور انہیں کہنے دو کہ تو نے سبق پڑھا ہے (اور تو نے ان کو کسی دوسرے سے سیکھا ہے) ہمارا ہدف یہ ہے کہ ہم علم آکاہی رکھنے والوں کے لئے اسے واضح کر دیں۔

۱۰۶۔ جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر وہی ہوئی ہے اس کی پیروی کرو اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اور مشرکین سے منہ پھیر لو۔

۱۰۷۔ اگر خدا چاہتا (تو سب جبری طور پر ایمان لے آتے اور کوئی بھی) مشرک نہ ہوتا، اور ہم نے تجھے ان کے اعمال کا جوابدہ قرار نہیں دیا، اور تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرتے۔

تفسیر

بینمبر مجبور نہیں کرتے

در حقیقت ان آیات میں گزشتہ آیات کا ایک طرح سے خلاصہ اور نتیجہ پیش کیا گیا ہے، پہلے کہا گیا ہے: تمہارے پاس توحید، خدا شناسی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں ایسی واضح و روشن دلائل اور نشانیاں آچکی ہیں جو بصیرت و بینائی کا سبب ہے ﴿قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ﴾۔

”بصائر“ جمع ہے ”بصیرت“ کی ”بصر“ کے مادہ سے دیکھنے کے معنی میں لیکن عام طور پر یہ لفظ فکری و عقلی بصیرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، بعض اوقات ان تمام امور پر اس کا اطلاق ہوتا کہ جو کسی مطلب کے ادراک و فہم کا باعث ہو، زیر نظر آیت میں یہ لفظ دلیل، شاہد اور گواہ کے معنی میں آیا ہے، اور ان تمام دلائل کو جو گزشتہ آیات میں خدا شناسی کے سلسلہ میں بیان کی جا چکی ہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے بلکہ سارا قرآن اس کے مفہوم میں موجود ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کرنے کے لئے یہ دلائل حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے کافی ہیں اور منطقی پہلو رکھتے ہیں، کہا گیا ہے: اور لوگ جو ان دلائل کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیں تو انھوں نے خود اپنے ہی نفع کی طرف قدم بڑھایا ہے اور وہ لوگ جو اندھوں کی طرح ان کے مشاہدہ سے اپنے آپ کو محروم رکھے انھوں نے اپنے ہی نقصان میں کام کیا ہے ﴿مَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا﴾۔

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کی زبانی کہا گیا ہے: میں تمہارا نگہبان اور محافظ نہیں ہوں ﴿وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ﴾۔ اس بارے میں کہ اس جملے سے مراد کیا ہے، مفسرین نے دو احتمال ظاہر کئے ہیں۔

پہلا یہ کہ میں تمہارے کاموں کا محافظ و نگہبان اور جوابدہ نہیں ہوں، بلکہ خدا ہی سب کی نگہداری کرنے والا ہے اور وہی ہر شخص کو جزا و سزا دے گا، میرا فریضہ تو صرف رسالت کو پہنچانا اور لوگوں کی ہدایت کے لئے جتنی زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش ہو سکتی ہے، کرنا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں اس بات پر مامور اور تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں کہ میں تمہیں جبر و اکراہ سے طاقت سے اور زبردستی ایمان کی دعوت دوں، بلکہ میرا فریضہ تو صرف منطقی حقائق بیان کرنا ہے اور آخری تصمیم و ارادہ خود تمہارا اپنا کام ہے، اس امر میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ اس لفظ سے دونوں ہی معانی مراد لئے گئے ہوں۔

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید کے لئے کہ حق و باطل کے انتخاب کی راہ میں آخری ارادہ خود لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے فرمایا گیا: ہم آیات و دلائل کو اس طرح سے مختلف شکلوں، مختلف قیافوں اور مختلف صورتوں میں بیان کرتے ہیں ﴿وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ﴾^(۱)۔

لیکن ایک جماعت مخالفت پر کھڑی ہوگی، اور بغیر مطالعہ اور بغیر کسی قسم کی دلیل کے کہنے لگی: تو نے یہ درس دوسروں (یہود و نصاریٰ اور ان کی کتب) سے لئے ہیں ﴿وَلْيَقُولُوا دَرَسْتَ﴾^(۲)۔

پیغمبر پر اس نظر سے تہمت کہ آپ نے اپنی تعلیمات یہود و نصاریٰ سے حاصل کی ہے، ایک ایسی بات ہے جو مشرکین کی طرف سے بارہا کہی گئی ہے اور ہٹ دھرم مخالفین اب بھی ایسا کہتے رہتے ہیں حالانکہ اصولاً پورے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی درس مکتب اور علم تھا ہی نہیں کہ پیغمبر اسے حاصل کرتے اور جزیرہ نمائے عرب سے باہر پیغمبر کے سفر اس قدر کم تھے کہ جن میں اس قسم کے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہے، پورے حجاز کے اندر رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کی معلومات بھی اس قدر کم اور خرافات سے مخلوط تھی کہ وہ اصلاً اس قابل ہی نہ تھی کہ ان کا قرآن اور تعلیمات پیغمبر سے موازنہ کیا جائے، اس موضوع کے بارے میں ہم انشاء اللہ مزید وضاحت سورہ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بیان کریں گے۔

اس کے بعد مخالفین کی ہٹ دھرمیوں، کینہ پروریوں اور تہمتوں کے مقابلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیرا فریضہ یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کر، وہ خدا کے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے ﴿اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾۔

نیز تیرا فریضہ یہ ہے کہ ”مشرکین اور ان کی ناروا تہمتوں اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر“ ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾۔ حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اکرم کے لئے ایک قسم کی تسلی اور روحانی تقویت ہے تاکہ اس قسم کے مخالفین کے مقابلہ میں آپ کے عزم راسخ اور آہنی ارادہ میں ذرا سی بھی کمزوری واقع نہ ہو۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ ”واعرض عن المشرکین“ (مشرکین سے منہ پھر لو اور ان کی پرواہ نہ کرو) کا جملہ انھیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے حکم اور ان کے مقابلے میں جہاد کرنے سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی بے بنیاد باتوں اور تہمتوں کی پرواہ نہ کرو اور اپنی راہ حق پر ثابت قدم رہو۔

آخری زیر بحث آیت میں اس حقیقت کی دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ انھیں جبراً ایمان پر آمادہ کرے اور اگر وہ یہ چاہتا تو سب کے سب ایمان لے آتے اور کوئی مشرک نہ ہوتا ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا﴾۔ اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ تم ان کے اعمال کے لئے جوابدہ نہیں ہو اور تم انھیں ایمان پر مجبور کرنے کے لئے بھی مبعوث نہیں ہوئے ہو ﴿وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا﴾۔

جیسا کہ تمہارا یہ فرض بھی نہیں کہ تم انھیں کار خیر پر مجبور کرو ﴿وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ﴾۔

”حفیظ“ اور ”وکیل“ میں فرق یہ ہے کہ حفیظ تو اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو کسی شخص یا چیز کی نگہبانی کرے اور اسے زیان و ضرر پہنچنے سے محفوظ رکھے، لیکن وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے منافع کے حصول کے لئے جستجو اور کوشش کرے۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان دو صفات (حفیظ و وکیل) نفی دفع ضرر اور جلب منفعت پر مجبور کرنے کی نفی کے معنی میں ہے، اور نہ پیغمبر تبلیغ کے طریقے سے اور نیک کاموں کے بجالانے اور برے کاموں کے ترک کرنے کی دعوت کے ذریعہ ان دونوں فرائض کو ان کے موقع و محل پر اختیاری صورت میں انجام دیتے ہیں۔

ان آیات کا لب لہجہ اس نظر سے بہت ہی قابل ملاحظہ ہے کہ خدا پر اور مبانی اسلام پر ایمان لانا کسی قسم کا بھی جبری پہلو نہیں رکھ سکتا، بلکہ ان امور کو منطق و استدلال اور افراد بشر کی فکر و روح میں نفوذ کے طریق سے پیش رفت کرنا چاہئے، کیوں کہ جبری ایمان کی تو کوئی بھی قدر و قیمت نہیں ہے، اہم بات یہ ہے کہ لوگ حقائق کو سمجھیں اور اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ انہیں قبول کریں۔

قرآن نے بارہا مختلف آیات میں اس حقیقت پر تاکید کی ہے اور وہ ایسے سخت گیر اعمال سے جیسے کہ قرون وسطیٰ^(۳) میں کلیہ کے اعمال اور محکمہ تفتیش عقائد وغیرہ کے اعمال تھے اسلام کی بیگانگی کا اعلان کر رہا ہے، اور انشاء اللہ سورہ برائت کی ابتدا میں مشرکین کے مقابلہ میں اسلام کی سخت گیری کے علل و اسباب کو زیر بحث لایا جائے گا۔

۱۔ ”نصف“، ”تصریف“ کے مادہ سے دگرگوں کرنے اور مختلف شکلوں میں لانے کے معنی میں ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی آیات، مختلف لب و لہجہ، اور دل میں اتر جانے والے تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے، ایسے اشخاص کے لئے جو فکر عقیدہ اور تمام معاشرتی اور نفسیاتی پہلو سے مختلف سطح پر ہوتے ہیں، نازل ہوئی ہے۔

۲۔ لام ”لیقولوا“، اصطلاح کے مطابق (لام عاقبت) ہے، جو کسی کے سرانجام اور عاقبت کے بیان کے لئے لایا جاتا ہے، لیکن وہ اس کا اصلی ہدف نہیں ہوتا اور ”درست“ مادہ ”درس“ سے، حاصل کرنے اور قبضے میں لینے کے معنی میں ہے، اور یہ ایک تہمت تھی جو مشرک پیغمبر اکرم پر لگایا کرتے تھے۔

لیکن ایک اور دوسرا گروہ کہ جو حق کو قبول کرنے کی آمادگی رکھتا ہے اور جس کے افراد صاحب بصیرت، عالم و آگاہ ہیں، وہ اس کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیتے ہیں اور اسے قبول کر لیتے ہیں (وَلْيَسِّرْ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ)۔

۳۔ قرون وسطیٰ: ایک ہزار سالہ دور کو کہتے ہیں جو چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی عیسوی پر ختم ہوتا ہے، یہ زمانہ مغرب اور عیسائیت کا ایک تاریک ترین دور تھا، اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کا سنہری دور ٹھیک قرون وسطیٰ کے وسط میں ہوا ہے۔

۱۰۸ ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۰۸۔ ایسے لوگوں (کے معبود) کو جو خدا کے علاوہ کسی کو پکارتے ہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ (بھی) ظلم و جہالت کی وجہ خدا کو گالیاں دے نے لگ جائیں، ہم نے ہر امت کے لئے ان کے عمل کو اسی طرح زینت دی اس کے بعد ان کی بازگشت تو ان کے پروردگار کی طرف ہی ہے، اور وہ انھیں ان کے اس عمل سے جو وہ کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا (اور اس کی جزایا سزا دے گا)۔

تم مشرکین کے بتوں اور معبودوں کو کبھی گالیاں نہ دو

اس بحث کے بعد جو تعلیمات اسلامی کے منطقی ہونے، اور دعوت کے استدلال کے ذریعہ لازم ہونے اور جبری طریقہ سے نہ ہونے کے بارے میں گذشتہ آیات میں گزری ہے، ان آیات میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم مشرکین کے بتوں اور معبودوں کو کبھی گالیاں نہ دو کیوں کہ عمل سبب بن جائے گا کہ وہ بھی یہی کام خداوند تعالیٰ کی شان اقدس میں ظلم و ستم اور جہل و نادانی کی وجہ سے دینے لگیں ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾۔

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ مسئلہ بت پرستی و سخت برہمی کی بنا پر بعض اوقات مشرکین کے بتوں کو برا بھلا کہتے ہوئے انھیں گالیاں دیتا تھا، قرآن نے صراحت سے انھیں اس بات سے منع کیا، اور اصول ادب و عفت اور شیریں بیان کو پیہودہ ترین اور بدترین مذہب و ادیان کے مقابلہ میں بھی لازم و ضروری قرار دیا۔

اس موضوع کی دلیل واضح ہے کیوں کہ گالی دینے اور برا بھلا کہنے سے کسی کو غلط راستے سے نہیں پھرایا جاسکتا، بلکہ اس کے برعکس جہالت آمیز شدید تعصب جو اس قسم کے افراد میں ہوتا ہے اس بات بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بقول: ”روی دندہ لجاحت افتاده“ (یعنی اپنی ہسٹ دھرمی پر اڑ جانا) کے مطابق اپنے باطل دین اور زیادہ راسخ ہو جائے، اس صورت میں یہ بات آسان ہو جائے گی کہ خداوند تعالیٰ کی شان اقدس میں بدگوئی اور توہین کے لئے زبان کھولیں کیوں کہ ہر گروہ اور ہر مذہب کے لوگ اپنے عقائد و اعمال میں متعصب ہوتے، جیسا کہ قرآن بعد والے جملے میں کہتا ہے: ہم نے اس طرح ہر گروہ کے لئے ان کے عمل کو زینت دے دی ہے ﴿كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ﴾۔

اور آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: ان سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور وہ انھیں خبر دے گا کہ انھوں نے کون سے عمل انجام دے ہیں ﴿ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

قابل توجہ نکات

۱۔ خدا نینت دیتا ہے؟

اوپر والی آیت میں ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال کو اس کی نظر میں نینت دینے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی، ہو سکتا ہے کہ یہ بات بعض لوگوں کے لئے تعجب کا باعث ہو کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی کے عمل بد کو اس کی نظر میں نینت دے۔

اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ اس قسم کی تعبیرات عمل کی خاصیت اور اثر کی طرف اشارہ ہوتی ہے، یعنی جس وقت انسان کسی کام کو بار بار انجام دے تو آہستہ آہستہ اس کی قباحت اور بدی اس کی نگاہ میں ختم ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی نظر میں ایک عمدہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ علت العلل اور مسبب الاسباب اور ہر چیز کا خالق خدا ہے اور تمام تاثیرات خدا ہی کی طرف منتہی ہوتی ہیں لہذا قرآن کی زبان میں اس قسم کے آثار کی بعض اوقات اس کی طرف نسبت دے دی جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

زیادہ واضح تعبیر میں ”زین لکل امۃ عملھم“ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انھیں ان کے برے اعمال کے نتیجے میں گرفتار کر دیا ہے یہاں تک کہ برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں معلوم ہونے لگی۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جو بعض آیات قرآن میں عمل کو نینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے وہ بھی اس بات سے اختلاف نہیں رکھتی کیوں کہ شیطان انھیں برے عمل کے انجام دینے کا وسوسہ کرتا ہے اور وہ شیطان کے وسوسے کے سامنے جھک جاتے ہیں آخر کار وہ اپنے عمل کے نتائج بد میں گرفتار ہو جاتے ہیں، علمی تعبیر کے لحاظ سے سببیت تو خدا کی طرف سے ہے لیکن ایجاد سبب ان افراد اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے ہوتا ہے۔^(۱)

۲۔ گالیاں نہ دینے کا حکم:

اسلامی روایات میں بھی گمراہ اور منحرف لوگوں کو گالیاں نہ دینے کی قرآنی منطق کی پیروی کی گئی ہے اس لام کے بزرگ پیشواؤں اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہمیشہ منطق و استدلال کا سہارا لیں اور مخالفین کے اعتقادات کے بارے میں گالی دینے کے لالچ حاصل نہ بنائیں، ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ

السلام اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو جو جنگ صفین کے دنوں میں معاویہ کے پیروکار کو گالیاں دے رہی تھی، فرماتے ہیں: انی اکره ان تکونوا سبابین ولا کنکم لو وصفتہم اعمالہم وذکرتم حالہم کان اصوب فی القول وابلغ فی العذر۔
مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم فحش گوئی کرنے والے اور گالیاں دینے والے بنو، اگر تم گالیاں دینے کے بجائے، ان کی کارگزاریوں کو بیان کرو اور ان کے حالات کا تذکرہ کرو (اور ان کے اعمال کا تجزیہ و تحلیل کرو) تو یہ بات حق و راستی کے زیادہ قریب ہے اور اتمام حجت کے لئے بہتر ہے۔^(۲)

۳۔ بت پرست اور خدا کے بارے میں بدگوئی؟ بعض اوقات یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بت پرست خدا کے بارے میں بدگوئی کریں جب کہ ان کی اکثریت اللہ کا اعتقاد رکھتی تھی اور بتوں کا اس کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتی تھی۔ لیکن اگر ہم ہٹ دھرم اور متعصب عوام کی وضع و کیفیت میں غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ بات کوئی زیادہ تعجب کا باعث نہیں ہے اس قسم کے لوگ جب غصہ میں آجاتے ہیں تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ وہ مد مقابل کو جس طرح بھی ممکن ہو تکلیف اور دکھ پہنچائیں، چاہے اس کے لئے طرفین کے مشترک عقائد کی ہی بدگوئی کرنی پڑے، مشہور سنی عالم آلوسی تفسیر روح المعانی میں نقل کرتے ہیں کہ جاہل عوام میں سے بعض نے جب یہ دیکھا کہ شیعہ شیخین کو برا بھلا کہتے ہیں تو انھیں غصہ آگیا اور انھوں نے حضرت علیؑ کی شان میں گستاخی اور اہانت شروع کر دی، ایسے ایک شخص سے جب یہ پوچھا گیا کہ تو حضرت علیؑ کی جو تیری نزدیک بھی قابل احترام ہے کیوں اہانت کرتا ہے؟ تو وہ یہ کہنے لگا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ شیعوں کو اس طرح سے تکلیف اور دکھ پہنچاؤں، کیوں کہ میں نے انھیں اس چیز سے زیادہ اور کسی چیز کو دکھ دینے والا نہیں دیکھا اور بعد میں اسے اس عمل سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا۔^(۳)

۱۔ آیات قرآن میں ۸ مقامات پر برے اعمال کے زینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے اور دس ۱۰ مقامات پر فعل مجہول کی شکل میں (زین) آیا ہے اور دو مقامات پر خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے تینوں مقامات کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ نبج البلاغہ، کلام ۲۰۶ صبحی صلح۔

۳۔ تفسیر روح المعانی آلوسی جلد ۷ صفحہ ۲۱۸۔

آیات ۱۰۹، ۱۱۰

۱۰۹ ﴿وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لِّيُؤْمِنُوا بِهَا قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

۱۱۰ ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾

ترجمہ:

۱۰۹۔ انھوں نے بہت ہی اصرار سے اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی نشانی (معجزہ) ان کے لئے آجائے تو وہ یقینی طور پر اس پر ایمان لے آئیں گے (اے رسول تم یہ) کہہ دو کہ معجزات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں (اور یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمھاری خواہش پر معجزہ لے آؤں) اور تم نہیں جانتے کہ وہ معجزات کے آجانے کے باوجود ایمان نہیں لائے گے۔

۱۱۰۔ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اوندھا کر دیں گے کیوں کہ وہ ابتدا میں ایمان لائے تھے اور انھیں طغیان و سرکشی کے عالم میں خود ان کی حالت میں چھوڑ دے گے تاکہ وہ سرگرداں ہو جائیں۔

شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ قریش کا ایک گروہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ تم موسیٰ - اور عیسیٰ - کے بڑے بڑے معجزات بیان کرتے ہو اور اسی طرح دوسرے انبیاء کے بھی، تم بھی ہمیں کوئی ایسا ہی کام کر کے دکھاؤ تاکہ ہم ایمان لائیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم کونسا کام چاہتے ہو کہ میں اسے تمھارے لئے انجام دوں، انھوں نے کہا کہ تم خدا سے درخواست کرو کہ وہ کوہ صفا کو سونے میں تبدیل کر دے اور ہمارے بعض پہلے کے مرے ہوئے مردے زندہ ہو جائیں اور ہم ان سے تیری حقانیت کے بارے میں سوال کریں اور ہمیں فرشتے بھی دکھا جو تیرے بارے میں گواہی دیں یا خدا اور فرشتوں کا اکھٹا اپنے ساتھ لے آ۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر ان میں سے بعض کام انجام دے دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم ایسا کریں گے (یعنی ایمان لے آئیں گے) مسلمانوں نے جب مشرکین کا اس سلسلہ میں اصرار دیکھا تو پیغمبر سے تقاضا کیا کہ آپ ایسا کریں شاید یہ ایمان لے آئیں، جو نبی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کرنے

کے لئے آمادہ ہوئے کہ ان میں سے بعض مطالبات کے لئے خدا سے دعا کریں (کیوں کہ ان میں سے بعض تو نامعقول اور محال تھے) کہ امین وحی خدا نازل ہوئے اور یہ پیغام لائے کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی دعا قبول ہو جائے گی لیکن اس صورت میں (چونکہ ہر لحاظ سے اتمام حجت ہو جائے گا اور یہ حسی طور پر ظاہر بظاہر کھل کر سامنے آجائے گا) اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب کو سخت عذاب ہوگا (اور نیست و نابود ہو جائیں گے) لیکن اگر ان کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے اور تم انہیں ان کی اپنی اسی حالت پر چھوڑ تو ممکن ہے کہ ان میں سے بعض آئندہ توبہ کر لیں اور راہ حق اختیار کر لیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر لیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ یہ قسم کھائی

گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں متعدد منطقی دلیلیں بیان ہوئی ہیں کہ جو خدا کی وحدانیت اور اثبات اور شرک و بت پرستی کی نفی کے لئے کافی تھیں لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین کی ایک جماعت نے سر تسلیم خم نہ کیا اور وہ بہانے تراشنے لگے اور منجملہ ان کے، پیغمبر ﷺ سے عجیب غریب خارق العادات کے لئے کہ جن میں سے بعض تو بنیادی طور پر محال تھے، مطالبہ کرنے لگے اور دروغ بیانی کے ساتھ یہ دعا کرنے لگے کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آئیں، قرآن پہلی آیت میں ان کی کیفیت اور وضع کو اس طرح بیان کرتا ہے:

انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ یہ قسم کھائی کہ اگر ان کے لئے معجزہ آجائے تو وہ ایمان لے آئیں گے ﴿وَأَفْسَمُوا بِاللّٰهِ

جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لِّيُؤْمِنُوا بِهَا﴾۔ (۱)

قرآن ان کے جواب میں دو حقیقتوں کو بیان کرتا ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تو ان سے یہ کہہ دے کہ یہ کام میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہارے ہر مطالبے اور ہر تقاضے کو پورا کر دوں، بلکہ معجزات تو صرف خدا ہی کی طرف سے (ہوتے) ہیں اور اسی کے فرمان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ﴿قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾۔

اس کے بعد روئے سخن ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے کہ جو ان کی سخت اور شدید قسموں سے متاثر ہو گئے تھے کہتا ہے: تم نہیں جانتے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر یہ معجزات اور ان کی درخواستوں کے مطابق مطلوبہ نشانیاں دکھا بھی دی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ﴿وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔ (۲)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان کے ساتھ ٹکراؤ کے مختلف مناظر اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہ گمراہ حق کی جستجو میں نہیں تھا بلکہ ان کا ہدف اور مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بہانہ تراشیوں میں لگائے رکھیں اور شک و شبہ کے بیج ان کے دلوں بکھیرتے رہیں۔

بعد والی آیت میں ان کی ہٹ دھرمی کی علت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کجروی، جاہلانہ تعصبات اور حق کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کرنے پر اصرار کی وجہ سے قوت ادراک اور صحیح نظر کھو بیٹھے ہیں، اور حیران و پریشان اور گمراہ ہو کر سرگردانی کے عالم میں پھر رہے ہیں چنانچہ قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو دگرگوں کر دےں گے جیسا کہ وہ آغاز میں اور دعوت کی ابتدا میں ایمان نہیں لاتے تھے ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾۔

یہاں بھی اس کام کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جس کی ایک نظیر قبل کی آیات میں گزر چکی ہے، یہ حقیقت میں خود ان ہی کے اعمال کا نتیجہ اور عکس العمل ہے، اس کی خدا کی طرف نسبت اس عنوان سے ہے کہ وہ علت العلل اور عالم ہستی کا سرچشمہ ہے اور ہر چیز میں جو بھی خاصیت ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہے، دوسرے لفظوں میں خداوند تعالیٰ نے ہٹ دھرمی، کجروی اور اندھے تعصبات میں یہ اثر پیدا کیا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ انسان کے ادراک اور فکر و نظر کو بے کار کر دیتے ہیں۔ آیت کے آخر میں کہتا ہے: ہم انھیں طغیان و سرکشی کی حالت میں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ سرگرداں پھرتے رہیں ﴿وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾۔^(۳)

۱۔ ”جھد“ کسی بھی کام کرنے کے لئے سعی و کوشش کو کہتے ہیں اور یہاں تاکید ی قسموں کے لئے کوشش کرنا مراد ہے۔

۲۔ اس بارے میں کہ اوپر والے جملے میں ”نا“ استفہامیہ ہے یا نافیہ اور اسی طرح جملے کی ترکیب کی کیفیت میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے ”نا“ استفہام انکاری قرار دیا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہو تو جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ: تم کہاں سے جانتے ہو کہ اگر معجزہ آگیا تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی ہو سکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور یہ مفہوم مقصود آیت کے بالکل برخلاف ہے، لہذا بعض نے ”نا“ کو نافیہ قرار دیا ہے (اور ذہن سے زیادہ نزدیک بھی یہی ہے) تو اس بنا پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: تم نہیں جانتے کہ اگر یہ معجزات دکھا بھی دئے جائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، اس صورت میں ”یشعر“ کا فاعل لفظ ”شیء“ ہے جو مقدر ہے اور ”یشعر“ کے دو مفعول ہیں پہلا مفعول ”کم“ اور دوسرا ”انھا“۔ (غور کیجئے گا)

۳۔ ”یعْمَهُونَ“، ”عمہ“ (بروزن ”قدح“) کے مادہ سے سرگردانی اور تحیر کے معنی میں۔

خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس قسم کی سرگردانی سے جو ہمارے بے سوچے سمجھے اعمال کا نتیجہ ہے محفوظ رکھے اور ہمیں قوت ادراک اور ایسی کامل نظر مرحمت فرمائے کہ ہم حقیقت کے چہرے کو اس کی اصلی ہیئت و صورت میں دیکھ لیں۔

آیت ۱۱۱

۱۱۱ ﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَكِنَّا كَثَرْتُمْ عَنْهُمْ يُجْهَلُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۱۱۔ اور اگر ہم ان پر فرشتوں کو نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی وہ ہرگز ایمان نہ لاتے، مگر یہ کہ خدا چاہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں اجانتے۔

تفسیر

ہٹ دھرم لوگ راہ راست پر کیوں نہیں آتے؟۔

یہ آیت گذشتہ آیات کے ساتھ مربوط ہے، یہ سب آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں، ان چند آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ان عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کرنے والوں میں سے بہت سے اپنے تقاضوں میں سچے نہیں ہیں اور کا ہدف حق کو قبول کرنا نہیں ہے لہذا ان کے مطالبات میں سے بعض (مثلاً خدا کا ان کے سامنے آنا) اصولاً محال ہے۔ وہ اپنے گمان کے مطابق چاہتے یہ ہے کہ ان عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کر کے مومنین کے افکار کو متزلزل کریں اور حق طلب لوگوں کے نظریے خلط ملط ہوں اور یہ انھیں اپنی طرف مشغول کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن زیر نظر آیت میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اگر ہم (جس طرح انھوں نے درخواست کی تھی) فرشتوں کو ان پر نازل کر دیتے، اور مردے بھی آجاتے اور ان سے باتیں کرتے اور خلاصہ یہ کہ جو جو مطالبات اور تقاضے وہ کر رہے تھے ان سب کو جمع کر دیتے تو پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے ﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا﴾۔^(۱)

اس کے بعد تائید مطلب کے لئے فرماتا ہے: صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی جبری مشیت کے ذریعہ انھیں ایمان کے قبول کرنے پر آمادہ کر دے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان کوئی تربیتی فائدہ اور تکاملی اور ارتقائی اثر نہیں رکھتا ﴿إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ ان میں سے اکثر جاہل اور بے خبر ہیں ﴿وَلَكِنَّا كَثَرْتُمْ عَنْهُمْ يُجْهَلُونَ﴾۔

اس بارے میں کہ اس جملے میں ضمیر ”ہم“ سے کون سے اشخاص مراد ہیں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ممکن ہے یہ اشارہ ان مومنین کی طرف ہو جو یہ اصرار کر رہے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے اس گروہ مطالبات پورا کر دیں اور جس جس معجزہ کے لئے وہ تقاضا کر رہے ہیں وہ لے آئیں۔

ان مومنین میں سے کیوں بہت سے اس واقعیت سے بے خبر تھے اور اس بات کی طرف متوجہ نہیں تھے کہ وہ اپنے تقاضے میں سچے نہیں ہیں، لیکن خدا جانتا تھا کہ یہ مدعی جھوٹ بول رہے ہیں، اسی بنا پر ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا، لیکن اس بنا پر کہ دعوت پیغمبر معجزہ کے بغیر نہیں ہو سکتی لہذا خاص مواقع پر ان کے ہاتھ پر مختلف معجزات ظاہر کئے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ضمیر ”ہم“ کا مرجع اور بازگشت تقاضا کرنے والے کفار ہوں، یعنی ان میں سے بیشتر اس واقعیت سے بے خبر ہیں کہ خدا ہر قسم کے خارق العادات فعل پر قدرت رکھتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی قدرت کو محدود جانتے ہیں، لہذا جب بھی پیغمبر کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو وہ اسے جادو یا نظر فریبی پر محمول کرتے تھے جیسا کہ ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں:

”وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ“

”اگر ہم آسمان سے کوئی دروازہ ان کے اوپر کھول دیتے اور وہ اس کے ذریعے اوپر صرٹھ جاتے تو کہتے کہ ہماری تو نظروں کو دھوکہ دیا گیا ہے اور ہمارے اوپر جادو کر دیا گیا ہے۔“ (حجر: ۱۴-۱۵)

اس بنا پر وہ نادان اور ہٹ دھرم گروہ ہے، لہذا ان کی اور ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرنا چاہئے۔

۱- حَشْرُنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ سے مراد یہ ہے کہ تمام چیزیں او ان کے تمام مطالبات پورے کر دئے جائیں، کیوں کہ ”حشر“ اصل میں جمع کرنے اور ایک دوسرے کے گرد لانے کے معنی میں ہے، اور ”قبلا“ کا معنی روبرو اور مقابل ہونا ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ ”قبلا“ قبیل کی جمع ہو، یعنی گروہ در گروہ فرشتے اور مردے اور ---- ان کے سامنے حاضر ہوں۔

آیات ۱۱۲، ۱۱۳

۱۱۲ ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾ -

۱۱۳ ﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۲ - اس طرح ہم نے ہر نبی کے مقابلے میں شیاطین جن و انس سے کچھ دشمن قرار دئے ہیں کہ جو پر فریب اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو غافل رکھنے کے لئے) مخفی طور (اور کانوں میں) ایک دوسرے سے کہتے تھے اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (اور وہ انھیں جبری طور پر روک سکتا تھا لیکن اجبار و اکراہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بنا پر انھیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔

۱۱۳ - اور (شیطانی و سوسوں اور شیطان صفت افراد کی تبلیغات کا) نتیجہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کے دل جو روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور وہ اس پر راضی و جائیں گے اور جو گناہ بھی وہ انجام دینا چاہیں گے، دیں گے۔

تفسیر

اس آیت میں اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اس قسم کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا پیغمبر اسلام (ص) کے مقابلہ میں وجود کہ جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے صرف آنحضرت کی ذات کے لئے ہی منحصر نہیں تھا بلکہ تمام انبیاء ہی کے مقابلہ میں شیاطین جن و انس میں سے دشمن موجود تھے ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ ”وہ پر فریب باتیں اور ایک دوسرے کو غافل کرنے کے لئے پراسرار طریقے پر بھی اور ظاہر بظاہر بھی ایک دوسرے کے کان میں کہتے تھے ﴿يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾۔ لیکن اشتباہ نہیں ہونا چاہئے کہ ”اگر خدا چاہتا تو وہ جبراً سب کو روک سکتا تھا“ تاکہ کوئی شیطان یا شیطان صفت انبیاء اور ان کی دعوت کے راستے میں کوئی معمولی سے معمولی رکاوٹ بھی نہ ڈال سکے ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ﴾۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے یہ کام نہیں کیا کیوں کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ آزاد رہیں تاکہ ان کی آزمائش اور ارتقا و پرورش کے لئے میدان موجود ہیں، جب کہ جبراً اور سلب آزادی اس ہدف کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے، اس کے علاوہ اس قسم

کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا وجود (اگرچہ ان کے اعمال خود ان کی خواہش و ارادہ کے ماتحت تھے) نہ صرف یہ کہ وہ سچے مومنین کے لئے کوئی ضرر نہیں رکھتا، بلکہ غیر مستقیم طریقہ سے ان کے ان کے تکامل میں مدد کرتا ہے چونکہ ہمیشہ تکامل و ارتقا تضادات میں پنہاں ہوتا ہے اور ایک طاقتور دشمن کا ہونا انسان کی قوتوں کے اجتماع اور اس کے ارادوں کی تقویت کے لئے موثر ہے۔

لہذا آیت کے آخر میں خدائے تعالیٰ پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تم اس کی شیطانتوں کی کسی طرح بھی پرواہ نہ کرو اور انہیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو ﴿فَذَرْنَهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ مندرجہ بالا آیت میں خداوند تعالیٰ شیاطین جن و انس کے وجود کی نسبت اپنی طرف دے رہا ہے اور کہتا ہے: ”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا“ (ہم نے ایسا قرار دیا) ان اس جملے کے معنی کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ انسانوں کے تمام اعمال ایک لحاظ سے خدا کی طرف بھی منسوب کئے جاسکتے ہیں، کیوں کہ ہر شخص جو کچھ بھی رکھتا ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے، اس کی قدرت اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ اس کا اختیار اور اس کی آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے، لیکن ایسی تعبیرات کا مفہوم ہرگز جبر اور سلب اختیار نہیں ہے کہ خدا نے کچھ لوگوں کو اس طرح سے پیدا کیا ہو کہ وہ انبیاء کے مقابلے میں دشمنی کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ اپنی عداوت و دشمنی میں کسی قسم کی کوئی مسئولیت اور جوابدہی نہ رکھتے ہوتے بلکہ ان کا کام ایک رسالت کی انجام دہی شمار ہوتا، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے دشمنوں کا وجود چاہے وہ خود ان کے اپنے اختیار سے ہی ہو، مومنین کے لئے بلا واسطہ طور پر اصلاح کنندہ اثر رکھتا ہے، اور بہتر لفظوں میں سچے مومنین ہر قسم کے دشمن کے وجود سے مثبت اثر لے سکتے ہیں اور اسے اپنی آگاہی و آمادگی اور مقاومت کی سطح بلند کرنے کا وسیلہ بنا سکتے ہیں کیوں کہ دشمن کا وجود انسان کی قوتوں کے اجتماع کا سبب اور باعث ہوتا ہے۔

۲۔ لفظ ”شیاطین“ ”شیطان“ کی جمع ہے اور یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور وہ ہر سرکش باغی اور موزی موجود کے معنی میں، لہذا قرآن میں پست، خبیث اور سرکش انسانوں پر بھی لفظ شیطان بولا گیا ہے، جیسا کہ اوپر والی آیت میں لفظ شیطان کا انسانی شیطانوں پر بھی اور ایسے غیر انسانی شیطانوں پر بھی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، اطلاق میں وہ تمام

شیاطین کا رئیس و سردار ہے، اس بنا پر شیطان کا اسم خاص ہے کہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابل میں آیا تھا اور حقیقت میں وہ تمام شیاطین کا رئیس و سردار ہے، اس بنا پر شیطان اسم جنس ہے اور ابلیس اسم خاص ہے۔^(۱)

۳۔ ”زخرف القول“ پر فریب باتوں کو کہتے ہیں، جن کا ظاہر خوشنما اور باطن قبیح اور برا ہوتا ہے اور غرور کا معنی غفلت میں رکھنا ہے۔^(۲)

۴۔ زیر نظر آیت میں وحی کی تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اپنے شیطانی گفتار و اعمال میں ایسے اسرار آمیز پروگرام رکھتے ہیں کہ جن کو وہ رازدارانہ طریقے سے ایک دوسرے کی طرف ارتقا کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ ان کے کاموں سے آگاہ نہ ہوں اور ان کی سازشیں کامل طور پر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں، کیوں کہ ”وحی“ کے معانی میں سے ایک معنی لغت میں آہستہ اور کان میں بات کرنا بھی ہے۔

بعد والی آیت میں شیاطین کی پر فریب تلقینات و تبلیغات کے نتیجے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ان کے کام کا سرانجام یہ ہوگا کہ بے ایمان افراد یعنی وہ کہ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کی باتوں کو کان لگا کر سنیں گے اور ان کے دل ان کی طرف مائل ہوں گے ﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾۔

آیت کی ترتیب کے بارے میں اور یہ کہ لفظ ”وَلِتَصْغَىٰ“ کا عطف کس پر ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، آیت کے مفہوم کے ساتھ جو بات زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اس کا عطف ”یوحی“ پر ہونا چاہئے اور اس کی ”لام“ عاقبت کی لام ہے، یعنی شیاطین کے کام کا انجام یہ ہوگا کہ وہ پر فریب باتیں ایک دوسرے سے کہیں گے، اور بے ایمان افراد ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ”غرورا“ کے اوپر عطف ہو جو ”مفعول لاجلہ“ ہے، یعنی ”لیفترو او لتصغی“ کیوں کہ انسان مرحلہ اول میں فریب کھاتا ہے اور پھر میلان پیدا کر کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

”لتصغی“، ”صغو“ (بروزن سرو) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف میلان پیدا کرنے کے معنی میں ہے لیکن زیادہ تر اس میلان و رغبت پر بولا جاتا ہے کہ جو سماعت اور کان کے وسیلہ سے حاصل ہو اور اگر کوئی شخص کسی کی بات پر موافقت کی نظر سے کان دھرے تو اس کو ”صغو“ اور ”اصغاء“ کہتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میلان کا انجام شیطانی پروگراموں پر کامل طور پر راضی ہونے کی صورت میں نکلے

گا ﴿وَلِيَرْضَوْهُ﴾۔

اور ان سب کا نتیجہ مختل قسم کے گنہا ہوں کے ارتکاب اور برے اور ناپسندیدہ اعمال کی صورت میں رونما ہوگا ﴿وَلِيَقْتَرُوا مَا هُمْ مُقْتَرُونَ﴾۔

۱۔ اس سلسلہ میں ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد صفحہ ۱۶۶ پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

۲۔ اس طرف توجہ رکھنی چاہئے کہ ”زخرف“ اصل میں ”زینت“ کے معنی میں اور اسی طرح ”سونے“ کے معنی میں بھی کہ جو زینت کا ایک ذریعہ ہے، بعد ازاں دھوکہ اور فریب دینے والی باتوں پر بھی کہ جن کا ظاہر زیبا اور خوبصورت ہو ”زخرف“ اور ”مزخرف“ بولا جانے لگا۔

آیات ۱۱۵، ۱۱۳

۱۱۴ ﴿أَفَعَيِّرَ اللَّهُ أَتْبَغَىٰ حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ -

۱۱۵ ﴿وَمَتَّ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۴ - کیا میں (اس حال میں) غیر خدا کو منصف کے طور پر اپناؤں حالانکہ وہی وہ ہستی ہے کہ جس نے اس آسمانی کتاب کو جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے نازل کیا ہے، اور وہ لوگ کہ جنہیں ہم آسمانی کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے، اس بنا پر تم ہرگز شک تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا

۱۱۵ - اور تیرے پروردگار کا کلام صدق و عدل ساتھ انجام کو پہنچا، کوئی شخص اس کے کمالات کو دیگر گوں نہیں کر سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

کیا میں غیر خدا کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کر لوں

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے اور یہ آیت کہتی ہے کہ ان واضح آیات کے باوجود جو توحید کے سلسلے میں گزر چکی ہے کیا کسی شخص کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے، کیا میں غیر خدا کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کر لوں ﴿أَفَعَيِّرَ اللَّهُ أَتْبَغَىٰ حَكَمًا﴾ - (۱)

جب کہ وہی ذات ہے کہ جس نے یہ عظیم آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں انسان کی تمام تربیتی ضروریات آچکی ہیں اور جس نے حق و باطل، نور و ظلمت اور کفر و ایمان کے درمیان فرق ظاہر کر دیا ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾ -

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے نہ صرف تم اور تمام مسلمان اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے، بلکہ اہل کتاب (یہود و نصاری) جنہوں نے آسمانی کتاب کی نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھی ہیں وہ بھی جانتے ہیں، کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے

﴿وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ اس بنا پر اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، اور اے پیغمبر تم ہرگز اس بارے میں تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا ﴿فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس بارے میں کوئی شک تھا کہ اس قسم کا خطاب آپ سے ہو رہا ہے؟

اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم نے اس کے مشابہ اور اس سے ملتے جلتے مواقع پر دیا اور وہ یہ کہ اس میں درحقیقت مخاطب تو عام لوگ ہیں لیکن خداوند تعالیٰ تاکید اور تحکیم مطلب کے لئے اپنے پیغمبر مخاطب کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ اپنے بارے میں جان لیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کا کلام صدق، عدل کے ساتھ مکمل ہوگا اور کوئی بھی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اس کے کلمات کو دگرگوں کر دے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ ”کلمہ“ لغت عرب گفتگو اور ہر قسم کے جملے کے معنی میں ہے یہاں تک کہ مفصل اور طولانی گفتگو بھی کہا جاتا ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ بعض اور وعدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا﴾

”تیرے پروردگار کا وعدہ بنی اسرائیل کے بارے میں اس صبر استقامت کے مقابلے جو انھوں نے کیا انجام پا گیا“ (سورہ اعراف: ۱۳۷)۔

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کیوں کہ انسان وعدہ کرتے وقت ایسا جملہ کہتا ہے جو وعدہ کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔

بعض اوقات ”کلمہ“ دین و آئین اور حکم و دستور کے معنی بھی آتا ہے اور وہ اسی اصل کی طرف لوٹتا ہے۔ اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں لفظ ”کلمہ“ سے مراد قرآن ہے یا خدا کا دین و آئین ہے یا کامیابی کے وہ وعدے جو پیغمبر سے کئے گئے تھے، یہ مختلف احتمالات ہیں کہ جن میں مختلف ہونے کے باوجود کوئی تضاد نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں تمام احتمالات کو مد نظر رکھا گیا ہو لیکن اس لحاظ سے کہ گذشتہ آیات میں گفتگو قرآن کے بارے میں بھی تھی لہذا یہ معنی زیادہ مناسب رکھتا ہے۔

حقیقت میں آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ کسی طرح سے بھی قرآن میں کوئی شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ یہ ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب ہے، اس کی تاریخ اور اخبار سب کے سب صدق ہیں اور اس کے احکام و قوانین سب کے سب عدل ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ”کلمہ“ سے مراد وہی ”وعدہ“ ہو جو بعد والے جملہ میں یعنی ”لا مبدل لکلماتہ“ (کوئی شخص کلمات خدا میں تغیر اور تبدیل نہیں کر سکتا کے جملہ میں آیا ہے کیوں کہ اس جملہ کی نظر دوسری آیات قرآنی میں بھی نظر آتی ہے مثلاً:

”وَمَثَلُ كَلِمَةٍ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ“ (ہود ۱۱۹)۔

یا دوسری آیات میں ہم پڑھتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ﴾ ”پیغمبروں کے بارے میں ہمارا پہلے سے یہ وعدہ تھا کہ مظفر و منصور تو وہی ہوں گے“ (سورہ صافات آیہ ۱۷۱ و ۱۷۲)۔

اس قسم کی آیت میں بعد کا جملہ اس وعدہ کی وضاحت ہے کہ جس کی طرف قبل کے جملہ میں لفظ ”کلمہ“ کے ذکر سے اشارہ ہوا ہے، اس بنا پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی، ہمارا وعدہ صدق و عدالت کے ساتھ انجام پذیر ہوا کہ کوئی شخص پروردگار کے احکام اور فرامین میں تبدیلی کی طاقت نہیں رکھتا۔

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان تمام معانی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت اگر قرآن کی طرف اشارہ کر رہی ہو تو یہ بات اس امر سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی کہ اس وقت تک سارا قرآن نازل نہیں ہوا تھا کیوں کہ آیات قرآن کے کامل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ نازل ہو چکا تھا اس میں کوئی عیب اور نقص نہیں اور وہ ہر لحاظ سے کامل ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے قرآن میں تحریف کے بارے میں عدم امکان پر استدلال کیا ہے، کیوں کہ ”لا مبدل لکلماتہ“ کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص لفظ کے لحاظ سے، اخبار کے لحاظ سے اور احکام کے لحاظ سے قرآن میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا اور یہ آسمانی کتاب جسے آخر دنیا تک عالمین کا رہنما ہونا چاہئے خیانت کرنے والوں اور تحریف کرنے والوں کی دستبرد سے مصئون و محفوظ رہے گی۔

۱۔ ”حکم“ (بروزن قلم) کا معنی فیصلہ کرنے والا، قاضی اور حاکم ہے اور بعض نے اسے معنی کے لحاظ سے حاکم کے مساوی جانا ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت کہ جن میں ایک شیخ طوسی بھی ہیں، کتاب ”تبیان“ میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ”حکم“ اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو حق کے علاوہ فیصلہ نہ کرتا ہو لیکن دونوں کے لئے بولا جاتا ہے، بعض دوسرے کہ جن میں ”المنار“ کا مولف بھی ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ”حکم“ وہ شخص ہے جسے طرفین دعویٰ نے انتخاب کیا ہو، جب کہ حاکم ہر قسم کے فیصلہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

آیات ۱۱۶، ۱۱۷

۱۱۶ ﴿وَإِنْ تُطِيعُوا أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ لِيُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ -

۱۱۷ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۶ - اور اگر تم زمین پر رہنے والے لوگوں میں سے اکثر لوگوں کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ کر دیں گے، وہ تو صرف ظن اور گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ اٹکل پچو لڑاتے رہتے ہیں -

۱۱۷ - تیرا پروردگار ان لوگوں سے بھی خوب اچھی طرح آگاہ ہے جو اس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اور ان لوگوں سے بھی کہ جو ہدایت یافتہ ہیں -

اگر تم زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے

ہم جانتے ہیں کہ اس سورہ کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس زمانے میں مسلمان انتہائی اقلیت میں تھے، یہ ممکن تھا کہ ان کی اقلیت اور بت پرستوں اور مخالفین اسلام کی قطعی اکثریت بعض لوگوں کے لئے تو ہم پیدا کر دے کہ اگر کہ اگر ان کا دین و آئین باطل اور بے اساس ہے تو ان کی پیروی کرنے والے اتنی اکثریت میں کیوں اور اگر ہم حق پر ہیں تو اس قدر کم تعداد میں کیوں ہیں -

اس آیت میں اس توہم کو دفع کرنے کے لئے کہ جو ممکن تھا کہ قبل کی آیات میں قرآن کی حقانیت کے زکر کے بعد پیدا ہو جائے، اپنے پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اگر تم زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں راہ حق سے گمراہ اور منحرف کر دیں گے ﴿وَإِنْ تُطِيعُوا أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ لِيُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ -

بعد والے جملے میں اس امر کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ وہ منطق اور فکر صحیح کی بنیاد پر کام نہیں کرتے، ان کے رہنا ہوا و ہوس سے آلودہ گمان ہیں اور کچھ جھوٹ، فریب اور تخمینے ہیں ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ

إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾^(۱) -

چونکہ قبل والی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ محض اکثریت تنہا راہ حق کی نشاندہی نہیں کر سکتی، تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ راہ حق صرف خدا سے حاصل کرنا چاہئے چاہے حق کے طرفدار اقلیت میں ہی کیوں نہ ہوں، لہذا دوسری آیت میں اس امر کی دلیل واضح کرتا ہے کہ تیرا پروردگار کہ جو تمام چیزوں سے باخبر اور آگاہ ہے اور اس کے علم غیر متناہی میں ذرہ بھر بھی

اشتباه نہیں ہے وہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ راہ ضلالت کونسی ہے اور راہ ہدایت کون سی، اور وہ گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور پر پہچانتا ہے ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (۲)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے لوگ راہ ہدایت و ضلالت کو خدا کی رہنمائی کے بغیر بھی پہچان لیتا ہے، کہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ خدا دوسروں سے بہتر طور پر پہچانتا اور بہتر طور پر جانتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ انسان اپنی عقل کے ذریعے حقائق کا ادراک کرتا ہے اور راہ ہدایت و ضلالت کو کسی حد تک سمجھ لیتا ہے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ چراغ عقل کی روشنی اور اس کی شعاع محدود ہے، اور ممکن ہے کہ بہت سے مطالب نگاہ عقل سے مخفی رہ جائیں، علاوہ ازیں انسان اپنی معلومات میں اشتباہ میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے اور اسی بنا پر وہ خدائی رہبروں اور رہنماؤں کا محتاج ہے اسی لئے یہ جملہ کہ ”خدا زیادہ جانتا ہے“ صحیح ہے، اگرچہ انسان کا علم خدا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

عدوی اکثریت کچھ اہمیت نہیں رکھتی

بعض لوگوں کی نظر میں یہ بات مسلم ہے کہ عدوی اکثریتیں ہمیشہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہیں لیکن قرآن کے برخلاف متعدد آیات میں اس کی نفی کرتا ہے اور وہ عدوی اکثریت کئے لئے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے اور حقیقت میں وہ اکثریت ”کیفی“ کو معیار سمجھتا ہے نہ کہ اکثریت ”کمی“ کو، اس امر کی دلیل واضح ہے، کیونکہ آج کے معاشروں میں اگرچہ معاشرے کے امور میں لوگوں کو اکثریت پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں سوجھا لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہئے کہ یہ بات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ایک طرح سے مجبوری کے باعث قبول کرنا پڑتی ہے، کیوں کہ ایک مادی معاشرے میں اصلاحات کرنے اور درست قوانین بنانے کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جو اشکال اور عیب سے خالی ہو، لہذا بہت سے علماء اور ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے ساتھ کہ افراد معاشرہ کی اکثریت کی نظر اکثر اوقات اشتباہ آمیز ہوتی ہے اس بات کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیوں کہ دوسرے راستوں کے عیوب اس سے زیادہ ہیں۔ لیکن ایک ایسا معاشرہ جو انبیاء علیہم السلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو وہ قوانین کے نفاذ اور پرہیزگاری کے لئے اکثریت کی پیروی کی کوئی مجبوری نہیں رکھتا، کیونکہ کئے سچے انبیاء کے پروگرام اور قوانین ہر قسم کے نقص، عیب اور اشتباہ سے خالی ہوتے ہیں اور جن قوانین کی جائز الخطا اکثریت تصویب و تصدیق کرتی ہے ان کا ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا

آج کی دنیا کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے اور ان حکومتوں پر جو اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے نظر کرنے اور ان نادرست اور ہوس آمیز قوانین کو جو بعض اوقات اکثریتوں کی طرف تائید و تصویب شدہ ہوتے ہیں دیکھنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اکثریت عددی نے کسی درد کی دوا نہیں کی ہے، بہت سی جنگوں کی اکثریت نے ہی تصویب کی تھی اور بہت سے مفاسد کو اکثریت نے ہی چاہا تھا۔

استعمار و استثمار، جنگیں اور خونریزیاں، شراب نوشی کی آزادی، خمار بازی، اسقاط حمل، فحشاء و منکر یہاں تک کہ بعض ایسے قبیح و شنیع افعال کے جن کا ذکر باعث شرم ہے بہت سے ایسے ممالک جو اصطلاح میں ترقی یافتہ کہلاتے ہیں کے نمائندوں کی اکثریت کی طرف سے ہے جو ان ممالک کے عوام کی اکثریت کے نظریہ کو منعکس کرتے تھے اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

علمی نکتہ نظر سے کیا عوام کی اکثریت سچ ہی بولتی ہے؟ کیا اکثریت امین ہوتی ہے؟ کیا اکثریت دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے اگر وہ کر سکے تو اجتناب کرتی ہے؟ کیا اکثریت اپنے اور دوسروں کے منافع کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے؟

ان سوالات کے جواب بغیر کہے ظاہر ہیں، اس بنا پر اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ آج کی دنیا کا اکثریت پر اعتبار اور بھروسہ کرنا حقیقت میں ایک قسم کی مجبوری اور ماحول کی ضرورت ہے اور ایک ایسی ہڈی ہے جو معاشروں کے گلے میں پھنسی ہوئی ہے۔

ہاں انسانی معاشروں کے صاحبان فکر و نظر اور دلسوز مصلحین اور با مقصد سوچ رکھنے والے جو ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اگر عوام الناس کو روشنی بخشنے کے لئے ہم جہتی تلاش و کوشش کریں اور انسانی معاشرے کا کافی حد تک فکری، اخلاقی اور اجتماعی رشد پالیں تو مسئلہ طور پر اس قسم کی اکثریت کی نظریات حقیقت کے بہت قریب ہوں گے، لیکن غیر رشید اور نا آگاہ یا فاسد، منحرف اور گمراہ اکثریت کون سی مشکل اپنے اور دوسروں کے راستوں سے ہٹا سکے گی، اس بنا پر محض اکثریت اکیلی کافی نہیں ہے بلکہ صرف وہی اکثریت کہ جو ہدایت یافتہ ہو اپنے معاشرے کی مشکلات کو اس حد تک کہ جو امکان بشر میں ہے حل کر سکتی۔

اگر قرآن مختلف آیات میں اکثریت کے بارے میں اعتراض کرتا ہے تو اس میں شک نہیں ہے کہ اس کی مراد ایسی اکثریت ہے کہ جو غیر رشید ہو اور ہدایت یافتہ نہ ہو۔

۱۔ ”غرض“ (بروزن ترس) اصل میں تخمین کے معنی میں ہے، پہلے پہل تو باغ وغیرہ کرایہ پر دینے کے وقت درختوں پر پھلوں کی مقدار کے تخمینے اور اندازے کے لئے استعمال ہوتا تھا، بعد ازاں ہر قسم کے حدس و تخمین کے لئے یہ لفظ بولے جانے لگا اور چونکہ تخمینہ اور اندازہ بعض اوقات واقع کے مطابق اور بعض اوقات اس کے خلاف ہوتا ہے لہذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور مندرجہ بالا آیت میں ہو سکتا ہے دونوں معانی کے لئے ہو۔

۲۔ عموماً ”افعل تفضیل“، ”با“ کے ذریعہ متعدی ہو جاتا ہے لہذا یہاں یہ کہنا چاہئے ”اعلم بمن“ لیکن با محذوف ہے اور ”ومن یضل“ اصطلاح کے مطابق منصوب بنزع خافض ہے۔

آیات ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰

۱۱۸ ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾ -

۱۱۹ ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ وَإِنَّ كَثِيرًا

لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ﴾ -

۱۲۰ ﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ﴾ -

ترجمہ:

۱۱۸ - اور جس (شیع) پر اس کا نام لیا گیا ہے اس سے کھاؤ، (لیکن ان جانوروں کے گوشت سے کہ جن کو ذبح کرتے وقت ان پر خدا کا نام نہیں لیا گیا نہ کھاؤ) اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔

۱۱۹ - تم ان چیزوں میں سے کیوں نہیں کھاتے کہ جن پر خدا کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ (خداوند تعالیٰ نے) جو کچھ تم پر حرام تھا اسے بیان کر دیا ہے مگر یہ کہ تم مجبور ہو جاؤ (کہ اس صورت میں اس قسم کے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے) اور بہت سے لوگ (دوسروں کو) ہوا و ہوس اور بے علمی کی وجہ سے گمراہ کر دیتے ہیں اور تیرا پروردگار تجاوز کرنے والوں کو بہتر طور پر پہچانتا ہے۔

۱۲۰ - آشکار اور مخفی گناہوں کو چھوڑ دو کیوں کہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں انہیں ان کے بدلے میں سزا دی جائے گی۔

تفسیر

شرک کے تمام آثار مٹ جانے چاہئیں

یہ آیات حقیقت میں توحید و شرک بارے میں گذشتہ مباحث کے نتائج میں سے ایک، لہذا پہلی آیت ”فاء“ تفریح کے ساتھ آئی ہے جو عام طور پر نتیجہ کے بیان کے لئے ہوتی ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ گذشتہ آیات میں مختلف بیانات کے ساتھ حقیقت توحید کا اثبات اور شرک و بت پرستی کا بطلان واضح ہوا ہے، اس مسئلہ کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ گوشت کھانے سے جو ”بتوں“ کے نام پر ذبح ہوتے احتراز کریں اور صرف ان جانوروں کے گوشت سے استفادہ کریں کہ جو خدا کے نام پر ذبح ہوتے ہیں، کیوں کہ مشرکین عرب کی ایک عبادت یہ تھی کہ وہ بتوں کے لئے قربانی کرتے تھے اور ان کے گوشت سے تبرک کے طور پر کھاتے تھے اور یہ کام ایل قس، کی بت پرستی ہی تھا۔

لہذا پہلے کہا گیا ہے: ان چیزوں میں سے کھاؤ کہ جن پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے، اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾۔

یعنی ایمان محض دعوے، گفتار اور عقیدہ کے نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اظہار عمل سے بھی ہونا چاہئے، جو شخص خدائے یکتا پر ایمان رکھتا ہے وہ صرف اسی قسم کے گوشت میں سے کھاتا ہے البتہ امر ”کلوا“ (کھاؤ) یہاں اس قسم کے گوشت کے کھانے کے وجوب کے لئے نہیں بلکہ حقیقت میں اس سے مراد اس کا مباح اور اس کے غیر کا حرام ہونا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس گوشت کا حرام ہونا کہ جس کے ذبح کے وقت اس پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس نکتہ نظر سے نہیں ہے کہ یہ بات صحت عامہ کے پہلو سے ہے کہ یہ کہا جائے کہ نام لینے سے کیا اثر ہوتا ہے، بلکہ اس کا ربط معنوی و اخلاقی پہلوؤں اور توحید پرستی کی بنیادوں کو محکم کرنے کے ساتھ ہے۔

بعد والی آیت میں یہی بات دوسری عبارت سے بیان کی گئی جو اور زیادہ استدلال کے ساتھ ہے، فرمایا ہے: تم ان جانوروں سے کیوں میں کھاتے کہ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے؟ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام ہے خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے ﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ﴾۔

ہم یہ بات دوبارہ دلنشین کراتے ہیں کہ یہ توبیخ و تاکید حلال گوشت کے کھانے کو ترک کرنے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ سرف ان گوشتوں سے کھانا چاہئے اور ان کے سوا دوسرے گوشتوں سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے لفظوں میں نظر نکتہ مقابل اور مفہوم جملہ پر ہے، اسی لئے ”قد فصل لکم ما حرم علیکم“ (خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے جو تم پر حرام ہے) کے جملہ سے استدلال کیا گیا ہے۔

اس بارے میں کہ یہ بات کس سورہ اور کس آیت میں آئی ہے کہ جس میں حلال و حرام گوشت کی وضاحت کی گئی ہے، ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اس سے مراد سورہ مائدہ ہے یا اسے سورہ کی بعض آیات ہیں جو آئندہ آئیں گی (مثلاً آیہ ۱۴۵) لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور سورہ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور اس سورت کی آئندہ آنے والی آیات بھی ان آیات کے نزول کے وقت ابھی تک نازل نہیں ہوئی تھی، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں احتمالات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یا تو سورہ نحل کی آیہ ۱۱۵ ہے کہ جس میں صراحت کے ساتھ حرام گوشتوں کی بعض اقسام کا بیان آیا ہے اور خصوصاً وہ جانور جو غیر خدا کے لئے ذبح ہوئے ہوں اور یا اس

سے مراد ان گوشتوں کے بارے میں حکم ہے جو پیغمبر کے وسیلہ سے دئے گئے ہیں، کیوں کہ وہ کوئی حکم وحی الہی کے بغیر نہیں دیتے تھے۔

پھر ایک صورت مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر اس صورت کہ تم مجبور ہو جاؤ ﴿إِلَّا مَا اضْطُرَرْتُمْ إِلَيْهِ﴾۔ چاہے یہ اضطراب یا بان میں گرفتار ہو جانے اور شدید بھوک کی وجہ سے ہو یا مشرکین کے جنگل میں گرفتار ہونے اور کے اس امر پر مجبور کرنے کی وجہ سے ہو۔

اس کے بعد مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: بہت سے لوگ دوسروں کو جہل و نادانی اور ہوا و ہوس کی بنا پر گمراہ کرتے ہیں ﴿وَإِنَّ كَثِيرًا لِّيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾۔

اگرچہ ہوا پرستی اور جہل و نادانی اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں کا ذکر زیادہ تاکید کے لئے اکٹھا کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے ”باہوا انھم بغیر علم“۔

ضمنی طور پر تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عالم حقیقی ہرگز ہوا پرستی اور خیال آرائی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور جہاں یہ ان سے جا ملا وہ جہالت ہے ناکہ علم و دانش۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے مندرجہ بالا جملہ اس خیال و تصور کی طرف اشارہ ہو و مشرکین عرب میں موجود تھا تا کہ وہ مردہ جانوروں کا گوشت کھانے کے لئے اس طرح استدلال کیا کرتے تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جانور جنھیں ہم خود ذبح کریں انھیں تو ہم حلال سمجھ لیں جنھی ہمارے خدا مارا اسے ہم حرام شمار کریں؟۔

یہ بات ظاہر ہے یہ سفسطہ ایک بیہودہ خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیوں خدا نے مردہ جانور کو ذبح نہیں کیا اور اس کا سر نہیں کاٹا کہ ان جانوروں کے ساتھ قیاس کریں جنھیں ہم نے ذبح کیا ہے اور اسی دلیل سے وہ قسم قسم کی بیماریوں کا مرکز ہیں اور اس کا گوشت فاسد اور خراب ہے، لہذا خداوند تعالیٰ نے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دے ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار ان لوگوں کے بارے کہ جو تجاوز کار اور زیادتی کرنے والے ہیں زیادہ آگاہ ہے ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ﴾۔

ایسے ہی لوگ فضول اور بودی دلیلوں کے ذریعے نہ سرف یہ کہ راہ حق سے منحرف ہو جاتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھیک منحرف کر دیں۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس فعل حرام کا چھپ کر اور پوشیدہ طور پر انجام دیں لہذا اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں ایک قانون کلی کے طور کہا گیا ہے: آشکار اور پنہاں گناہ چھوڑ دو ﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ﴾۔

کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ منافی عفت عمل (زنا) اگر چھپ کر کیا جائے تو کوئی عیب نہیں ہے وہ صرف اس صورت میں گناہ ہے کہ اگر اسے آشکار اور ظاہر بظاہر کیا جائے، آج بھی کچھ لوگوں نے عملی طور پر اسی جاہلانہ منطق کو اپنایا ہوا ہے اور صرف آشکار اور ظاہر بظاہر گناہوں سے پریشان اور وحشت زدہ ہوتے ہیں لیکن چھپ کر گناہ کا ارتکاب کسی پریشانی کے بغیر کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت نہ صرف مذکورہ بالا منطق کی مذمت کرتی ہے بلکہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کے علاوہ کہ جو بیان کیا جا چکا ہے دوسرے مفاہیم و تفاسیر کو بھی، جو ”ظاہر“ اور ”باطن“ گناہ کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں، اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ ظاہری گناہوں سے مراد وہ گناہ ہے جو اعضائے بدن کے ساتھ انجام پاتے ہیں اور باطنی گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل، نیت اور تصمیم و ارادہ کے ذریعہ صورت پذیر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد یاد دہانی اور گناہگاروں کو تہدید کے طور پر اس بد بختی کے بارے میں جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں قرآن یوں کہتا ہے: وہ لوگ کہ جو گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں بہت جلدی اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں گے ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

”کسب گناہ“ کی تعبیر (یکسبون الماثم) ایک عمدہ اور جالب نظر تعبیر ہے جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ افراد انسانی جہان میں اس سرمایہ داروں کی طرح ہیں جو ایک بہت بڑے بازار میں قدم رکھتے ہیں اور سرمایہ ہوش، عقل، عمر اور جوانی اور قسم قسم کی خداداد قوتیں ہیں وہ لوگ کتنے بد بخت ہیں جو سعادت، افتخار، مقام، تقویٰ اور قرب خدا کے حصول کے بجائے گناہ کمانے میں لگے رہیں۔

﴿سَيُجْزَوْنَ﴾ (عنقریب اپنی جزا دیکھیں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگرچہ بعض کی نظر میں قیامت دور ہے لیکن حقیقت وہ بہت قریب ہے اور یہ جہاں بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور قیامت آجائے گی، یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ زیادہ تر افراد اس دنیاوی زندگی میں ہی اپنے برے اعمال کے نتائج انفرادی اور اجتماعی رد عمل کے طور پر دیکھیں گے۔

۱۲۱ ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرْ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَيْكُمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۲۱۔ اور اس (ذبیحہ) سے کہ جس پر خدا کا نام نہیں لیا گیا، نہ کھاؤ اور یہ فعل گناہ ہے اور شیاطین اپنے دوستوں کو مخفی طور پر کچھ مطالب القا کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلے اور جھگڑے کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مسئلہ کے مثبت پہلو یعنی حلال گوشت کھانے کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ سے زیادہ تاکید کے لئے منفی پہلو اور اس کے مفہوم کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان گوشتوں میں سے کہ جن پر خدا نام ان کے ذبح کے وقت نہیں لیا گیا نہ کھاؤ ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرْ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾۔

اس کے بعد نئے سرے سے ایک مختصر سے جملے کے ساتھ اس عمل کو حرم قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ کام فسق و گناہ ہے اور راہ ورسم بندگی اور فرمان خدا کی اطاعت سے خروج ہے ﴿وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ﴾۔

نیز اس غرض سے کہ بعض سادہ لو مسلمان ان کے شیطانی وسوسوں کا اثر قبول نہ کر لیں یہ اضافی کیا گیا ہے کہ شیاطین وسوسہ انگیز مطالب مخفی طور پر اپنے دوستوں کو القا کرتے ہیں تاکہ ہمارے ساتھ مجادلہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں ﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَيْكُمْ لِيُجَادِلُوكُمْ﴾۔

لیکن تم ہوش و ہواس کے ساتھ رہو کیوں کہ، اگر تم ان کے وسوسوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو تم بھی مشرکین صف میں شامل ہو جاؤ گے

﴿وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾۔

یہ مجادلہ اور وسوسہ شاید اسی منطق کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین ایک دوسرے کی طرف القا کیا کرتے تھے (اور بعض نے کہا ہے کہ مشرکین عرب نے اسے مجوسیوں سیکھا تھا) کہ اگر ہم مردہ جانور کا گوشت کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اسے خدا نے مارا ہے لہذا وہ اس جانور سے بہتر ہے جسے ہم مارت ہیں، یعنی مردار نہ کھانا خدا کے کام سے ایک قسم کی بے اعتنائی ہے۔

وہ اس (حقیقت) سے غافل ہیں کہ جو اپنی طبعی موت مرتا ہے وہ اس بات کے علاوہ کہ اکثر بیمار ہوتے ہیں، اس کا سر نہیں کاٹا جاتا اور گندہ اور گاڑھا خون اس کے گوشت کے اندر ہی رہ جاتا ہے اور وہ مرجاتا ہے اور فاسد اور خراب ہو جاتا اور وہ گوشت بھی آلودہ اور فاسد کر دیتا ہے، اسی بنا پر خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف اس جانور کا گوشت کھاؤ جو مخصوص شرائط کے ساتھ ذبح ہوا ہے اور اس کا خون باہر گرا ہے۔

ضمنی طور ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ غیر اسلامی ذبیحہ حرام ہے کیوں دیگر جہات کے علاوہ اس کے ذبح کے وقت غیر مسلم خدا کا نام لینے کے پابند نہیں ہوتے۔

آیات ۱۲۲، ۱۲۳

۱۲۲ ﴿أَوْ مَنْ كَانَ مِيتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

۱۲۳ ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَارًا مِّمَّنْ لَّيْمَكُورًا فِيهَا وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾

ترجمہ:

۱۲۲۔ وہ جو کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، کیا اس شخص کی مانند ہے کہ جو تاریکیوں میں ہو اور اس سے باہر نہ نکلے، اس طرح کفار کے لئے وہ (برے) اعمال جو وہ انجام دیتے تھے نہایت دئے گئے ہیں (اور خوبصورت دکھائی دیتے ہیں)۔

۱۲۳۔ اور ہم نے اسی طرح سے ہر شہر اور ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم قرار دئے ہیں، (ایسے افراد کہ ہم نے جن کے اختیار میں ہر قسم کی قدرت دے دی تھی لیکن انہوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور غلط راستے پر چل پڑے) اور آخر کار ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ مکر (کرنے اور لوگوں کو دھوکہ دینے) میں مشغول ہو گئے، لیکن (فی الحقیقت) وہ صرف اپنے آپ کو ہی (دھوکہ اور) فریب دیتے ہیں اور سمجھتے نہیں۔

شان نزول

پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں یوں نقل ہوا ہے:

ابو جہل جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ہی سخت دشمنوں میں سے تھا، ایک دن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت تکلیف پہنچائی پیغمبر کے بہادر چچا حضرت حمزہ جو اس دن ایمان نہیں لائے تھے اور اسی طرح آپ کے دین کے بارے میں مطالعہ اور سوچ بچار کر رہے تھے اور اس دن اپنے معمول کے مطابق شکار کے لئے بیابان میں گئے ہوئے تھے، جب بیابان سے واپس آئے تو ابو جہل اور اپنے بھتیجے کے مابین ہونے والے ماجرے سے باخبر ہوئے، انھیں بہت غصہ آیا، وہ فوراً ابو جہل کی تلاش میں نکل پڑے، وہ ملا تو اس کے سریاناں پر اس طرح مارا کہ خون جاری ہو گیا، ابو جہل نے اس تمام نفوذ و اقتدار کے باوجود جو وہ اپنی قوم و قبیلہ بلکہ مکہ کے لوگوں کے درمیان رکھتا تھا حضرت حمزہ کی بہت زیادہ شجاعت کو دیکھتے ہوئے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔

اس کے بعد حمزہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں نکلے اور اسلام قبول کر لیا، اس دن سے باقاعدہ اسلام کے ایک افسر رشید کے طور پر آخر عمر تک اس آسمانی دین کا دفاع اور اس کی حفاظت کرتے رہے۔

اوپر والی آیت اسی وقع کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس میں حمزہ کے ایمان اور ابو جہل کے کفر و فساد میں پائیداری کو مشخص کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت عمار یا سر کے ایمان لانے اور ابو جہل کے کفر پر اصرار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

بہر حال یہ آیت بھی قرآن کی دوسری آیات کی طرح ہی اپنے محل نزول کے ساتھ ہی اختصاص نہیں رکھتی اور ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر سچے مومن اور ہر بے ایمان اور ہٹ دھرم پر صادق آتی ہے۔

ایمان اور نور نظر

ان کا قبل کی آیات کے ساتھ ربط اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات میں دو گروہوں کی اشارہ ہے۔ مومن خالص اور ہٹ دھرم کافر جو صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتا بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی سختی سے کوشش بھی کرتا ہے، یہاں بھی دو جالب اور عمدہ مثالیں ذکر کر کے ان دونوں گروہوں کی کیفیت کو مجسم کیا گیا ہے۔

پہلے ان افراد کو جو گمراہی میں تھے پھر انھوں نے حق اور ایمان کو قبول کر کے اپنے راستے کو بدل لیا انھیں اس مردہ سے تشبیہ دی ہے کہ جو خدا کے ارادہ اور فرمان سے زندہ ہو گیا ہو ﴿أَوْ مِّنْ كَانَ مَيِّتًا فَأُحْيَيْنَاهُ﴾۔

قرآن میں بار بار ”موت“ اور ”حیات“ معنوی موت و حیات اور کفر ایمان کے معنی میں آئی ہے، اور تعبیر اس بات کی طرف اچھی طرح نشاندہی کرتی ہے کہ ایمان ایک خشک اور خالی عقیدہ یا کوئی تکلفاتی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک ایسی روح کی مانند کہ جو بے ایمان افراد کے بے جان جسم میں پھونکی جاتی ہے اور وہ ان کے تمام وجود میں اثر کرتی ہے، ان کی آنکھوں میں بینائی اور روشنی آجاتی ہے، ان کے کانوں میں سننے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، زبان میں طاقر گویائی اور ہاتھ پاؤں میں ہر قسم کے مثبت کام انجام دینے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے، ایمان افراد کو دیگر گروں کر دیتا ہے اور ان کی ساری زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے اور زندگی کے آثار کو ان کے تمام حالات زندگی میں آشکار و واضح کرتا ہے۔

”فاجیناہ“ (ہم نے اسے زندہ کیا ہے) کے حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اگرچہ خود انسان کی اپنی سعی و کوشش سے صورت پذیر ہونا چاہئے لیکن جب تک خدا کی طرف سے کشش نہ ہو یہ کوششیں انجام کو نہیں پہنچتی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہم نے ایسے افراد کے لئے نور قرار دیا ہے کہ جس کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان چلیں پھریں ﴿وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ﴾۔

اگرچہ مفسرین نے اس بارے میں کئی احتمال ذکر کئے ہیں کہ اس ”نور“ سے کیا مراد ہے لیکن ظاہری طور پر اس سے صرف قرآن اور تعلیمات پیغمبر ہی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ خدا پر ایمان انسان کو نور بصیرت اور ایک نیا ادراک بخشتا ہے اور ایک خاص قسم کا نور بصیرت اس کا عطا کرتا ہے، اس کی نگاہ کے افق کتب مادی محدود زندگی اور عالم مادی کی چہار دیواری سے نکال کر ایک بہت ہی وسیع عالم میں لے جاتا ہے۔

اور چونکہ وہ انسان کو خود سازی کی دعوت دیتا ہے تو خود خواہی، خود بینی، تعصب، ہٹ دھرمی اور ہوا ہوس کے پردے اس کی روح کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور وہ ایسے حقائق دیکھنے لگ جاتا ہے کہ جن کے ادراک کی اس سے قبل ہرگز قدرت نہیں رکھتا تھا۔

اس نور کے پرتو میں وہ لوگوں کے درمیان اپنی زندگی کی راہ تلاش کر سکتا ہے اور وہ بہت سے ایسے اشتباہات سے کہ جن میں دوسرے لوگ طمع اور لالچ کی خاطر اور مادی محدود فکر کی وجہ سے یا خود خواہی اور ہوا ہوس کے غلبہ کے باعث گرفتار ہو جاتے ہیں مامون و محفوظ رہ جاتا ہے۔ نیز یہ جو اسلامی روایات میں ہے کہ: ”الْمُؤْمِنُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ“ ”مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“۔

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کے باوجود اس خاص نور کی کہ جو صاحب ایمان انسان میں پیدا ہو جاتا ہے بیان و قلم سے پھر بھی توصیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کا ذائقہ چکھنا چاہئے اور اس کے وجود کو محسوس کرنا چاہئے۔

اس کے بعد ایسے زندہ، فعال، نورانی اور موثر افراد کا ہٹ دھرم بے ایمان افراد کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا ایسا شخص اس شخص کی مانند ہے کہ جو ظلمتوں اور تاریکیوں کی امواج میں ڈوبا ہوا ہے اور ہرگز اس سے باہر نہیں نکل سکتا ﴿كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا﴾۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ ”کمن فی الظلمات“ (اس شخص کی طرح جو ظلمات میں ہے) بلکہ یوں کہتا ہے ”کمن مثله فی الظلمات“ اس شخص کی طرح کہ جس مثل ظلمات ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس تعبیر سے ہدف و مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کے افراد اس قدر تاریکی اور بد بختی میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ان کی وضع و کیفیت ایک ضرب المثل بن گئی ہے کہ جس سے تمام با سمجھ افراد آگاہ ہیں۔

لیکن ممکن ہے یہ تعبیر ایک لطیف تر معنی کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ: ایسے افراد کی ہستی اور وجود سے حقیقت میں ایک قالب اور ایک مجسمہ کے سو کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے، وہ ایک ایسا بیکل رکھتے ہیں کہ جو روح کے بغیر ہے اور ایسا دماغ اور فکر رکھتے ہیں جو بیکار ہو چکی ہے۔

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی لازمی ہے کہ مومن کا راہنما ”نور“ (صیغہ مفرد کے ساتھ) اور کفار کا محیط ”ظلمات“ (صیغہ جمع کے ساتھ) بیان کیا گیا ہے، کیوں کہ ایمان صرف ایک ہی حقیقت ہے اور وحدت و ویگانگی کی رمز ہے اور کفر و بے ایمانی، پرانگندگی و تفرقہ اور پھوٹ کا سرچشمہ ہے۔

آیت کے آخر میں اس بد بختی کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کفار کے اعمال کو ان کی نظروں میں اسی طرح زینت دے دی گئی ہے ﴿كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں یہ برے عمل کے تکرار کی خاصیت ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی برائی نظریں کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس کی نظروں میں ایک اچھا کام معلوم ہونے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی مانند اس کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے اور اپنے جال سے نکلنے کی اسے اجازت نہیں دیتا، تباہ کاروں کے حالات کا ایک سرسری مطالعہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔

اور چونکہ منفی جہت سے ایک ماجرے کا ہیرو ابوجہل تھا اور وہ مشرکین مکہ اور قریش کے سرداروں میں شمار ہوتا تھا لہذا دوسری آیت میں ان گمراہ رہبروں اور کفر و فساد کے زعماء کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ہم نے ہر شہر اور آبادی میں اسی طرح سے ایسے جڑے جڑے لوگ قرار دئے ہیں کہ جنہوں نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا اور مکرو فریب اور دھوکا بازی کے ذریعے لوگوں کو راستے سے منحرف کر دیا ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰ فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكْبَرًا مُّجْرِمِيْهَا لِيَمَّكُرُوْا فِيْهَا﴾۔

ہم نے بارہا یہ کہا ہے اس قسم کے افعال کی خدا کی طرف نسبت اس بنا پر ہے کہ وہ مسبب الاسباب اور تمام قدرتوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص جس کام کو سرانجام دیتا ہے وہ ان امکانات و وسائل کے ساتھ سرانجام دیتا ہے کہ جو خدا نے اس کے اختیار میں دئے ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ اس سے اچھا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض لوگ ان ہی وسائل سے برے کام انجام دیتے ہیں۔

”لیمکروا“ (تاکہ وہ مکرو فریب کو کام میں لائیں) کا معنی ان کے سرانجام کے معنی میں ہے۔ یہ ان کی خلقت کا ہدف نہیں ہے ^(۱) یعنی نافرمانی اور بکثرت گناہوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ راہ حق کے رہزن بن گئے اور بندگان خدا کو راہ سے منحرف کر دیا۔ کیوں کہ ”مکر“ اصل میں گرم کرنے اور مروڑنے کے معنی میں بعد ازاں ہر اس انحرافی کام کے لئے جو مخفیانہ اور چھپ کر کیا جائے استعمال ہونے لگا۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: وہ اپنے سوا کسی کو بھی فریب اور دھوکا نہیں دیتے، لیکن وہ سمجھتے نہیں ہیں اور متوجہ نہیں ہیں ﴿وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مکرو فریب ہوگا کہ وہ اپنے وجود کا تمام سرمایہ چاہے وہ فکر، ہوش، عقل، عمر اور وقت ہو یا مال دولت ایسی راہ میں استعمال کرتے ہیں کہ جو نہ صرف یہ کہ ان کے لئے سود مند نہیں بلکہ ان کی پشت کو بار مسئولیت اور گناہ سے بھی بوجھل کر دیتا ہے جب کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

ضمنی طور پر اس آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مفسد اور بد بختیاں جو معاشرے کو دامن گیر ہوتی ہیں ان کا سرچشمہ قوموں کے جڑے اور سردار ہی ہوتے ہیں اور وہی لوگ ہوتے ہیں جو قسم قسم کے جیلوں اور فریب کاریوں کے ذریعہ راہ حق کو دگرگوں کر کے حق کے چہرے کو لوگوں پر پوشیدہ کر دیتے ہیں۔

۱۔ اصطلاح کے مطابق ”لام“ غایت کا ”لام“ ہے بلکہ عاقبت کا لام ہے کہ جس کے قرآن میں متعدد نمونے موجود ہیں۔

آیت ۱۲۳

۱۲۴ ﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۲۴۔ اور جس وقت کوئی آیت ان کے لئے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ دکھائی جائے جیسی کہ خدا کے پیغمبروں کو دی گئی ہے،۔ خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے، وہ لوگ جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انھوں نے اپنی حیثیت و مقام کو بچانے کے لئے لوگوں کو راہ حق سے منحرف کیا ہے) وہ بہت جلدی اپنے مکہ (اور فریب اور چالبازی) کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے، بارگاہ خداوندی میں ذلیل ہوں گے اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے۔

شان نزول

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں (کہ جو بت پرستوں کے مشہور سرداروں میں سے تھا اور اصطلاح کے مطابق ان کا دماغ سمجھا جاتا تھا) نازل ہوئی ہے۔ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتا تھا کہ اگر نبوت سچی بات ہے تو میں یہ مقام حاصل کرنے کا آپ سے زیادہ حقدار ہوں، کیونکہ ایک تو میرا سن آپ سے زیادہ ہے اور دوسرے میرے پاس مال و دولت بھی آپ سے زیادہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ خیال کرتا تھا کہ مسئلہ نبوت بھی رقابتوں کا مرکز بنے، وہ کہتا تھا کہ ہم اور قبیلہ بنی عبد مناف (پیغمبر کا قبیلہ) ہر چیز میں ایک دوسرے کے رقیب تھے اور گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح ایک دوسروں کے دوش بدوش جا رہے تھے یہاں تک کہ انھوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن یہ بات ممکن نہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئےں مگر یہ کہ ہم پر بھی وحی اترے جس طرح اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

خدا سب بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے

اس آیت میں ان باطل گدی نشینوں اور سرداروں اور ”اکابر مجرمیہا“ کے طرز فکر اور مضحکہ خیز دعوے کی طرف ایک مختصر اور پر معنی اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: جب خدا کی طرف سے کوئی آیت ان کے لئے بھیجی گئی تو انھوں

نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہمیں بھی وہی مقامات اور آیات جو خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کو عطا ہوئی ہے دی جائیں ﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ﴾۔

ان کے خیال میں جیسے مقام رسالت اور خلق کی رہبری کا حصول سن و سال و مال و دولت پر موقوف ہے یا قبائل کی بچہ گانہ رقابتوں پر اور گویا خدا بھی اس بات کا پابند ہے کہ وہ ان بے بنیاد اور مضحکہ خیز رقابتوں کا خیال کمرے اور انھیں صحیح قرار دے۔ ایسا ہی رقابتیں کہ جن کا سرچشمہ انحطاط فکری ہو، جو مفہوم نبوت اور انسانوں کی رہبری کی فکر سے دور ہوں۔

قرآن انھیں واضح جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: اس کی ضرورت نہیں کہ تم خدا کو سبق دو کہ وہ اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو کس طرح بنائے اور کن لوگوں میں ان کا انتخاب کرے کیوں کہ ”خدا سب بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے“ ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾۔

یہ بات صاف ظاہر و بالکل واضح ہے کہ رسالت نہ تو سن و سال اور مال و دولت سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ ہی قبائل کی حیثیت سے۔ بلکہ ہر چیز سے پہلے اس کی شرط روح کی آمادگی، ضمیر کی پاکیزگی، اصل انسانی خصائل و صفات، فکر بلند، قوت نظر اور آخری طور پر غیر معمولی تقویٰ و پرہیزگاری کا مرحلہ عصمت میں ہونا ہے اور ان صفات کا موجود ہونا خصوصاً مقام عصمت کے لئے آمادگی ایسی چیز ہے جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ ان شرائط اور ان کی سوچ کے درمیان کس قدر فرق ہے۔

جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سوائے وحی و تشریع بنی کے تمام صفات اور پروگراموں کا حامل ہوتا ہے، یعنی وہ محافظ شرع و شریعت بھی ہے، اس کے مکتب و قوانین کا پاسدار بھی ہے اور لوگوں کا روحانی اور دنیا کا رہبر بھی ہے، لہذا اسے بھی مقام عصمت پر فائز اور خطا و گناہ سے مامون و محفوظ ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنی پیغام رسانی کو باور کر سکے اور رہبر مطاع اور قابل اعتماد نمونہ ہو۔ اسی دلیل سے اس کا انتخاب بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس مقام کو وہ کہاں قرار دے نہ کہ خلق خدا۔ نہ ہی لوگوں کے انتخاب اور شوری سے یہ ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں اس قسم کے مجرموں اور باطل دعوے کرنے والے رہبروں کے اس انجام کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے انتظار میں ہے ارشاد ہوتا ہے: عنقریب یہ گنہگار لوگ اس مکروفریب کی وجہ سے جو وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے

کرتے تھے ذلت و حقارت اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے ﴿سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ
بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ﴾^(۱)۔

یہ خود خواہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے غلط کاموں کے ذریعہ اپنی حیثیت، مقام اور مرتبہ کی حفاظت کریں لیکن خدا انہیں
اس طرح حقیر کرے گا کہ وہ دردناک روحانی گرفت کا احساس کریں گے، علاوہ ازیں چونکہ راہ باطل میں ان کے ہاؤ ہو زیادہ
اور ان کی سعی و کوشش سخت تھی لہذا ان کی سزا اور عذاب بھی ”شدید“ اور پرسر صدا ہوگا۔

۱۔ ”اجرام“ مادہ ”جرم“ سے اصل میں قطع کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ گنہگار افراد رشتوں اور ناتوں کو قطع کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو فرمان خدا کی اطاعت سے الگ
کر لیتے ہیں لہذا یہ لفظ گناہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور اس میں اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے ہر شخص اپنی ذات میں حق و پاکیزگی اور عدالت کے ساتھ رشتہ
رکھتا ہے اور گناہ سے آلودگی فی الواقع فطرت الہیہ سے علیحدگی ہے۔

آیات ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷

۱۲۵ ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأْتَمَّا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾۔

۱۲۶ ﴿وَهَذَا صِرَاطٌ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ﴾۔

۱۲۷ ﴿كُنْمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۲۵۔ جس شخص کے لئے خدا چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو (قبول کرنے کے لئے) کشادہ کر دیتا ہے اور جس شخص کو (اس کے برے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا پلیدی ایسے افراد کے لئے قرار دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

۱۲۶۔ اور یہ صراطِ مستقیم (اور ہمیشہ کی سنت) تیرے پروردگار کی ہے ہم ایسے افراد کے لئے جو پند و نصیحت حاصل کرتے ہیں اپنی آیات کو کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔

۱۲۷۔ ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس امن و امان کا گھر ہوگا اور ان کا ولی، دوست اور مددگار ہے ان (نیک) اعمال کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

خدائی امداد

گذشتہ آیات کہ جو سچے مومنین اور ہٹ دھرم کفار کے بارے میں بحث کر رہی تھیں، کے بعد ان آیات میں ان عظیم نعمتوں کو جو پہلے گروہ کے لئے ہیں اور بے توفیقاں جو دوسرے گروہ کے دامن گیر ہوں گی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس شخص کو خدا ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ حق کو قبول کرنے کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اس کے لئے اسے تنگ کر دیتا ہے گویا وہ چاہتا ہے کہ آسمان کی طرف چڑھ جائے ﴿

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأْتَمَّا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ﴾۔

اس امر کی تاکید کے لئے مزید کہا گیا ہے: خدا اس طرح سے پلیدی اور رجس کو بے ایمان افراد کے لئے قرار دیتا ہے اور ان کے سراپا کو نحوست اور سلب توفیق گھیر لے گی (كَذٰلِكَ يَجْعُلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ)۔

قابل توجہ نکات

۱۔ ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ خدائی ”ہدایت“ اور ”ضلالت“ سے مراد ایسے اشخاص کے لئے کہ جنہوں نے حق قبول کرنے کے لئے اپنے اعمال و کردار سے آمادگی یا عدم آمادگی کو ثابت کر دیا ہے، ہدایت کی بنیادیں فراہم کرنا یا فراہم شدہ ہدایت کی بنیادوں کو برطرف کرنا ہے۔

وہ لوگ کہ جو راہ حق پر رواں دواں ہیں اور ایمان کے اور ایمان کے آب زلال کے متلاشی اور پیاسے ہیں، خدا ان کے راستوں میں ایسے ضیا بخش چراغ روشن کر دیتا، تاکہ وہ اس آب حیات کو حاصل کرنے کے لئے تاریکیوں میں گم نہ ہو جائیں لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے ان حقائق ک بارے میں اپنی بے اعتنائی ثابت کر دی ہے وہ اس خدائی امداد سے محروم اور اپنی راہ میں انہوہ مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ان سے توفیق ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

۲۔ یہاں ”صدر“ (سینہ) سے مراد روح اور فکر ہے اور یہ کنایہ بہت سے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ نیز ”یشرح“ (کشادہ کرنا) سے مراد وہی وسعت روح، بلندی فکر اور انسان کی عقل کے افق کا پھیلاؤ ہے۔ کیوں کہ حق کو قبول کرنے کے لئے بہت سے ذاتی منافع چھوڑنے پڑتے ہیں کہ جس کے لئے وسعت روح رکھنے والے اور بلند افکار افراد کے سوا اور کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔

۳۔ ”حرج“ (بروزن حرم) حد سے زیادہ تنگی اور شدید محدودیت کے معنی میں ہے۔ یہ ہٹ دھرم اور بے ایمان افراد کا حال ہے، کہ جن کی فکر بہت کوتاہ اور ان کی روح حد سے زیادہ چھوٹی اور ناتواں ہے اور جو معمولی سی گنجائش بھی زندگی میں نہیں رکھتے۔۔

۴۔ قرآن کا ایک علمی معجزہ: اس قسم کے افراد کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ کہ جو یہ چاہتا ہے کہ آسمان پر چڑھ جائے اس لحاظ سے ہے کہ آسمان کی طرف صعود کرنا (چڑھنا) حد سے زیادہ مشکل کام ہے اور ان کے لئے حق کو قبول کرنا بھی اسی طرح ہے۔

جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ کام فلاں شخص کے لئے اتنا مشکل ہے کہ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ میں آسمان کی طرف چڑھ جاؤں، یا جیسا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کام کرنے کے بجائے آسمان پر چڑھ جاؤ تو زیادہ آسان ہے۔

البتہ اس زمانے میں آسمان کی طرف پرواز کرنا انسان کے لئے ایک تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لیکن آج بھی جب کہ فضا میں سیر کرنا ایک عملی شکل اختیار کر چکا ہے پھر بھی وہ ایک طاقت فرسا اور مشکل کاموں میں سے ہے اور فضا نوردوں کو ہمیشہ شدید مشکلات کا سامنہ رہتا ہے۔

لیکن اس آیت کے لئے ایک لطیف تر معنی بھی نظر میں آتا ہے جو گزشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کرہ زمین کے اطراف کی ہوا اس زمین کے قرب جوار میں تو بالکل نتھری ہوئی اور انسانی تنفس کے لئے آمادہ ہے، لیکن ہم جتنا اوپر کی طرف چڑھتے چلے جائیں ہوا اتنی ہی زیادہ رقیق اور کم ہو جاتی ہے اور اس کی آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر ہم (آکسیجن کے ماسک کے بغیر) زمین کی سطح سے چند کلو میٹر اوپر کی طرف چلے جائیں تو ہمارے لئے سانس لینا ہر لحظہ مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر ہم برابر اوپر کی طرف بڑھتے رہیں تو تنگی نفس اور آکسیجن کی کمی ہماری بے ہوشی کا سبب بن جائے گی، اس دن جب یہ واقعیت علمی ثابت نہیں ہوئی تھی اس تشبیہ کا بیان کرنا حقیقت میں قرآن کے علمی معجزات میں شمار ہوگا۔

۵۔ شرح صدر کیا ہے آیت میں شرح صدر (سینہ کی کشادگی) ایک عظیم نعمت اور ضیق صدر (سینہ کی تنگی) ایک خدائی سزا شمار کی گئی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر سے ایک عظیم نعمت کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

”﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾“

”کیا ہم نے تیرے سینہ کو وسیع اور کشادہ نہیں کیا۔“ (۱)

یہ ایک ایسا امر ہے کہ جو افراد کے حالات کا مشاہدہ کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ بعض کی روح تو اس قدر بلند و کشادہ ہوتی ہے جو ہر حقیقت کو قبول کرنے کے لئے۔ چاہے وہ کتنی بڑی کیوں نہ ہو۔ آمادہ اور تیار ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس بعض کی روہ اتنی تنگ اور محدود ہوتی ہے جیسے کسی بھی حقیقت کے نفوذ کے لئے اس میں کوئی راہ اور جگہ نہیں ہے ان کی فکری نگاہ کی حد روزمرہ کی زندگی اور کھانے پینے تک ہی محدود ہوتی ہے، اگر وہ انھیں مل جائے تو ہر چیز چھمی ہے اور اگر اس میں تھوڑا سا بھی تغیر پیدا ہو جائے تو گویا سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور دنیا خراب ہو گئی ہے۔

جس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ شرح صدر کیا ہے تو آپ نے

فرمایا: ”نور یقذفہ اللہ فی قلب من یشاء فیشرح لہ صدرہ ویبفسح“

”ایک نور ہے کہ جسے خدا جس شخص کے دل میں چاہے ڈال دے تو اس کے سائے میں اس کی روح وسیع اور کشادہ ہو جاتی ہے۔“

لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی نشانی بھی ہے جس سے اسے پہچانا جائے تو آپ نے فرمایا:

”نعم الانابة الى دار الخلود والتجافى عن دار الغرور والاستعداد للموت قبل نزول الموت“ (۲)

”ہاں! اس کی نشانی ہمیشہ گھر کی طرف توجہ کرنا، اور دنیا کے زرق برق سے دامن سמיٹنا، اور موت کے لئے آمادہ ہونا (ایمان و عمل صالح اور راہ حق میں کوشش کرنے کے ساتھ) قبل اس کے کہ موت آجائے۔“

بعد والی آیت میں گذشتہ بحث کی تاکید کے عنوان سے کہتا ہے: یہ مطلب کہ خدائی مدد حق طلب لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے اور سلب توفیق دشمنان حق کی تلاش میں جاتی، ایک مستقیم و ثابت اور ناقابل تغیر سنت الہی ہے ﴿وَهَذَا صِرَاطٌ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا﴾۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ ”ہذا“ کا اشارہ اسلام اور قرآن کی طرف ہو، کیوں کہ وہی صراط مستقیم اور راست و معتدل راستہ ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیوں اور آیات کو ان لوگوں کے لئے جو قبول کرنے والا دل اور سننے والا کان رکھتے ہیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے ﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں خداوند تعالیٰ اپنی نعمتوں کے ان دو عظیم حصوں کو جو وہ بے دار افراد اور حق طلب لوگوں کو عطا کرتا ہے بیان کرتا ہے: پہلی یہ کہ ان کے پروردگار کے پاس ان کے لئے امن و امان کا گھر ہے ﴿هُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾۔

اور دوسری یہ کہ: ان کا ولی و سرپرست اور حافظ ناصر خدا ہے ﴿وَهُوَ وَلِيُّهُمْ﴾۔

”اور یہ سب کچھ ان نیک اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے تھے“ ﴿بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز باعث افتخار ہوگی کہ انسان کی سرپرستی اور کفالت امور خداوند تعالیٰ اپنے ذمہ لے لے، اور وہ اس کا حافظ، دوست اور یار و یاور ہو جائے۔

اور کون سی نعمت اس سے عظیم تر ہے کہ ”دارالسلام“ یعنی امن و امان کا گھر وہ جگہ کہ جس میں نہ جنگل ہے نہ خونریزی، نہ فزاع ہے نہ جھگڑا، نہ خشونت و سختی ہے نہ زمانے والی اور طاقت صرف کرنے والی رقابتیں، نہ مفادات کا

تصادوم ہے نہ جھوٹا اور افتراء نہ تہمت، حسد اور کنہ ہے اور نہ غم و اندوہ، ایسا گھر جو ہر لحاظ سے راحت و آرام کی جگہ ہے، انسان کے انتظار میں ہے۔

لیکن آیت یہ کہتی ہے کہ یہ چیزیں وہ زبانی جمع خرچ سے کسی کو نہیں دیتا بلکہ عمل کے بدلے میں دیتا ہے، ہاں! ہاں! عمل ہی کے بدلے میں۔

۱۔ سورہ الم نشرح، آیہ: ۱۔

۲۔ مجمع البیان، جلد ۴، صفحہ ۳۶۳۔

آیات ۱۲۸، ۱۲۹

۱۲۸ ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا يَامَعْشَرَ الْجِنِّ قَدْ اسْتَكْبَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾ -

۱۲۹ ﴿وَكَذَلِكَ نُؤَلِّى بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ -

ترجمہ:

۱۲۸ - اور اس دن کہ جس میں ان سب کو جمع اور محشور کرے گا تو ان سے کہے گا کہ اے گمراہ شیاطین و جن تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا ہے، تو انسانوں میں سے ان کے دوست اور پیروکار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم دونوں (گمراہ پیشواؤں اور گمراہ پیروکاروں) میں سے ہر ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے (ہم ہوس آلودہ اور زود گزر لذات تک پہنچنے اور انھوں نے ہم پر حکومت کی) اور جو اجل تو نے ہمارے لئے مقرر کر دی تھی ہم اس تک پہنچ گئے، (خدا) کہے گا: تمہارے رہنے کی جگہ آگ ہے تم ہمیشہ کے لئے اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے، تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

۱۲۹ - اور اس طرح سے ہم بعض ستمگروں کو بعض (دوسرے ظالموں) کے سپرد کر دیتے ہیں یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

اس دن کہ جس میں ان سب کو جمع و محشور کرے گا

ان آیات میں قرآن نئے سرے گمراہ اور گمراہ کرنے والے مجرمین کی سرنوشت کی طرف لوٹتا ہے، اور گزشتہ آیات کے مباحث کی اس سے تکمیل کرتا ہے۔

انھیں اس دن کی یاد دلاتا ہے کہ جس دن وہ ان شیاطین کے آمنے سامنے کھڑے ہوں گے کہ جن سے انھوں نے الہام لیا ہے، اور ان پیروکاروں اور ان پیشواؤں سے سوال ہوگا، ایسا سوال کہ جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے گے اور حسرت و اندوہ کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ کرے گے، یہ تنبیہیں اس مقصد کے لئے ہیں کہ صرف اس چند روزہ زندگی پر نگاہ نہ رکھیں اور انجام کار کی بھی فکر کریں۔

قرآن پہلے کہتا ہے: اس دن کہ جس میں ان سب کو جمع و محشور کرے گا تو ابتدا میں کہے گا کہ اے گمراہ کرنے والے جن و شیاطین تم نے بہت سے افراد انسانی کو گمراہ کیا ہے ﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا يَامَعْشَرَ الْجِنِّ قَدْ اسْتَكْبَرْتُمْ مِّنَ الْإِنسِ﴾^(۱)۔

لفظ ”جن“ سے مراد یہاں وہی شیاطین ہیں، کیوں کہ جن اصل لغت میں، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ہر مخفی مخلوق کے معنی میں، سورہ کہف کی آیہ ۵۰ میں ہم شیاطین کے سردار ابلیس کے بارے میں پڑھے گئے۔
﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ یعنی وہ جنوں میں سے تھا۔

آیات گذشتہ کہ جن میں شیاطین کے رمزی و سوسوں کے بارے میں گفتگو تھی اور فرمایا گیا تھا ”ان الشیاطین لیوحون الی اولیائہم“ اسی طرح بعد والی آیت کچھ اور لوگوں کے بارے میں بعض ستمگروں کی رہبری کی بات کر رہی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن گمراہ کرنے والے شیاطین کے پاس اس گفتگو کا کوئی جواب نہیں ہے اور وہ خاموش ہو جاتے ہیں لیکن ”انسانوں میں سے ان کی پیروی کرنے والے اس طرح کہے گئے کہ پروردگار، انھوں نے ہم سے فائدہ اٹھایا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ ہماری اجل آگئی“ ﴿وَقَالَ أَوْلِيَائُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا﴾۔

وہ اسی بات پر خوش تھے کہ انھوں نے فرمانبرداری و کارمل کئے ہیں اور ان پر حکومت کر رہے ہیں، اور ہم بھی دنیا کے زرق و برق اور اس کی بے لگام وقتی لذات کہ جو شیاطین کے و سوسوں کی وجہ سے دلفریب اور دلچسپ دکھائی دیتی تھی، خوش تھے۔

اس بارے میں کہ اس آیت میں اجل سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد زندگی کا اختتام ہے یا قیامت کا دن ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر زندگی کا اختتام مراد ہے، کیوں کہ لفظ ”اجل“ اس معنی میں قرآن کی بہت سے آیات میں استعمال ہوا ہے۔

لیکن خدا ان سب فاسد و مفسد پیشواؤں اور پیروکاروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے: تم سب کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور تم ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے ﴿قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾۔

جملہ ”الا ماشاء اللہ“ (مگر جو خدا چاہے) کے ساتھ استثنایا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مواقع پر عذاب و سزا کا ابدی ہونا پروردگار عالم سے اس کی قدرت کو سلب نہیں کرتا، بلکہ جب وہ چاہے اسے بدل سکتا ہے، اگرچہ ایک گمراہ کے لئے قائم رہنے دیتا ہے۔

یا یہ ان افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ابدی عذاب کے مستحق نہیں ہیں، یا یہ وہ عفو الہی کے شامل حال ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں کہ جنہیں سزا کے جاودانی ہونے اور ہمیشگی کے حکم سے مستثنیٰ ہونا چاہئے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار حکیم و دانا ہے ﴿إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾۔

اس کی سزا بھی حساب و کتاب کے ماتحت ہے اور اس کی بخشش بھی حساب و کتاب کی رو سے ہے اور وہ اس کے مواقع کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اگلی آیت میں اس قسم کے افراد کے بارے میں ایک دائمی قانون الہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس طرح ستمگر اور طاغی لوگ اس دنیا میں ایک دوسرے کے حامی اور معاون تھے، وہ آپس میں رہبر و رہنما بھی تھے، اور غلط راستوں پر چلنے میں ایک دوسرے کے قریبی ہمار بھی تھے، ”دوسرے جہان میں بھی ہم انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ دیں گے، اور یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے کہ جنہیں وہ اس جہان میں انجام دیتے تھے“ ﴿وَكَذَلِكَ نُؤَلِّیْ بَعْضَ الظَّالِمِیْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا یَكْسِبُونَ﴾۔

کیوں کہ جیس کہ ہم نے معاد سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے قیامت کا منظر بہت بڑے پیمانے پر عکس العمل اور رد عمل کا منظر ہے اور وہاں پر جو کچھ ہوگا وہ ہمارے اعمال کا پرتو اور انعکاس ہے۔^(۲)

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں بھی امام علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

”نولی کل من تولى اولیائهم فیکونون معهم یوم القیمة“

”قیامت کے دن ہر شخص اپنے اولیاء کے ساتھ ہوگا۔“

قابل توجہ بات یہ ہے آیت میں تمام گمراہوں کا ”ظالم“ کے عنوان تعارف کرایا گیا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ”ظلم“ اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ان سب پر محیط ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ انسان اپنے جیسے شیطان صفت لوگوں کی رہبری کو قبول کر کے اپنے آپ کو خدا کی ولایت سے خارج کر لے، اور دوسرے جہاں میں بھی ان ہی کی ولایت کے ماتحت قرار پائے۔

نیز یہ تعبیر اور ”﴿مٰا كانوا يكسبون﴾“ سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ سیاہ روزی اور بد بختی خود ان کے اعمال کی وجہ ہے اور یہ ایک سنت الہی اور قانون فطرت ہے کہ تاریک راستوں کے راہی بد بختی کے کنوئیں اور درے میں گرنے کے سوا اور کوئی انجام و عاقبت نہیں پائیں گے۔

۱۔ ”یوم“ ظرف ہے اور ”یقول“ سے متعلق ہے جو کہ محذوف ہے اور اصل میں جملہ یوں تھا ”یوم یحشر ہم جمیعاً یقول“۔

۲۔ مزید وضاحت کے لئے ”معاذو جہان پس از مرگ“ نامی قیمتی کتاب کی طرف رجوع کریں۔

آیات ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲

- ۱۳۰ ﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنْفُسِنَا وَغَرَّبْنَاهُمُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَافِرِينَ﴾ --
- ۱۳۱ ﴿ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْفَرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ﴾ --
- ۱۳۲ ﴿وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا وَمَا رَّبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ﴾ --

ترجمہ:

- ۱۳۰۔ (اس دن ان سے کہے گا) اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے (ہمارے بھیجے ہوئے) رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے، جو ہمارے آیات تمہارے سامنے بیان کیا کرتے تھے، اور اس قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈراتے تھے، وہ کہیں گے کہ ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں (ہاں ہم نے برا کیا) اور انہیں دنیا کی (زرق و برق) زندگی نے فریب دیا، اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں کہ وہ کافر تھے۔
- ۱۳۱۔ یہ اس بنا پر ہے کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہر اور آبادیوں (کے لوگوں) کو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے غفلت اور بے خبری کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا (بلکہ پہلے کچھ رسولوں کو ان کے پاس بھیجتا ہے)۔
- ۱۳۲۔ اور (ان دونوں گروہوں میں سے) ہر ایک کے لئے درجات (اور مراتب) ہیں ہر اس عمل کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیا ہے اور تیرا پروردگار ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں غافل نہیں ہے۔

تفسیر

اتمام حجت

گذشتہ آیات میں شیطان صفت ستمگروں کی قیامت کے دن سرنوشت بیان ہوئی ہے، اس غرض سے کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ انہوں نے غفلت کی حالت میں یہ کام انجام دئے ہوں گے اب ان آیات میں واضح کرتا ہے کہ انہیں کافی تنبیہ کی گئی ہے اور ان پر اتمام حجت کی گئی ہے، لہذا قیامت کے دن وہ ان سے کہے گا: اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے اور ہماری آیات بیان نہیں کی تھی اور قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈرایا نہیں تھا ﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا﴾۔

”معشر“ اصل میں ”عشرۃ“ سے جو دس کے عدد کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور چونکہ دس کا عدد ایک اکمل عدد ہے، لہذا معاشرہ کا لفظ ایک کامل جماعت پر جو مختلف اصناف اور طوئفوں پر مشتمل ہو، بولا جاتا ہے، اس بارے میں کہ آیا جنوں کی طرف بھیجے گئے رہنما خود ان ہی کی جنس و نوع سے تھے یا نوع بشر میں سے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن سورہ جن کی آیات سے جو کچھ اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ: قرآن اور اسلام سب کے لئے ہے حتیٰ کہ جنوں کے لئے بھی نازل ہوا ہے، اور پیغمبر اسلام سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ان کو دعوت دینے کے لئے خود ان ہی میں سے پیغام دینے والے اور نمائندے مامور ہوں اس بارے میں مزید تشریح اور ”جن“ کے علمی معنی کے بارے میں بھی انشاء اللہ قرآن مجید کے پارہ ۲۹ میں سورہ جن کی تفسیر میں آئے گی۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنا چاہئے کہ لفظ ”منکم“ (تم میں سے) اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہر گروہ کے رسول ایک ہی گروہ سے ہوں یا تمام گروہوں میں سے ہوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ چھپایا نہیں جاسکے گا اور اس روز سب چیزوں کی نشانیاں آشکار ہوں گی اور کوئی شخص کسی چیز کو چھپا نہیں سکے گا، سب کے سب خدا کی اس پرش کے سامنے اظہار کرتے ہوئے، کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے رسول آئے تھے اور انھوں نے تیرے پیغام ہمیں پہنچایا تھا، مگر ہم نے ان کی مخالفت کی تھی ﴿قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنْفُسِنَا﴾۔

ہاں! ان کے پاس پروردگار کی طرف سے کافی دلائل موجود تھے اور وہ راہ اور چاہ تمیز کرتے تھے، ”لیکن دنیا کی پرفریب زندگی اور اس کے وسوسہ انگیز زرق و برق نے انھیں دھوکا دیا“ ﴿وَعَرَّضْنَاهُمُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾۔

یہ جملہ اچھی طرح سے واضح کر رہا ہے کہ انسانوں کے لئے راہ سعادت میں سب سے بڑی رکاوٹ، جہاں مادہ کے مظاہر کے سامنے بے لگام ہو کر سر تسلیم خم کرنا اور بے حد و حساب دلہستگی ہے ایسی دلہستگیاں کہ جو انسان کو زنجیر غلامی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور اسے ہر قسم کے ظلم و ستم، تعدی و انحراف اور خود گواہی و طغیان کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے: وہ صراحت کے ساتھ اپنے ضرر میں اور اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کفر کی راہ پر چلے تھے اور منکرین حق کی صف میں شامل ہوئے تھے ﴿وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَافِرِينَ﴾۔

بعد والی آیت میں گزشتہ آیت کے اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک قانون کلی اور دائمی سنت الہیہ سے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے ”یہ اس بنا پر کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہروں اور بستیوں کے لوگوں کو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے غفلت کی حالت میں ہلاک نہیں کیا کرتا (مگر یہ کہ ان کی طرف انبیاء و رسل کو بھیجے اور انہیں ان کے برے اعمال کی برائی طی طرف متوجہ کرے اور جو کہنے کی باتیں ہیں وہ ان سے کہے ﴿ذٰلِكَ اَنَّ لَمْ يَكُنْ رُبُّكَ مُهْلِكَ الْفَرٰی بِظُلْمٍ وَّاهْلٰهَا غَافِلُوْنَ﴾۔

لفظ ”بظلم“ اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اس کے مظالم کی بنا پر غفلت کی حالت میں پیغمبروں کو بھیجنے سے پہلے عذاب اور سزا نہیں دیتا اور اس معنی میں بھ ہو سکتا ہے کہ خدا افراد غافل کو ظلم و ستم سے عذاب سزا نہیں دیتا، کیوں کہ انہیں اس حالت میں سزا دینا ظلم و ستم ہے اور خدا نود تعالیٰ اس سے بالا و برتر ہے وہ کسی پر ظلم و ستم کرے۔ (۱)

اس کے سرانجام کا بعد کی آیت میں خلاصہ کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا ہے: ان گروہوں میں سے ہر ایک نیکو کاروں و بدکار، فرمانبردار و قانون شکن، حق طلب و ستمگر وہاں پر اپنے اعمال کے مطابق درجات و مراتب کے حامل ہوں گے اور تیرا پروردگار کبھی بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے، بلکہ وہ سب کو جانتا ہے اور وہ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق دے گا ﴿وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَّبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کو تاکید کے ساتھ بیان کر رہی ہے کہ تمام مراتب اور درجات اور درجات خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اور چیز کا۔

۱۔ پہلی صورت میں ”ظلم“ کا غافل ہے کافر ہے

آیات ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳

۱۳۳ ﴿وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِنْ يَشَأْ يُدْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَةِ قَوْمٍ آخَرِينَ﴾

۱۳۴ ﴿إِنْ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾

۱۳۵ ﴿قُلْ يَاقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾

ترجمہ:

۱۳۳۔ اور تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے (لہذا وہ کسی کے بارے میں ظلم و ستم نہیں کرتا بلکہ یہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتے ہیں) اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہارے بعد تمہاری بجائے جو کچھ چاہے (اور جمعے چاہے) تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ تمہیں دوسری اقوام کی نسل سے وجود میں لایا ہے۔

۱۳۴۔ جو کچھ تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آکر رہے گا اور تم (خدا کو) عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے (کہ اس کی عدالت و سزا سے بچ کر بھاگ جاؤ)

۱۳۵۔ کہہ دو اے قوم! جو کام (تم سے ہو سکتا ہے اور) تمہاری قدرت میں ہے کر گزرو۔ میں (بھی اپنے فریضہ پر) عمل کروں گا، لیکن بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کونسا شخص نیک انجام رکھتا ہے (اور کامیابی کس کے لئے ہے لین) یہ بات مسلم ہے کہ ظالم فلاح و نجات حاصل نہیں کریں گے۔

تیرا پروردگار بے نیاز بھی اور رحیم و مہربان بھی ہے

پہلی آیت درحقیقت اس پر ایک استدلال ہے جو گزشتہ آیات میں پروردگار کے ظلم نہ کرنے کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ آیت کہتی ہے: تیرا پروردگار بے نیاز بھی ہے اور رحیم و مہربان بھی ہے، اس بنا پر کوئی وجہ نہیں کہ کسی پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی روا رکھے کیوں کہ ظلم تو وہ کرتا ہے کہ جو نیاز مند ہو یا سخت مزاج اور سنگدل ہو ﴿وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو

الرَّحْمَةِ﴾۔

علاوہ ازیں اسے نہ تو تمہاری اطاعت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے کیوں کہ ”اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو جنہیں وہ چاہے تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ اس نے

تمہیں ایسے انسانوں کی نسل میں پیدا کیا ہے جو تم سے بہت سی صفات میں مختلف تھے ﴿إِنَّ يَشَاءُ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفَ
مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ﴾۔

اس بنا پر وہ بے نیاز بھی ہے اور مہربان بھی اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے، اس حالت میں اس کے بارے میں
ظلم کا تصور ممکن نہیں ہے۔

اور اس کی لامتناہی قدرت پر توجہ رکھتے ہوئے یہ بات واضح اور روشن ہے کہ ”اس نے تم سے جو قیامت اور جزا و سزا
کے بارے میں وعدہ کیا ہے وہ ہو کے رہے گا اور اس کی تھوڑی سی بھی خلاف ورزی نہیں ہوگی“ (إِنَّ نَاثُودُونَ لَأَتِ
-)

”اور تم اس کی حکومت سے ہر گز باہر نہیں نکل سکتے اور اس کے پنجہ عدالت سے فرار نہیں کر سکتے“ ﴿وَمَا أَنْتُمْ
بِمُعْجِزِينَ﴾۔^(۱)

اس کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے: انہیں تہدید کرتے اور دھمکی دیتے ہوئے کہو کہ اے قوم! تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے
وہ کر گزرو، میں بھی وہ کام جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے انجام دوں گا۔ مگر تمہیں بہت ہی جلد معلوم ہو جائے گا کہ نیک
انجام اور آخری کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ظالم و ستمگار کامیاب نہیں ہوں گے اور سعادت و نیک
بخشی کا منہ نہیں دیکھیں گے ﴿قُلْ يَاقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ
لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾۔

یہاں ہم دوبارہ دیکھ رہے ہیں کہ ”کفر“ کی بجائے ”ظلم“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے
کہ کفر اور انکار حق ایک قسم کا واضح آشکار ظلم ہے، اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی ظلم ہے اور چونکہ ظلم
جہان آفرینش کی عمومی عدالت کے برخلاف ہے لہذا آخر کار اسے شکست ہوگی۔

۱۔ ”معجزین“ ”اعجاز“ کے مادہ سے ہے، یعنی دوسرے کو ناتوان اور عاجز کر دینا۔ آیت کہتی ہے کہ تم خدا کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے اور عدالت کے جاری
کرنے سے عاجز نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں تم اس کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

۱۳۶ ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾۔

ترجمہ:

۱۳۶۔ اور (مشرکین نے) ان چیزوں میں سے جو خدا نے پیدا کی ہیں (یعنی) زراعت اور چوپایوں میں سے کچھ حصہ خدا کے لئے (بھی) قرار دیا ہے اور انھوں نے یہ کہا کہ (ان کے گمان کے مطابق) یہ خدا کا مال ہے اور یہ ہمارے شرکاء (یعنی بتوں) کا مال ہے، جو ان کے شرکاء کا مال تھا وہ تو خدا تک نہیں پہنچتا تھا لیکن جو خدا کا مال تھا وہ ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا تھا، (اور اگر بتوں کا حصہ کم ہو جاتا تھا تو خدا کا مال انھیں دے دیتے تھے لیکن اس کے برعکس کو جائز نہیں سمجھتے تھے، یعنی خدا کا حصہ کم ہو جانے کی صورت میں بتوں کے مال میں سے خدا کو نہیں دیتے تھے) وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں (کہ شرک کے علاوہ خدا کو بتوں سے بھی کم تر سمجھتے تھے)۔

ان کے شرکاء (یعنی بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو

ان کے دماغوں سے بت پرستی کے افکار کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے مشرکین کے بیہودہ عقائد و رسموں اور آداب و عبادات کا دوبارہ ذکر شروع کیا گیا ہے اور بیان رسا کے ذریعے ان کے بیہودہ ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن پہلے کہتا ہے: کفار مکہ اور تمام مشرکین اپنی زراعت اور چوپایوں میں سے ایک حصہ تو خدا کے لئے اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لئے قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ حصہ تو خدا کا ہے اور یہ ہمارے شرکاء یعنی بتوں کا مال ہے ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا﴾۔

اگرچہ آیت میں صرف خدا کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ بتوں کا قرار دیتے تھے، روایات میں آیا ہے کہ اس حصہ کو تو جسے وہ خدا کے لئے قرار دیتے تھے بچوں اور مہمانوں میں صرف کرتے اور اس سے اس کام کے لئے استفادہ کرتے تھے لیکن زراعت اور چوپایوں کا وہ حصہ جو وہ بتوں کے لئے قرار دیتے تھے بتوں اور بت خانہ کے خادموں اور متولیوں اور مراسم قربانی اور خود ان کے اپنے لئے

مخصوص تھا۔^(۱)

”شُرکائنا“ (ہمارے شریک) کی تعبیر بتوں کے لئے اس بنا پر تھی کہ وہ انھیں اپنے اموال، سرمائے اور زندگی میں شریک سمجھتے تھے۔

”مما ذراء“ (اس میں سے جو خدا نے خلق کیا ہے) کی تعبیر درحقیقت ان کے عقیدہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ یہ تمام اموال سب کے سب خدا کی مخلوق تھے تو پھر ان میں سے ایک حصہ خدا کے لئے اور ایک حصہ بتوں کے لئے کیسے مقرر کرتے تھے۔

اس کے بعد اس بارے میں ان کے ایک عجیب و غریب فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ حصہ جو انھوں نے بتوں کے لئے مقرر کیا تھا وہ تو ہرگز خدا کو نہیں مل سکتا تھا (اور خدا کے نام پر کسی کو نہیں دیا جاسکتا تھا) لیکن وہ حصہ جو انھوں نے خدا کے لئے قرار دیا تھا وہ بتوں کو پہنچ جاتا تھا

﴿فَمَا كَانَ لَشُرْكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرْكَائِهِمْ﴾۔

اس بارے میں کہ اس جملے سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن تقریباً وہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب کسی حادثہ کی وجہ سے زراعت یا چوپایوں میں سے مقرر کئے ہوئے خدا کے سہم کا کچھ حصہ خراب ہو جاتا تھا اور نابود ہو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے خدا بے نیاز ہے لیکن اگر بتوں کے حصہ میں سے کچھ ضائع ہو جاتا تو سہم خدا کو اس کی جگہ قرار دے لیتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر اس کھیت کا پانی جو خدا کے حصہ میں تھا بتوں کے حصہ والے میں چلا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ کوئی صرح نہیں ہے، خدا تو بے نیاز ہے، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا تو اس کو روک دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ ایک مختصر سے جملے کے ذریعے سے اس بیہودہ عقیدے کو جرم قرار دے کر اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور کہتا ہے: یہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں ﴿سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾۔

اس بات کے علاوہ کہ بت پرستی خود ایک فاسد اور بے اساس چیز ہے ان کے فعل کی برائی کے کچھ اور پہلو بھی ہیں: ۱۔ باوجود اس کے کہ تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور اس کی مسلم ملکیت ہے او تمام موجودات کا حاکم و مدبر و محافظ وہی ہے، وہ اس میں سے صرف ایک ہی حصہ کو خدا کے ساتھ مخصوص قرار دیتے تھے، گویا اصلی مالک وہ خود تھے، لہذا

تقسیم کا حق بھی صرف ان ہی کو حاصل تھا (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”مما ذراء“ کا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے)۔

۲۔ وہ اس تقسیم میں بتوں کی طرف داری کو مقدم رکھتے تھے لہذا ہر وہ نقصان جو خدا کے حصہ میں واقع ہوتا تھا اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن جو نقصان بتوں کے حصہ میں ہو جاتا اس کی خدا کے حصہ سے تلافی کر لیا کرتے تھے اور خدا کے حصہ میں سے لے کر بتوں کو دے دیتے، آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور یہ بتوں کے لئے خدا کی نسبت ایک قسم کی برتری اور امتیاز کا اظہار تھا۔

۳۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتوں کے حصہ کے لئے ایک خاص اہمیت کے قائل تھے، لہذا ان کے حصہ میں سے متولیان، بتوں کے خادم اور خود بت پرست کھاتے تھے اور خدا کے حصہ کو صرف بچوں اور مہمانوں کو دیتے تھے، قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ موٹے تازے گو سفند اور اچھے قسم کا اناج بتوں کا مال تھا تاکہ بقولے ”حاتم کے بعد پیٹ بھر کر کھا سکیں“۔

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ تقسیم کے سلسلے میں خدا کے لئے بتوں جتنی قدرت و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے، اس سے جڑھ کمر قبیح اور زیادہ سنگین اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ انسان پتھریا لکڑی کے ایک بے قدر و قیمت ٹکڑے کو عالم ہستی کے خالق و مالک سے بلند تر خیال کرے، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی انحطاط فکری تصور کیا جاسکتا ہے۔

۱۳۷ ﴿وَكَذَلِكَ زَيْنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادَهُمْ شُرَكَائُهُمْ لِيُذْهِبُوا عَنْهُمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾

ترجمہ:

۱۳۷۔ اور اسی طرح ان کے شرکاء (یعنی بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی نظروں میں پسندیدہ رکھا تھا (وہ اپنے بچوں کو بتوں پر قربان کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے) اور اس کام کا انجام یہ ہوا کہ بتوں نے انھیں ہلاکت میں ڈال دیا اور ان کے دین کو دگرگوں کر دیا اور اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (کیوں کہ خدا انھیں جبراً ایسا کرنے سے روک سکتا تھا لیکن جبر کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بنا پر انھیں اور ان کی تہمتوں کو بھی چھوڑ دو (اور ان کے اعمال کی پرواہ نہ کرو)۔

بت پرستوں کی ایک بدکاری اور ان کے شرم ناک جرائم کی طرف اشارہ

قرآن اس آیت میں بت پرستوں کی ایک بدکاری اور ان کے شرم ناک جرائم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جس طرح خدا اور بتوں کے بارے میں ان کی تقسیم ان کی نظروں میں جچتی تھی اور اس برے، پیہودہ اور مضحکہ خیز عمل کو وہ پسندیدہ خیال کرتے تھے، اسی طرح ان کے شرکاء نے اولاد کے قتل کو بہت سے بت پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا رکھا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کو قتل کرنا ایک قسم کا افتخار یا عبادت شمار کرتے تھے ﴿وَكَذَلِكَ زَيْنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادَهُمْ شُرَكَائُهُمْ﴾۔

یہاں ”شرکاء“ سے مراد بت ہیں کہ جن کی خاطر وہ بعض اوقات اپنے بیٹوں کو بھی قربان کر دیتے تھے یا نذر کرتے تھے کہ اگر انھیں بیٹا نصیب ہوگا تو وہ اسے بت کے لئے قربان کریں گے۔ جیسا کہ قدیم بت پرستوں کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے اور اس بنا پر بتوں کی طرف ”زینت دینے“ کی نسبت اس سبب سے ہے کیوں کہ بتوں کے ساتھ تعلق اور عشق انھیں اس مجرمانہ عمل پر آمادہ کرتا تھا۔ اس تفسیر کی رو سے مذکورہ بالا آیت میں قتل کرنے کا بیٹوں کو زندہ درگور کرنے کا یا فقر وفاقہ کے خوف سے بیٹوں کو قتل کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ بتوں کے وسیلہ سے اس جرم کی قرین سے مراد یہ ہو کہ بت کدوں کے خدام اور متولی لوگوں کو یہ کام کرنے کا شوق دلاتے تھے اور خود کو بتوں کی زبان سمجھتے تھے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب

اہم سفروں اور دوسروں کاموں کے انجام دینے کے لئے ”ہبل“ (ان کا بڑا بت تھا) سے اجازت لیتے تھے، ان کے اجازت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ تیرکی وہ لکڑیاں جو ایک مخصوص تھیلے میں ”ہبل“ کے پہلو میں ہوا کرتی تھیں او ان میں سے بعض کے اوپر ”افعل“ (یہ کام انجام دو) اور بعض کے اوپر ”لا تفعل“ (یہ کام انجام نہ دو) لکھا ہوا ہوتا تھا، وہ تھیلے کو ہلاتے تھے اور ان میں سے ایک تیرکی لکڑی نکال لیتے تھے اور جو کچھ اس کے اوپر لکھا ہوا ہوتا تھا، اسے وہ ”ہبل“ کا پیغام سمجھتے تھے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس طریقے سے بتوں کا منشاء معلوم کرنا چاہتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ بت کے لئے قربانی کا مسئلہ بھی خدام کے ذریعہ بت کے ایک پیغام کے طور پر متعارف ہوا ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بیٹیوں کا زندہ درگور کرنا ان لوگوں کے درمیان کہ جو تاریخ کے بیان کے مطابق بدنامی اور ننگ عار کا داغ مٹانے کے نام پر قبیلہ بنی تمیم کے درمیان رائج تھا، وہ بت کے پیغام کے طور پر ہی متعارف ہوا ہے، کیوں کہ تاریخ میں ہے کہ نعمان بن منذر نے عرب کی ایک جماعت پر حملہ کیا اور ان کی عورتوں کو اسیر کر لیا اور ان کے درمیان ”قیس بن عاصم“ کی بیٹی بھی تھی، اس کے بعد ان کے درمیان صلح ہو گئی اور ہر عورت اپنے قبیلہ کی طرف پلٹ آئی سوائے قیس کی بیٹی کے کہ اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ دشمن کی قوم کے درمیان رہ جائے اور شاید ان کے کسی جوان سے شادی کر لے، یہ مطلب قیس پر گمراہ اور اس نے بتوں کے نام کی قسم کھائی کہ جب میری دوسری لڑکی پیدا ہوگی تو میں اسے زندہ درگور کر دوں گا، کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یہ عمل بطور سنت ان کے درمیان رائج ہو گیا کہ انھوں ناموس کے دفاع کے نام پر ایک بہت بڑے جرم یعنی بے گناہ اولاد کو وقت کرنے کا ارتکاب کرنا شروع کر دیا۔^(۱)

اس بنا پر ممکن ہے کہ بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا بھی زیر نظر آیت میں داخل ہو۔

ایک اور احتمال بھی زیر بحث آیت کی تفسیر میں نظر آتا ہے، اگرچہ مفسرین نے اسے ذکر نہیں کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بتوں کے لئے اس قسم کی اہمیت کے قائل تھے کہ اپنے نفیس اور عمدہ اموال تو بتوں اور ان کے طاقتور اور مالدار متولیوں اور خدام پر خرچ کر دیا کرتے تھے، اور خود فقیر اور تنگ دست ہو جاتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات بھوک اور فقر و فاقہ کی وجہ سے اپنے بچوں کو ذبح کر دیتے تھے، بتوں کے ساتھ ان کے اس عشق نے ایسے برے عمل ان کی نظروں میں مزین کر دیا تھا۔

لیکن پہلی تفسیر یعنی بتوں کے لئے اولاد کو قربان کرنا آیت کے متن کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اس بعد قرآن کہتا ہے: اس قسم کے قبیح اور بد اعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ بتوں کے خدام، مشرکین کو ہلاکت میں ڈال دیں، اور دین و آئین حق کو ان پر مشتبہ کر دے اور انہیں ایک پاک و پاکیزہ دین تک پہنچنے سے محروم کر دے ﴿لِيُزْذَوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ﴾۔

قرآن کہتا ہے: ان تمام باتوں کے باوجود اگر خدا چاہتا تو جبراً انہیں اس کام سے روک دیتا، مگر جبر کرنا سنت الہی کے برخلاف ہے، خدا چاہتا ہے کہ بندے آزاد رہیں، تاکہ تربیت اور تکامل و ارتقا کی راہ ہموار ہو، کیوں کہ جبر میں نہ تربیت ہے نہ تکامل و ارتقا ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ﴾۔

اور آخر میں فرماتا ہے: اب جب کہ یہ حال ہے کہ وہ اس قسم کے کئے کیہودہ، پست اور شرمناک اعمال میں غوطہ زن ہیں یہاں تک کہ اس کی قباحت کو بھی نہیں سمجھتے اور سب سے بد قریہ کہ وہ کبھی ایسے خدا کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں لہذا تم انہیں اور ان کی تہمتوں کو چھوڑ دو اور آمادہ و مستعد دلوں کی تربیت کرو ﴿فَذَرَهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾۔

آیات ۱۳۸، ۱۳۹

۱۳۸ ﴿وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْتُ حِجْرًا لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

۱۳۹ ﴿وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَكُنْ مِنْتَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ سَيَجْزِيهِمْ وَصَفَهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ:

۱۳۸۔ اور انھوں نے کہا کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ (جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ سب کے لئے) ممنوع ہے اور سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں ہم چاہیں۔ ان کے گمان کے مطابق۔ اس سے کسی کو نہیں کھانا چاہئے۔ اور (وہ یہ کہتے تھے کہ یہ) ایسے چوپائے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام قرار دیا گیا ہے اور وہ چوپائے کہ جن پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے اور خدا پر جھوٹ بولتے تھے (اور یہ کہتے تھے کہ یہ احکام خدا کی طرف سے ہیں) عنقریب ان کے افتراء انھیں دے گا۔

۱۳۹۔ اور انھوں نے کہا کہ جو کچھ ان حیوانات کے شکم میں (جنین اور بچہ میں سے) موجود ہے وہ تو ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ ہماری بیویوں پر حرام ہے لیکن اگر وہ مردہ ہوں (یعنی مردہ پیدا ہوں) تو پھر سب اس میں شریک ہیں اور عنقریب (خدا) اس توصیف (اور جھوٹے احکام) کی سزا انھیں دے گا، وہ حکیم و دانایں۔

۱۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ لفظ اولاد زیر نظر آیت میں اس تفسیر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہئے کہ لفظ اولاد ایک وسیع معنی رکھتی ہے جو بیٹا اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۳ میں ہے: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی)۔

بت پرستوں کے بیہودہ احکام

ان آیات میں بت پرستوں کے بیہودہ احکام کے کچھ حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو ان کی کوتاہ فکری کی حکایت و ترجمانی کرتے ہیں اور گزشتہ آیات کی تکمیل کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ بت پرست کہتے تھے کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور خاص انھیں کا حصہ ہے کلی طور پر سب کے لئے ممنوع ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو ہم چاہیں، ان کے خیال کے

مطابق اسی گروہ کے لئے حلال تھا دوسروں کے لئے نہیں ﴿وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرِّثُ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِرِزْقِهِمْ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِرِزْقِهِمْ﴾۔

ان کی اس سے مراد وہی بت اور بت خانہ کے متولی اور خدام تھے، صرف وہ یہی گروہ تھا جو ان کے خیال کے مطابق بتوں کے حصہ میں سے کھانے کا حق رکھتے تھے۔

اس بیان سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آیت کا یہ حصہ حقیقت میں اس حصہ کے مصرف کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، جو انھوں نے زراعت اور چوپایوں میں سے بتوں کے لئے مقرر کیا تھا جس کی تفسیر گذشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ لفظ ”حجر“ (بروزن) ”شعر“ اصل میں ممنوع قرار دینے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے بعید نہیں کہ ”حجارة“

کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہو کیوں کہ جب وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی احاطے میں داخلہ ممنوع قرار دیں تو اس کے گرد پتھر چن دیتے تھے اور یہ جو ”حجر اسماعیل“ پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص پتھر کی دیوار کے ذریعے اسے مسجد الحرام کے دوسرے حصوں سے الگ کیا گیا ہے، اسی مناسبت سے عقل کو بھی کبھی کبھی ”حجر“ کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے، اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی نگرانی اور حمایت میں آجائے تو کہتے ہیں کہ یہ اس کی حجر (حفاظت) میں ہے، اور ”مجبور“ اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو اپنے اموال میں تصرف کرنے سے رکا ہوا ہے۔^(۱)

اس کے بعد دوسری چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جسے انھوں نے حرام کر رکھا تھا اور فرمایا گیا ہے: وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کچھ جانور ایسے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام ہے ﴿وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا﴾۔

اور ظاہر یہ وہی جانور تھے کہ جن کی تفسیر سورہ ماندہ کی آیہ ۱۰۳ میں ”سائبہ“ ”بحیرہ“ اور ”حام“ کے عنوان سے گزر چکی ہے (مزید معلومات کے لئے مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر کا مطالعہ کریں)۔

اس کے بعد ان کے ناروا حکام کے تیسرے حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کچھ جانوروں پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے ﴿وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا﴾۔

یہ جملہ ہو سکتا ہے ایسے جانوروں کی طرف اشارہ ہو جن کو ذبح کرتے وقت صرف بت کا نام لیتے تھے یا اس سے مراد وہ جانور ہوں کہ جن پر حج کے لئے سوار ہونا انھوں نے حرام قرار دیا تھا، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر المنار اور قرطبی میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے ان دونوں صورتوں میں یہ ایک بے دلیل اور بیہودہ حکم تھا۔

تجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان بیہودہ احکام پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ خدا پر افتراء باندھتے تھے اور ان کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے ﴿افْتِرَاءً عَلَيْهِ﴾۔

آیت کے آخر میں ان بناوٹی احکام کے ذکر کے بعد قرآن کہتا ہے: خدا عنقریب ان افترات کے بدلے میں سزا اور عذاب دے گا ﴿سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾۔

ہاں! جب ایک انسان یہ چاہے کہ وہ اپنی ناقص فکر و عقل ذریعے کوئی قانون بنالے تو عین ممکن ہے کہ ہر گروہ اپنی ہوا و ہوس سے کچھ احکام و قوانین بنا ڈالے اور خدا کی نعمتوں کو بلا وجہ اپنے اوپر حرام قرار دے لے یا قبیح اور غلط کاموں کو اپنے لئے حلال قرار دے لے، یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون کا واضح کرنا صرف خدا کا کام ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر کام کی مصلحت سے آگاہ ہے اور ہر قسم کی ہوا و ہوس سے دور ہے۔

بعد الی آیت میں ان کے ایک اور بیہودہ حکم کی طرف جو جانوروں کے گوشت کے بارے میں ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انھوں کہا ہے کہ وہ جنین (اور بچے) جو ان جانوروں کے شکم میں ہے وہ ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ہماری بیویوں پر حرام ہے البتہ اگر وہ مردہ پیدا ہوں تو پھر سب اس میں شریک ہیں ﴿وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُنُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ﴾۔

اس بات پر توجہ رہے کہ ”ہذه الانعام“ سے مراد وہی جانور ہیں جن کی طف گذشتہ آیت میں ازہر ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ ”﴿ما فی بطون هذه الانعام﴾“ (جو کچھ ان جانوروں کے شکم میں ہے) کی عبارت ان جانوروں کے دودھ کے بارے میں بھی ہے لیکن ”وان یکن میتة“ (اگر مردہ ہوں) کے جملے پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت جنین (شکم مادر میں بچہ) سے بحث کر رہی ہے کہ اگر وہ زندہ پیدا ہو تو اسے صرف مردوں کے ساتھ مخصوص جانتے تھے اور اگر مردہ پیدا ہو جاتا تھا کہ جو ان کے لئے زیادہ باعث رغبت و میل نہ ہوتا تھا تو پھر سب کو اس میں مساوی جانتے تھے۔

اس حکم کا اول تو فلسفہ اور منطقی دلیل ہی نہیں اور دوسرے مردہ پیدا ہونے والے جنین کے بارے میں بہت ہی برا اور چبھنے والا تھا کیوں کہ اس قسم کے جانور کا گوشت تو اکثر اوقات خراب اور مضر ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ ایک قسم کی مردوں اور عورتوں میں واضح تفریق تھی کیوں کہ جو چیز اچھی تھی وہ تو صرف مردوں کے ساتھ مخصوص تھی اور جو چیز بری تھی اس میں سے عورتوں کو بھی حصہ دیا جاتا تھا۔

قرآن اس جاہلانہ ذکر کرنے کے بعد مطلب کو اس جملے کے ساتھ ختم کرتا ہے: عنقریب خدا نے انہیں ان کی اس قسم کی تو صیفات کی سزا دے گا

﴿سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ﴾۔

”وصف“ کی تعبیر ایسی توصیف کی طرف اشارہ ہے کہ جو وہ خدا کے لئے کرتے تھے اور اس قسم کی غذاؤں کی حرمت کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے، اگرچہ اس سے مراد وہ صفت اور حالت ہے کہ جو تکرار گناہ کے اثر اسے گنہگار شخص کو عارض ہوتی ہے اور اسے سزا و عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے ہے: وہ حکیم اور دانا ہے (إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ)۔

ان کے اعمال و گفتار اور ناروا تہمتوں سے بھی باخبر ہے، اور حساب ہی ساتھ انہیں سزا بھی دے گا۔

۱۔ اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہئے کہ اوپر والی آیت میں ”حجر“ وصفی معنی رکھت

۱۴۰۔ ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا

مُهْتَدِينَ﴾ -

ترجمہ:

۱۴۰۔ یقیناً جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت و نادانی کی بنا پر قتل کر دیا انہوں نے نقصان اٹھایا ہے، اور جو کچھ خدا نے انہیں رزق دے رکھا تھا اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انہوں نے افتراء باندھا ہے اور وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (وہ ہرگز) ہدایت نہیں پائیں گے۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی فضول احکام

گذشتہ چند آیات میں زمانہ جاہلیت کے عربوں کی فضول احکام اور قبیح اور شرمناک رسموں سے متعلق گفتگو تھی منجملہ ان کے اپنی اولاد کو بتوں کی قربانی کے طور پر قتل کرنا، اپنے قبیلہ اور خاندان کی حیثیت و عزت کو محفوظ رکھنے کے نام پر اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا اور اسی طرح کچھ حلال نعمتوں کے حرام کر لینا تھا، اس آیت میں بڑی سختی کے ساتھ ان تمام اعمال وہ احکام کو جرم قرار دیتے ہوئے سات مختلف تعبیروں کے ساتھ جو مختصر جملوں میں ہے لیکن وہ بہت ہی رسا اور جاذب توجہ ہے، ان کی وضع و کیفیت کو واضح و روشن کیا گیا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت، بیوقوفی اور جہالت کی بنا پر قتل کیا ہے، انہوں نے نقصان اور خسارہ اٹھایا ہے وہ انسانی اور اخلاقی نظر سے بھی اور احساس کی نظر سے بھی اور اجتماعی و معاشرتی لحاظ سے بھی خسارہ اور نقصان میں گرفتار ہوئے ہیں اور سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کمر انہوں نے دوسرے جہان میں روحانی نقصان اٹھایا ہے ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾۔

اس جملے میں ان کا یہ عمل اولاً ایک قسم کا خسارہ اور نقصان اور اس کے بعد حماقت کم عقلی اور بعد میں جاہلانہ کام کے طور پر متعارف ہوا ہے ان تینوں تعبیرات میں سے ہر ایک تنہا ان کے عمل کی برائی کے تعارف کے لئے کافی ہے، کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے اور کیا یہ حماقت اور بے وقوفی کی انتہا نہیں ہے کہ وہ اپنے اس عمل پر شرم نہ کریں بلکہ اس پر ایک قسم کا فخر کمرے اور اسے عبادت شمار کمرے، کونسا علم و دانش اس

بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان ایسا عمل ایک سنت کے طور پر یا اپنے معاشرے میں ایک قانون کے طور پر قبول کرے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ابن عباس کی گفتگو یاد آرہی ہے کہ جو کہا کرتے تھے: جو شخص زمانہ جاہلیت کی قوموں کی پسماندگی کی میزان کو جاننا چاہے تو وہ سورہ انعام کی آیات (یعنی زیر بحث آیات) کو پڑھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: انھوں نے اس چیز جو خدا نے انھیں روزی کے طور پر دی ہوئی تھی اور ان کے لئے اسے مباح و حلال قرار دیا تھا اپنے اوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انھوں نے یہ افتراء باندھا کہ خدا نے انھیں حرام کیا ہے ﴿وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ﴾۔

اس جملہ میں دو اور تعبیروں کے ذریعے ان کے اعمال کو جرم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اول تو انھوں نے اس نعمت کو جو خدا نے انھیں بطور روزی دے رکھے تھی یہاں تک کہ وہ ان کی حیات کی بقا اور زندگی کے برقرار رہنے کے لئے بھی ضروری تھی، اسے اپنے اوپر حرام کر لیا اور خدا کے قانون کو پاؤں تلے روند ڈالا اور دوسرے خدا پر افتراء باندھا کہ اس نے یہ حکم دیا ہے، حالانکہ ہر گز ہر گز ایسا نہیں تھا آیت کے آخر میں دو اور تعبیرات کے ذریعے انھیں مجرم قرار دیا گیا ہے پہلے کہا گیا ہے: وہ یقیناً گمراہ ہو گئے ﴿قَدْ ضَلُّوا﴾۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے: وہ کبھی بھی راہ ہدایت پر نہیں تھے ﴿وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ﴾۔

فہرست

آیت ۶۷.....	۳
انتخابِ جانشین پیغمبر ہی آخری کارِ سالت تھا.....	۳
آیت کی شان نزول.....	۶
واقعہ غدیر کا خلاصہ.....	۱۰
جرح و تنقید اور اعتراضات.....	۱۶
۱۔ کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟.....	۱۷
۲۔ آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط.....	۲۰
۳۔ کیا یہ حدیث تمام کتبِ صحاح میں نقل ہوئی ہے؟.....	۲۱
۴۔ حضرت علی - نے اور اہل بیت نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟.....	۲۲
۵۔ روایت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے؟.....	۲۳
۶۔ ایک ہی زمانہ میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟.....	۲۳
آیات ۶۸، ۶۹.....	۲۶
شان نزول.....	۲۶
آیات ۷۰، ۷۱.....	۳۰
ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا.....	۳۰
آیات ۷۲، ۷۳، ۷۴.....	۳۳
مسیح اور تثلیث.....	۳۳
آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷.....	۳۸

- حضرت عیسیٰ کو فقط ایک فرستادہ خدا (رسول) جانیں ۳۸
- آیات ۷۸، ۷۹، ۸۰ ۳۳
- آیت ۸۱ ۳۶
- آیات ۸۳، ۸۲، ۸۶، ۸۵ ۳۷
- اسلام کے پہلے مہاجرین ۳۷
- یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی ۵۲
- آیات ۸۹، ۸۸، ۸۷ ۵۵
- حد سے تجاوز نہ کرو ۵۵
- قسم اور اس کا کفارہ ۵۷
- قسموں کی دو قسمیں ۵۸
- پہلی چیز ہے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ﴿فکفارتہ اطعام عشرة مشاکین﴾ - ۵۹
- دوسری چیز ہے دس محتاج لوگوں کو لباس پہنانا ﴿او کسوتہم﴾ ۶۰
- تیسری چیز ہے ایک غلام کو آزاد کرنا (او تحریر رقبۃ) - ۶۰
- آیات ۹۰، ۹۱، ۹۲ ۶۲
- شان نزول ۶۲
- شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل ۶۳
- شراب اور قمار باطی کے مہلک اثرات ۶۷
- آیت ۹۳ ۷۰
- شان نزول ۷۰
- وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجالائیں ۷۰

۷۳	آیات ۹۳، ۹۵، ۹۶.....
۷۳	شانِ نزول.....
۷۳	حالتِ احرام میں شکار کرنے کے احکام.....
۷۸	﴿أَجَلٌ لَّكُمْ صَيِّدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾ -
۷۸	اس بارے میں کہ طعام اور کھانے سے کیا مراد ہے؟.....
۸۰	حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ.....
۸۱	آیات ۹۷، ۹۸، ۹۹.....
۸۱	خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا.....
۸۳	کعبہ کی اہمیت.....
۸۵	آیت ۱۰۰.....
۸۵	اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں.....
۸۷	آیات ۱۰۱، ۱۰۲.....
۸۷	شانِ نزول.....
۸۸	تفسیر.....
۸۸	غیر مناسب سوالات.....
۹۱	ایک سوال اور اس کا جواب.....
۹۳	آیات ۱۰۳، ۱۰۴.....
۹۳	چار غیر مناسب ”بدعات“.....
۹۷	اپنے بزرگوں اور بڑوں کے نام کا بت.....
۹۷	بے دلیل تضاد.....

- آیت ۱۰۵ ۹۹
- تفسیر ۹۹
- ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے ۹۹
- ایک سوال کا جواب ۹۹
- آیات ۱۰۸، ۱۰۴، ۱۰۶ ۱۰۲
- شان نزول ۱۰۲
- اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظِ حقوق ۱۰۳
- آیت ۱۰۹ ۱۰۸
- اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا ۱۰۸
- آیت ۱۱۰ ۱۱۰
- تفسیر ۱۱۰
- مسیح (علیہ السلام) پر انعاماتِ الہی ۱۱۰
- آیات ۱۱۵، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱ ۱۱۳
- حواریوں پر ماندہ کے نزول کا واقعہ ۱۱۳
- چند ضروری نکات کی یاد دہانی ۱۱۵
- ۱۔ ماندہ کے مطالبہ سے کیا مراد تھی؟ ۱۱۶
- ۲۔ ”﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ﴾“ سے کیا مراد ہے؟ ۱۱۶
- ۳۔ یہ آسمانی ماندہ کیا تھا؟ ۱۱۷
- ۴۔ کیا ان پر کوئی ماندہ نازل ہوا؟ ۱۱۷
- ۵۔ عید کسے کہتے ہیں؟ ۱۱۷

- ۱۱۸ ۶۔ عذاب شدید کس بنا پر تھا؟
- ۱۲۰ آیات ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸
- ۱۲۰ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اپنے پیروکاروں کے شرک سے بیزاری
- ۱۲۳ دو سوال اور ان کا جواب
- ۱۲۵ آیات ۱۱۹، ۱۲۰
- ۱۲۵ تفسیر
- ۱۲۵ عظیم کامیابی
- ۱۲۸ سورہ انعام
- ۱۲۸ فضیلت تلاوت سورہ انعام
- ۱۲۸ شرک کی مختلف اقسام اور بت پرستی کے خلاف جہاد
- ۱۲۹ آیات ۱، ۲
- ۱۲۹ وہ خدا جو نور و ظلمت دونوں کا مبداء ہے،
- ۱۳۰ کیا تاریکی بھی مخلوقات میں سے ہے
- ۱۳۱ نور رمز وحدت ہے اور ظلمت رمز پر اکندگی
- ۱۳۲ اجل مسمیٰ کیا ہے؟
- ۱۳۵ تو یہاں اجل سے مراد وہی حتمی موت ہے -
- ۱۳۶ آیت ۳
- ۱۳۶ تمام چیزوں کا خالق وہی ہے
- ۱۳۸ آیات ۳، ۵
- ۱۳۰ آیت ۶

۱۳۰	سرکشی کرنے والوں کو سرگزشت
۱۳۲	چند اہم نکات
۱۳۳	آیت ۷
۱۳۳	ہٹ دھرمی کا آخری درجہ
۱۳۵	آیات ۸، ۹، ۱۰
۱۳۵	بہانہ تراشیاں
۱۳۸	آیت ۱۱
۱۳۸	وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے کس کی ہیں
۱۳۹	آیات ۱۲، ۱۳
۱۳۹	معاذ پر استدلال
۱۳۹	معاذ پر استدلال
۱۵۱	ایک سوال اور اس کا جواب
۱۵۳	آیات ۱۳، ۱۵، ۱۶
۱۵۳	خدا کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے
۱۵۸	آیات ۱۷، ۱۸
۱۵۸	پروردگار کی قدرت قاہرہ
۱۶۱	آیات ۱۹، ۲۰
۱۶۱	سب سے بڑا گواہ
۱۶۶	آیات ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴
۱۶۶	سب سے بڑا ظلم

۱۶۹	چند اہم نکات
۱۷۱	آیات ۲۵، ۲۶
۱۷۱	حق قبول نہ کرنے والوں کا طرز عمل
۱۷۳	مومن قریش حضرت ابوطالب (علیہ السلام) پر ایک بہت بڑی تہمت
۱۸۱	آیات ۲۷، ۲۸
۱۸۱	وقتی اور بے اثر بیداری
۱۸۳	چند اہم نکات
۱۸۵	آیات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲
۱۸۵	تجھ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی گئی ہے مگر
۱۹۰	آیات ۳۳، ۳۴
۱۹۰	مصلحین کے راستے میں ہمیشہ مشکلات رہی ہیں
۱۹۵	آیات ۳۵، ۳۶
۱۹۵	زندہ نما مردے
۱۹۹	آیت ۳۷
۱۹۹	بہانہ جوئی
۲۰۰	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۰۲	آیت ۳۸
۲۰۲	کیوں کہ یہ آیت وسیع مباحث اپنے پیچھے رکھتی ہے
۲۰۵	چند قابل غور باتیں
۲۰۹	آیت ۳۹

۲۰۹	بہرے اور گونگے
۲۱۱	آیات ۳۰، ۳۱
۲۱۱	فطری توحید
۲۱۲	چند اہم نکات
۲۱۳	آیات ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵
۲۱۳	نصیحت قبول نہ کرنے والوں کا انجام
۲۱۴	چند اہم نکات
۲۲۰	آیات ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹
۲۲۰	روئے سخن بدستور مشرکین ہی کی طرف ہے
۲۲۳	آیت ۵۰
۲۲۳	غیب سے آگاہی
۲۲۴	آیت ۵۱
۲۲۴	قرآن کے ذریعہ ایسے لوگوں کو ڈراؤ
۲۲۹	آیات ۵۲، ۵۳
۲۲۹	شان نزول
۲۳۱	طبقاتی تقسیم کے خلاف جنگ
۲۳۲	اور وہ اسے ان کی رسالت کے باطل ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔
۲۳۳	اسلام کا ایک عظیم امتیاز
۲۳۶	آیات ۵۴، ۵۵
۲۳۶	سلام بر مؤمنان!

۲۳۹	آیات ۵۶، ۵۷، ۵۸
۲۳۲	چند اہم نکات
۲۳۳	آیات ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲
۲۳۳	اسرار غیب
۲۵۳	آیات ۶۳، ۶۴
۲۵۳	تفسیر وہ نور جو تاریکی میں چمکتا ہے
۲۵۳	چند اہم نکات
۲۵۷	آیت ۶۵
۲۵۷	رنگ رنگ کے عذاب
۲۵۸	چند اہم نکات
۲۶۱	آیات ۶۶، ۶۷
۲۶۱	جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو کہ
۲۶۳	آیات ۶۸، ۶۹
۲۶۳	شان نزول
۲۶۳	اہل باطل کی مجالس سے دوری
۲۶۵	دو سوال اور ان کا جواب
۲۶۷	آیت ۷۰
۲۶۷	دین حق کو کھیل بنانے والے
۲۷۰	آیات ۷۱، ۷۲
۲۷۰	کیا ہم سابقہ حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

- ایک سوال اور اس کا جواب ۲۷۱
- آیت ۷۳ ۲۷۳
- آیت ۷۳ ۲۷۶
- یہ سورہ شرک و بت پرستی سے مقابلے کا پہلو رکھتی ہے ۲۷۶
- کیا آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا ۲۷۶
- آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹ ۲۸۱
- آسمانوں میں توحید کی دلیلیں ۲۸۱
- یہ گفتگو تحقیق کے طور پر کی تھی ۲۸۳
- حضرت ابراہیم - کا توحید پر استدلال ۲۸۶
- ”کذا لک“ سے کیا مراد ہے - ؟ ۲۸۶
- ”جن“ سے مراد ۲۸۶
- ”کو کباً“ کونسا ستارہ مراد ہے ؟ ۲۸۷
- ”بازغ“ سے مراد ۲۸۸
- ”فطر“ - سے مراد ۲۸۸
- ۶۔ ”خنیف“ کا معنی ۲۸۸
- آیات ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳ ۲۸۹
- حضرت ابراہیم - کی بت پرست قوم و جمعیت سے بحث و گفتگو ۲۸۹
- یہاں ظلم سے کیا مراد ہے ؟ ۲۹۳
- آیات ۸۳، ۸۵، ۸۶، ۸۷ ۲۹۶
- نعمت ہے صالح اولاد اور آبرو مند اور لائق نسل ۲۹۶

۳۰۰	چند قابل توجہ امور
۳۰۳	آیات ۸۸، ۸۹، ۹۰
۳۰۳	تفسیر
۳۰۳	تین اہم امتیاز
۳۰۵	۱۔ حکم کا مفہوم:
۳۰۵	۲۔ منصب قضاوت:
۳۰۵	۳۔ حکومت و سلطنت:
۳۰۹	آیت ۹۱
۳۰۹	شان نزول
۳۰۹	خدا شناس
۳۰۹	خدا شناسان
۳۱۲	چند قابل توجہ نکات
۳۱۲	۱۔ قراطیس:
۳۱۲	۲۔ کاغذ پر لکھنے کی مذمت؟
۳۱۲	۳۔ ”﴿وما قدروا اللہ حق قدرہ﴾“
۳۱۳	آیت ۹۲
۳۱۳	یہ ایک بہت ہی بابرکت کتاب ہے
۳۱۶	چند قابل توجہ مطالب
۳۱۹	آیت ۹۳
۳۱۹	شان نزول

- ۳۲۰ ایسے گنہگاروں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے
- ۳۲۱ چند قابلِ توجہ نکات
- ۳۲۳ آیت ۹۳
- ۳۲۳ شانِ نزول
- ۳۲۳ گمشدہ لوگ
- ۳۲۳ دو اہم نکات
- ۳۲۵ آیات ۹۵، ۹۶
- ۳۲۵ تفسیر
- ۳۲۵ طلوعِ صبح کرنے والا
- ۳۳۲ آیت ۹۷
- ۳۳۲ ہم نے اپنی نشانیاں اور دلائلِ اہلِ فکر و نظر اور اہلِ فہم
- ۳۳۳ آیات ۹۸، ۹۹
- ۳۳۳ تفسیر
- ۳۳۹ انار کی ساخت
- ۳۳۲ آیات ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳
- ۳۳۴ چند قابلِ توجہ نکات
- ۳۵۳ آیات ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷
- ۳۵۳ تفسیر
- ۳۵۳ پیغمبرِ مجبور نہیں کرتے
- ۳۵۷ آیت ۱۰۸

- ۳۵۷ تم مشرکین کے بتوں اور معبودوں کو کبھی گالیاں نہ دو
- ۳۵۸ قابل توجہ نکات
- ۳۵۸ ۱۔ خدا زینت دیتا ہے؟
- ۳۵۸ ۲۔ گالیاں نہ دینے کا حکم:
- ۳۶۰ آیات ۱۰۹، ۱۱۰
- ۳۶۰ شان نزول
- ۳۶۱ انھوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ یہ قسم کھائی
- ۳۶۳ آیت ۱۱۱
- ۳۶۳ تفسیر
- ۳۶۳ ہٹ دھرم لوگ راہ راست پر کیوں نہیں آتے؟
- ۳۶۵ آیات ۱۱۲، ۱۱۳
- ۳۶۵ تفسیر
- ۳۶۶ چند قابل توجہ نکات
- ۳۶۹ آیات ۱۱۳، ۱۱۵
- ۳۶۹ کیا میں غیر خدا کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کر لوں
- ۳۷۲ آیات ۱۱۶، ۱۱۷
- ۳۷۲ اگر تم زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے
- ۳۷۳ عدوی اکثریت کچھ اہمیت نہیں رکھتی
- ۳۷۶ آیات ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰
- ۳۷۶ تفسیر

۳۷۶		شرک کے تمام آثار مٹ جانے چاہئیں
۳۸۰		آیت ۱۲۱
۳۸۰		تفسیر
۳۸۱		آیات ۱۲۲، ۱۲۳
۳۸۱		شان نزول
۳۸۲		ایمان اور نور نظر
۳۸۶		آیت ۱۲۴
۳۸۶		شان نزول
۳۸۹		آیات ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷
۳۸۹		تفسیر
۳۸۹		خدائی امداد
۳۹۰		قابل توجہ نکات
۳۹۳		آیات ۱۲۸، ۱۲۹
۳۹۳		اس دن کہ جس میں ان سب کو جمع و محشور کرے گا
۳۹۸		آیات ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲
۳۹۸		تفسیر
۳۹۸		اتمام حجت
۴۰۱		آیات ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵
۴۰۱		تیرا پروردگار بے نیاز بھی اور رحیم و مہربان بھی ہے
۴۰۳		آیت ۱۳۶

ان کے شرکاء (یعنی بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو	۳۰۳
آیت ۱۳۷	۳۰۶
بت پرستوں کی ایک بدکاری اور ان کے شرم ناک جرائم کی طرف اشارہ	۳۰۶
آیات ۱۳۸، ۱۳۹	۳۰۹
بت پرستوں کے بیہودہ احکام	۳۰۹
آیت ۱۴۰	۳۱۳
زمانہ جاہلیت کے عربوں کی فضول احکام	۳۱۳